اسلام کے بنیادی عقائد

مصنف
حجۃ الاسلام والمسلمین
السید مجتبیٰ موسوی لاری

جلد چہارم

مترجم
حجۃ الاسلام مولانا شیخ
روشن علی نجفی

بحثِ امامت

نام کتاب	اسلام کے بنیادی عقائد
مصنف	حجۃ الاسلام والمسلمین سید مجتبیٰ موسوی لاری
مترجم	حجۃ الاسلام مولانا شیخ روشن علی نجفی
کتابت	رضوان رضوی ہندی
ناشر	مرکز نشر معارف اسلامی در جہان
تعداد	۳۰۰۰ (تین ہزار)
تاریخ	ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ
چاپ	بار اول
مطبع	الہادی پریس قم جمہوری اسلامی ایران

فہرست موضوعات

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۱	عرض مترجم	
۲	اسلام میں مقام رہبری	۹
۳	رسولؐ اور اسلام کا مستقبل	۱۸
۴	حضرت علیؑ کی قیادت کا قانونی اعلان	۲۵
۵	عدم استدلال علیؑ از حدیث غدیر	۴۶
۶	حضرت علیؑ کا قیمتی موقف	۵۴
۷	قرآن و اہلبیتؑ کا رابطہ	۷۵
۸	اصحاب رسولؐ کا نامعقول رویہ	۸۴
۹	کیا سارے اصحاب جنتی ہیں	۹۸
۱۰	سقیفہ کی خلافت	۱۰۵
۱۱	ایک سوال کا جواب	۱۲۴
۱۲	شیعیت از نظر تاریخ	۱۴۲
۱۳	صاحبان امر کون ہیں	۱۵۶
۱۴	علمی و بشری سرحدوں کا نگہبان؟	۱۷۹
۱۵	امامت ایک عقلی ضرورت ہے	۱۸۶
۱۶	الٰہی قوانین کی تفسیر کون کر سکتا ہے	۱۹۶
۱۷	امامت و باطنی ہدایت	۲۰۷
۱۸	عقیدۂ عصمت	۲۱۷
۱۹	قرآن و سنت سے عصمت کی تائید	۲۳۰
۲۰	جامعیت امام	۲۴۴
۲۱	علوم امام کے سرچشمے	۲۵۴
۲۲	غیب و شہود	۲۶۷

نمبر شمار	موضوع	صفحہ
۲۳	کیا امام دنیائے غیب سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے ؟	۲۸۱
۲۴	امام کے انتخاب کا طریقہ	۲۹۸
۲۵	افضلیت امام کا مسئلہ	۳۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی بعث الانبیاء والمرسلین والصلوۃ والسلام علی رسولنا محمدؐ خاتم النبیین وعلی الائمۃ الطاہرین المعصومین۔ واللعنۃ الدائمۃ الباقیۃ علی اعدائہم اجمعین . . .

اما بعد :

"اسلام کے بنیادی عقائد" کی چوتھی جلد بھی مکمل ہو گئی اس طرح ان چاروں جلدوں میں توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد کے بارے میں شیعی عقیدہ کو اجمالی طور سے پیش کر دیا گیا ہے۔

حجۃ الاسلام والمسلمین سید مجتبیٰ موسوی لاری مسلسل بہت تکلیف دہ بیماریوں کے باوجود خدمت دین میں لگے رہتے ہیں۔ موصوف کی اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ فلسفہ کی ثقیل اصطلاحوں اور متکلمین کی دور از کار بعض منطقی بحثوں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے بہت ہی سادہ لفظوں میں مسائل کو سمجھا دیا ہے اور سامنے کی ایسی ایسی دلیلیں پیش کی ہیں کہ انسان کو ماننے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے جب اس کتاب کا ترجمہ شروع کیا تو درمیان میں بعض ایسے ضروری امور درپیش ہو گئے جنکا مقدم کرنا بہرحال ضروری تھا چنانچہ اسکی تکمیل سے پہلے آٹھ دس کتابیں اور رسالے درمیان میں آ گئے جسکی وجہ سے یہ کتاب کافی تاخیر سے آپکے ہاتھ میں پہونچ

رہی ہے۔

ترجمہ تو خیر جیسا تیسا ہوتا ہی ہے کاتب حضرات اور پروف ریڈنگ کرنیوالے وہ وہ ستم ظریفیاں کرتے ہیں کہ سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے بعض پروف ریڈنگ کرنیوالے اپنے اجتہاد کو دخیل کردیتے ہیں اگر میں لکھتا ہوں کہ انسان کے خمیر میں سہو و نسیان شامل ہے تو وہ اصلاح فرماتے ہیں "انسان کے ضمیر میں سہو و نسیان شامل ہے" مگر پھر بھی غنیمت ہے کیونکہ سمجھدار قاری متوجہ ہو جاتے ہیں میرا تجربہ ہے کہ اگر مترجم خود ہی پروف ریڈنگ کرے تو غلطیاں زیادہ ہی رہ جاتی ہیں میری کتابوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے رہا ہے۔

مگر کاتب کو اوراق اصلاح کرکے دیجئے تو ناممکن ہے کہ وہ آپکی اصلاح کی اصلاح نہ کردے اسلئے کاتب جب اصلاح کرکے لائے تو آپ دوبارہ ضرور دیکھ لیجئے۔

ایران میں اردو کاتب کا تصور ایسا ہی ہے جیسے عرب کے ریگستان میں پانی کا تصور جو لوگ یہ کام کرتے ہیں انکا اصل مشغلہ کچھ ہے وقت کاٹنے کیلئے یا بالائی آمدنی کیلئے کتابت شروع کردیتے ہیں اور کتابت کے مبادیات سے بھی واقف نہیں ہوتے بقول مرزا غالب۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

یقیناً خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنکی کتابیں غلطیوں سے پاک ہوتی ہیں۔ یابہت کم غلطیاں ہوتی ہیں لیجئے

آپ کتاب پڑھے کب تک بور ہوئیے گا۔

روشن علی عفی عنہ

اس ناچیز خدمت کو
بارگاہ معصومۂ قمؑ میں
پیش کرنے کی جرأت کرتا
ہوں !
روشن علی

اسلام میں مقام رہبری

امت مسلمہ کے عوام سے ربط و ضبط رکھنے والا شخص ہی امام و پیشوا اور رہبر ہوتا ہے اس کے پیروکار اس کے افکار و نظریات سے استفادہ کرتے ہیں اسی کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگی کا راستہ معین کرتے ہیں اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

امامت کا مفہوم اتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہے جو فکری مرجعیت کے ساتھ سیاسی زعامت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔ رسولؐ خدا کے انتقال کے بعد ان کے لائے ہوئے دین کی حفاظت اور دائمی رہبری کا ذمہ دار امام ہوتا ہے۔ اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو ناشناس مفاہیم قرآنی حقائق دینی اجتماعی آموزش کی تعلیم دے اور پورے معاشرے کی ہر پہلو سے رہبری کرے۔

واقعی اعتبار سے زعامت و پیشوائی کا مقصد اسلامی اہداف کو پورا کرنا۔ اور اسلامی نظریات کو بروئے کار لانا ہی ہے۔ جس مکتب فکر کی بنیاد پیغمبر اسلامؐ نے رکھی اور جس کو تکوین ملت کی آرزو اور عین تدوین قانون بنا دیا وہ بھی تو امامت و رہبری

سے کے بہت ہی محدود مفہوم پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً جو لوگ اجتماعی یا سیاسی مسائل یا کسی ادارہ کے دائرۂ اختیار کے ذمہ دار ہوتے ہیں ان کی رہبری و امامت صرف انہیں حدود تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن جہاں پر روحیۂ انسانی، رسالت دینی سے مخلوط ہو کر ایک مخصوص حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور فکری مرجعیت اور سیاسی رہبریت ایک شخص میں متمرکز ہو جاتی ہے۔ اور وہ شخص اسلامی معاشرہ کا سربراہ ہوتا ہے۔ اور وہ قوانین شریعت اور آسمانی ہدایات کو بہر طریقہ سے انسانوں تک پہونچاتا ہے اور ان قوانین کا اجرا کرتا ہے اور اسلامی شخصیت و انسانی کرامت کو پستی اور تنزلی سے بچاتا ہے وہی انسان سچا اور مطلق امام ہوتا ہے اور لوگوں کی دنیا و دین کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

مختصر بات یہ ہے کہ امام اس شخصیت کا نام ہے جو بُعد الٰہی اور بُعد توحیدی کا دارا ہونے کے ساتھ خدا و مخلوق سے عملی ارتباط رکھنے کے ساتھ ساتھ آئین الٰہی کے اجتماعی، اخلاقی، عبادی دستور کا کامل ترین نمونہ ہو۔ اور ایسا ہی شخص انسانوں کی شاہراہِ تکامل کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ اور دین کے پیروکاروں کے لیے ایسی صورت میں لازم ہے کہ اس کے احکام کی اطاعت کریں اور تمام امور میں اس کی پیروی کریں۔ کیونکہ اس کی ذات خود سازی اور جامعہ سازی کے لئے معیار ہے اور صرف اسی کی راہ و رسم زندگی امت اسلامی کے لیے نمونۂ فضیلت و سازندگی ہے۔

●

اہل سنت کے زیادہ تر علماء کا نظریہ ہے کہ خلافت و امامت کے ایک ہی معنی ہیں یہ دونوں لفظیں، خلافت و امامت، مترادف ہیں۔ اور اس کا مطلب وہ عظیم تر اجتماعی و دینی ذمہ داری ہے جو لوگوں کی طرف سے خلیفہ کو عطا کی جاتی ہے اور انتخاب کے ذریعہ خلیفہ مسلمانوں کی سرپرستی کا اہل ہو جاتا ہے بایں معنی کہ خلیفہ جس طرح لوگوں

سکے دینی مشکلات کو حل کرنے والا ہوتا ہے اسی طرح امن عامہ کی برقراری اور ملکی سرحدوں
کی حفاظت کا فوجی سربراہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ دار ہوتا ہے اس اعتبار سے امام
ایک ایسا عادی ذمہ دار اور اجتماعی حاکم ہوتا ہے جس کا اصل مقصد قیام عدالت اور ملک
کی حفاظت ہوتا ہے اور اسی لیئے اسکا انتخاب کیا جاتا ہے۔

اس طرح حاکم کے اندر جہاں ایک طرف حکومت کی صلاحیت ضروری ہے اور
لیاقت و شائستگی اور امور حکومت کے بارے میں جانکاری لازمی ہے بلکہ غلط لوگوں
پر شرعی حد جاری کر سکے عوام الناس کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والوں کی روک تھام کر سکے
سرکش اور بے لگام لوگوں کو سر نہ اٹھانے دے۔ اسی طرح دوسری طرف فوجوں اور سپاہیوں
کو باقاعدہ منظم کر کے اسلامی ممالک کے سرحدوں کی خاطر خواہ نگہبانی کر سکے اور نشر توحید
اگر ارشاد و تبلیغ سے نہ ہو سکے تو کفر و فساد کی تمام قسموں کو فوجوں اور سپاہیوں کے
ذریعہ کچل دے اور آئین حق کے نفاذ میں جہل و کفر کی طرف سے تمام رکاوٹوں کو پیدا کرنے
والے عوامل کی بیخ کنی مسلح طریقے سے کر سکے یہ بھی ایک واجبی چیز ہے۔

اس نظریہ کے اعتبار سے اگر حاکم احکام الٰہی سے واقف نہ بھی ہو، متقی و
پرہیزگار نہ بھی ہو گنہگار بھی ہو، مگر حکمرانی کی پوری صلاحیت رکھتا ہو تب بھی نظام حکومت
میں کسی قسم کی مشکل پیدا نہ ہوگی ——— لیکن جہاں تک رسولؐ خدا کی جانشینی کا سوال
ہے تو آنحضرتؐ کے بعد ان کی جگہ وہ شخص پُر کر سکتا ہے جو پیغمبر سے متعلق امور کو انہیں
کی طرح انجام دے سکے۔ اسی لیے اگر ایک جبار و ستمگر جو حقوق انسان کو پامال کر کے بے
گناہ لوگوں کا خون بہا کے، فوجی طاقت کے ذریعہ اسلامی معاشرہ پر مسلط ہو جائے اور
مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو جائے یا منصب جانشینی رسولؐ پر ایک مکار چالاک
سیاست باز فائز ہو جائے اور اپنی تمام روحانی پلیدگیوں اور اخلاقی پستیوں سمیت

حق و عدالت کو برباد کرتا ہوا لوگوں کی قسمتوں کا مالک بن بیٹھے تو نہ صرف یہ کہ اسکی مخالفت جائز نہیں ہے بلکہ اسکی اطاعت واجب و لازم ہے۔

اس نظریے کے مطابق خلیفہ کے سلسلے میں بزرگان اہلسنت میں سے ایک دانشمند فرماتے ہیں۔

کسی بھی خلیفہ کو دستور و قوانین الٰہی کے پامال کرنے، لوگوں کے اموال کو لوٹنے، ان کو قتل کرنے، حقوق کی بربادی، حدود الٰہی کے معطل کرنے پر معزول نہیں کیا جا سکتا، بلکہ امت اسلامی پر واجب ہے کہ اسکی کوتاہیوں کی اصلاح کر کے راہ راست اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے۔[1]

جب دستگاہ خلافت کا یہ عالم ہو کہ خلیفہ اسلامی خود بھی معاشرہ کی کسی ذمہ داری کا احساس نہ کرتا ہو تو مصلحین قوم ہمیشہ کس طرح خلفائے فاسد کے اعمال کی نگرانی کرتے رہیں گے اور کب تک اس کے خلاف احتجاج کرتے رہیں گے اور کب تک اسلام کے دامن سے اس بدنما داغ کو چھڑاتے رہیں گے؟ اور کیا صرف خلیفہ کو نصیحت کرنے سے خلیفہ اپنی روش کو بدل دے گا؟

سچی بات تو یہ ہے کہ اگر مرضی الٰہی یہی تھی کہ امت مسلمہ کی سرنوشت نالائق حکمرانوں اور بے تقویٰ و خود پرست چھوٹوں کے ہی سپرد رہے تو کسی پیغمبر کو نہ بھیجنے کی ضرورت تھی اور نہ معاشرے کی اصلاح کے لیے احکام وحی کو نازل کرنے کی ضرورت تھی اور ایسی صورت میں ایک فطری سوال یہ اٹھتا ہے کہ دل سوز مردان آزاد و فداکار صدیوں سے بدکار حکام کے خلاف جو ہنگامے کرتے رہے ہیں کیا انھوں نے مرضی الٰہی کی مخالفت کی ہے؟

---

[1] التمہید قاضی باقلانی، ص ۱۸۶

بہت بڑے دانشمند و محقق ڈاکٹر عبد العزیز دوری سنی المذہب تحریر فرماتے ہیں: ۱

"خلافت کی حاکمیت کو برقرار رکھتے وقت اہل سنت کا سیاسی نظریہ صرف قرآن و حدیث پر اکتفا کر لینا نہیں تھا بلکہ اس نظریہ کا تمام تر دارومدار بعد میں واقع ہونے والے حالات و حادثات کے مطابق قرآن و حدیث کی توجیہ و تفسیر کرنا تھا۔ اس طرح نظریہ خلافت میں تقریباً ہر نسل موثر ہے کیونکہ نظریہ خلافت ہونے والے واقعہ سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس کا بہترین نمونہ قاضی ابوالحسن ماوردی ہیں۔ جو خلیفہ کی طرف سے قاضی القضاۃ تھے اور اپنی کتاب "الاحکام السلطانیہ" کے لکھتے وقت صرف خلیفہ کا حکم پیش نظر رکھتے تھے اور وہ بھی ایسے زمانہ میں جو خلافت کا پست ترین دور تھا۔ قاضی ماوردی نے اپنی پوری سیاسی صلاحیت اس بات پر صرف کر دی ہے کہ ان سے پہلے والے فقہاء کے زمانے میں جو واقعات ہو چکے ہیں انکو اپنے دور کے واقعات سے تطبیق کر دیں ان کا ان ہی یہ تھا کہ وہ ہر قسم کی آزادی فکر و نظر سے اجتناب کرتے تھے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

لائق رہبر کے ہوتے ہوئے بھی نالائق کو رہبر بنایا جا سکتا ہے اس لئے اگر کسی نالائق کا انتخاب ہو جائے تو افضل و لائق کے موجود ہونے کی وجہ سے اسکو معزول نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریہ کے وہ قائل ہیں اور اسکو ثابت بھی کرنا چاہتے ہیں تاکہ بہت سے نالائق خلفاء کی توجیہ پیش کر سکیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا یہ نظریہ پیش کر کے شیعوں کے نظریہ کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جتنی بھی کاوش و اعتقادی مباحث پیش کئے ہیں وہ صرف اہلسنت کے نزدیک سیاسی واقعات کی نشاندہی کے لیے ہیں اور ان کا مقصد اسکے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ جس چیز پر اجماع کا ٹھپہ لگ جائے بس اسکی توجیہ کرنا واجب ہے۔" ۱

۱؎ النظم الاسلامیہ ج ا جلد ۲ ص ۸۳

جو حضرات اپنے کو پیروان سنت اور نگہبان دین و شریعت کہتے ہیں ان کے یہ افکار و نظریات ہیں، وہی لوگ اسلامی مفکرین، اجتماعی مصلحین، ائمۂ عدل و حجت خدا کے پیروکاروں کو رافضی و سنت رسولؐ کے تارک کے عنوان سے پہچنواتے ہیں۔

اگر مسلمانوں پر حق امارت و ریاست ایسے ہی فرمارواؤں کو ہے جو روح اسلام سے بیگانہ تھے، جو حدود الٰہی کو پامال کرنے والے ہوں تو "حکام کی اطاعت واجب ہے" کے نظریہ کے پیش نظر تو امت مسلمہ کو ان فرمارواؤں کے خلاف کسی قسم کے اقدام کی اجازت ہے اور نہ خلافت کو حق تک پلٹانے کے لئے حکامان وقت سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت ہے اور نہ مسلمان ان کے احکام کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں تو پھر سوچئے ایسی حالت میں دین خدا پر کیا گذرے گی؟

کیا اسلامی وجدان میں شریعت رسولؐ کی وفاداری کا یہی مطلب ہے؟ کیا یہ طریقہ فکر ظالموں اور ستمگروں کو قانونی طور سے نامحدود اختیارات دینا نہیں ہے؟

●

شیعی نظریہ کے مطابق امامت ایک قسم کی الٰہی ولایت اور نبوت کی طرح خدا کی طرف سے کسی بلند ترین انسان کو دیا جانے والا عہدہ ہے لیکن نبی اور امام میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ نبی دین و مکتب کا بانی ہوتا ہے اور امام آئین الٰہی کی حفاظت و پاسداری کرنے والا ہوتا ہے۔ اور یہ لوگوں کا فریضہ ہے کہ اپنے تمام ابعاد زندگی میں اس کی معنویت و ہدایت و روش سے استفادہ کریں۔

حضور سرور کائنات کے بعد امت اسلامی کو ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو زیور علم سے آراستہ، تمام اقدار کا شائستہ، دامن وحی سے وابستہ، گناہ و معصیت سے منزہ ہو، بانی شریعت کے طور و طریقہ کو دوام بخشنے والا ہو تا کہ زمانے

کے حوادث کی نگرانی اور معاشرے کے تخریب پسند عناصر کے خطرات سے عمیق و بھرپور ہوشیاری رکھنے کے ساتھ ساتھ وحی کے وساطت سے نازل ہونیوالے وسیع تر معارف اور کلیات شریعت سے استنباط کئے ہوئے مسائل کو تمام حالات میں لوگوں کے حوالے کر سکے اور قوانین الہی کو انکے چوکھٹے میں فٹ رہنے دے تاکہ مشعل حق و عدالت بجھنے نہ پائے۔

جس طرح رسول خدا کی فرمانروائی انکی نبوت سے جدا ہونے والی چیز نہیں ہے اسی طرح امامت و خلافت بھی قابل تجزیہ نہیں ہے کیونکہ معنوی اسلام اور سیاسی اسلام دونوں ایک کل کے دو جز ہیں۔ لیکن تاریخ اسلام کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس میں قدرت سیاسی کو معنوی امامت سے جدا کر دیا گیا اور دین کا سیاسی بعد روحانی بعد سے الگ کر دیا گیا

اگر امت مسلمہ کا رہبر عادل، متقی، تمام اقدار عالیہ سے آراستہ، بد اخلاقیوں سے دور نہ ہوگا تو اسکی رفتار و گفتار لوگوں کے لیئے نمونہ نہیں ہوگی بلکہ اگر وہ خود ہی قانون شکنی کرنے والا، اصول عدالت کو پامال کرنے والا ہوگا تو نہ معاشرے میں عدالت کا دور دورہ ہو سکتا ہے اور نہ معاشرہ رشد و فضیلت کے بام ترقی تک پہونچ سکتا ہے۔ اور نہ ہی حکومت اسلامی کا یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے کہ انسانوں کو مبداء اعلیٰ کیطرف متوجہ کیا جائے اور ایک ایسی صحیح و سالم فضا پیدا کی جائے جس میں معنوی اقدار اور اجزائے قانون کا پورا دار و مدار وحی الہی پر ہو۔

کیونکہ حاکم وقت کی اخلاق و عمل کی روش معاشرہ پر اتنی زیادہ اثر انداز ہوتی ہے کہ بقول حضرت علیؑ باپ کا اثر بیٹے پر اتنا نہیں پڑتا جتنا حاکم کے کردار کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے چنانچہ مولائے کائنات فرماتے ہیں:

لوگ اخلاقی اعتبار سے بہ نسبت اپنے باپ کے زمانے سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ [1]

اور معصوم کا ارشاد ہے: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔۔ مترجم

چونکہ حکومت کے مقاصد اور رہبر کے صفات و خصوصیات میں ایک مخصوص ربط و تناسب ہوتا ہے۔ اس لئے حکومت کے مقاصد کا پورا ہونا ایک ایسے رہبر کے وجود پر موقوف ہے۔ جو ایک انسان کامل کے تمام امتیازات رکھتا ہو اور تمام اقدار اور خصوصیات اس میں موجود ہوں۔

ایک ایسے معاشرے کیلئے جو رو بترقی و کمال ہو فطری و طبعی طور سے ایک ولایت و زعامت کی ضرورت ہے۔ اور جس طرح آئین اسلام نے ایسے مناسب قوانین مرتب کر کے انسان کی مادی و معنوی، شخصی و اجتماعی، ضرورتوں کو پورا کیا ہے اسی طرح منصب زعامت بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جو فطرت انسانی کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

●

جس خدا نے اس کائنات رنگ و بو میں قدم رکھنے والے ہر موجود کیلئے تمام ضروری و غیر ضروری اسباب و وسائل پیدا کئے ہیں اور اس موجود کے اختیار میں اسے دے دئے ہیں تاکہ وہ سرحد ضعف و نقص کو عبور کر کے منزل کمال کا راہرو بن جائے اس خدا کیلئے کیسے ممکن ہے کہ دامن فطرت میں پرورش پانے والے انسان کو اس فطری قانون سے مستثنیٰ قرار دیدے اور اس کے ارتقائے معنوی کے

---

[1] بحار ج ۱۷ ص ۱۲۹

راستہ میں سد سکندری قائم کر دے ؟

کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس آفریدگار نے بشر کے جسمانی تکامل کے سلسلہ میں کوئی چیز بھی نہ چھوڑی ہو وہ انسان کو اس کی روحانی ترقی کے بنیادی وسائل سے محروم کر دے گا؟ اور اس نعمت کو عطا کرنے میں بخل سے کام لے گا؟

رسولؐ اسلام کی رحلت کے بعد افکار و فرہنگ اسلامی کے اعتبار سے اس سطح تک مسلمان نہیں پہونچ پائے تھے جہاں سے اپنی تکاملی زندگی کی گاڑی کو بغیر کسی سہارے کے چلا سکیں۔ اور اسلام نے انسان کی ترقی و رشد کے لیے جو پروگرام پیش کیے تھے وہ جب تک اصول امامت سے اتصال نہ پیدا کر لیں بے روح و ناتمام تھے وہ پروگرام انسانی زندگی میں کوئی ارزشمند نقش نہیں بٹھا سکتے تھے۔

اسلامی متون چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اگر اصل امامت کو اسلام سے الگ کر لیا جائے تو اسلام کے تمام تکامل ساز قوانین کی اور رو بترقی معاشرے کی روح ختم ہو جائے گی اور اسلام ایک جسد بے روح ہو کر رہ جائے گا۔

رسولؐ اکرم کا ارشاد ہے، امام کو پہچانے بغیر جو شخص مر جائے اس کی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے [1]

چونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگ مشرک تھے نہ ان کے پاس توحید تھی نہ نبوت اس لیے رسولؐ اکرم کی یہ تعبیر اہمیت کی حامل ہے۔ کہ اگر انسان اپنی حیات معنوی کو کسی ولی کامل کے زیر نگرانی نہ قرار دے تو گویا وہ اپنی پوری زندگی جاہلیت میں گزار کر موت کی آغوش میں سو گیا۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل ص ۹۶

رسولؐ اور اسلام کا مستقبل

پیغمبر اسلامؐ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ آنکھ بند ہوتے ہی امت اپنی وحدت کو کھو بیٹھے گی اور اختلاف و تشتت کا شکار ہو جانے کی، معاشرہ فتنہ و فساد، کشمکش کا آماجگاہ بن جائے گا۔

اس وقت کا جدید اسلامی معاشرہ مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا مہاجرین میں بنی ہاشم، بنی امیہ، عدی، تیم، کے قبائل شامل تھے اور انصار میں اوس و خزرج کے قبیلے تھے لیکن پیغمبر اسلامؐ جیسی عظیم شخصیت کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد سب ہی کے سر میں سیاست و سیادت کا سودا سما گیا تھا، کسی کو اسلامی مصالح کی فکر نہ تھی ہر شخص امارت و حکومت کے چکر میں تھا، ہر شخص کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت الٰہی کو بدل کر قومی حکومت قائم کی جائے۔ لوگوں کے شخصی مصالح اور مختلف امیدوں نے آپسی اصلی و دینی رابطہ کو ختم کر دیا تھا۔ اور رسولؐ خدا اس افسوسناک عظیم حادثہ کی خبر پہلے ہی دے چکے تھے۔

"میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی صرف ایک جنتی ہوگا باقی سب دوزخی ہوں گے"[1]

رسولؐ اسلام کی رحلت کے بعد پیکر اتحاد مسلمین پر سب سے کاری ضرب جو لگائی گئی اور مسلمانوں میں جدائی کا جو بیج بویا گیا وہ رہبر و حاکم اسلامی کے بارے میں اختلاف نظر تھا جس کا نتیجہ آپسی کشمکش، جنگ و نبرد آزمائی، فتنہ و فساد کی صورت میں ظاہر ہوا۔

۱۔ صحیح ابن ماجہ باب فتن

اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

●

اگر واقعاً یہ مان لیا جائے کہ اس وحشتناک اختلاف کا پہلے سے خبر رکھنے کے باوجود رسول اکرمؐ نے کوئی علاج نہیں کیا، اور رہبر اسلامی کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد جو عظیم خلا پیدا ہوگا اور جن خطرات سے معاشرہ کو دوچار ہونا پڑے گا اس سے بچانے کی آنحضرتؐ نے کوئی تدبیر نہیں فرمائی اور کوئی ایسا پروگرام پیش کئے بغیر کہ جس سے امت اسلامی گمراہی کا شکار نہ ہو پائے دنیا سے رخصت ہو گئے تو کیا حکومت کی ذمہ داریوں اور ادارۂ امور کو مہمل چھوڑنے اور عظیم مشکلات سے امت کے دوچار ہونے کی پوری پوری ذمہ داری رسولؐ خدا پر نہیں آتی؟ حالانکہ مستقبل کے خطرات اتنے واضح و روشن تھے کہ مبدأ وحی اور عوامل غیبی کا سہارا لیے بغیر بھی ان کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔

بھلا اس بات کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ جس رسولؐ نے تبلیغ کے سلسلہ میں کسی معمولی سی چیز کو بھی تشنۂ بیان نہیں چھوڑا اور اسلام کے مستقبل، حفاظت حق و معاشرہ کے وجود سے بالکل غافل رہا ہو اور اس کی طرف اپنی ادنیٰ توجہ بھی مبذول نہ کی ہو؟ اور حفاظت رسالت کی ساری ذمہ داری مستقبل کے سپرد کر دیا ہو اور کشتی امت کو امواج فتن سے بچانے کیلئے کسی ناخدا کا انتخاب کر کے نہ گیا ہو؟ بلکہ امت کو اس کی تقدیر کے حوالہ کر گیا ہو؟

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے بعد کے لیے حکومت کا کوئی انتظام نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں ہمیشہ لب پر مہر سکوت لگائے رہے۔ اور بحران زدہ امت کو اپنے بعد کے لیے آزاد اور بغیر کسی تکلیف کو معین کئے ہوئے لقائے الٰہی

کے خواستگار ہو گئے ۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ لوگ اتنی بڑی جسارت اس عقلِ کل ؐ کی نسبت کیونکر کرتے ہیں۔ اور انکی طرف اتنی بڑی غلطی کی نسبت کیسے دیتے ہیں؟ اور وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ حضور کی موت ناگہانی نہیں ہوئی بلکہ آنحضرت برابر اپنی موت کی خبر دیتے رہے تھے کہ: بہت قریب ہے کہ میرے رب کا پیغام آجائے اور میں قبول کر لوں یعنی دنیا سے چلا جاؤں بلکہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر تو یہاں تک فرمایا کہ میں بہت جلد تم لوگوں سے جدا ہو جاؤں گا اور آئندہ سال اس جگہ تم لوگوں کو نہ دیکھ سکوں گا ۔

اسلام کو پر ثمر ہونے کے لیے ایک طویل رہگزر سے گزرنا تھا۔ اور پیچیدار انقلاب نے طے کر لیا تھا کہ زمانۂ جاہلیت کے تمام رگ و ریشہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ لوگوں کے افکار و نظریات، عقول و ارواح میں جاہلیت کے جو اثرات سرایت کر گئے ہیں ان اثرات کو صفحۂ دل و جان سے نیست و نابود کر دینا ہے۔ اسلام کو چونکہ داخلی و خارجی دونوں محاذوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ داخلی محاذ منافقین کا تھا جو پرچمِ اسلام کے نیچے جمع ہو کر صفوفِ مسلمین میں ہر قسم کی رخنہ اندازی کرنا چاہتے تھے۔ متعدد مرتبہ آنحضرتؐ کے قتل کا پروگرام بنا چکے تھے۔ یاد رہے بات ہے کہ ہر بار منہ کی کھانی پڑی تھی،، یہاں تک کہ جب ہجرت کے نویں سال رسولِ اسلامؐ نے جنگِ تبوک کیلئے رختِ سفر باندھا تو منافقین کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا اس لیے کسی بھی ناخوشگوار واقعہ سے دوچار ہونیکے اندیشہ سے پہلے ہی آنحضرتؐ حضرت علیؑ کو اپنا جانشین بنانے کے بعد ہی عازمِ سفر ہوئے۔ دوسری طرف خارجی محاذ پر اس وقت دنیا کی دو عظیم سلطنتیں تھیں روم و ایران اور ہر وقت ان سے خطرہ تھا کہ کہیں یہ حملہ آور نہ ہو جائیں اسلئے یہ بات واضح تھی کہ ایسے حالات میں رسولِ خداؐ کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ حفاظتِ رسالت کا کام ایک ایسے

ایسے شخص کے سپرد کر کے جائیں جو اتنی عظیم ذمہ داری کو سنبھال سکتے ہوں تاکہ دعوت اسلام استوار ہو جائے اور ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ و مصئون ہو جائے۔

خلیفہ اول کو حکومت اسلامی کی ذمہ داری کا احساس تھا اور یہ سوچ کر کہ حاکم اسلامی کے اٹھ جانے کے بعد عظیم خلاء پیدا ہو جائے گا اس لئے انھوں نے امت کو اس کی حالت پر نہ چھوڑتے ہوئے اپنے مرنے سے پہلے مرض الموت میں لوگوں کو یہ وصیت کی:

میں نے عمر بن خطاب کو تم لوگوں پر حاکم و امیر قرار دیا ہے لہذا ان کی باتوں کو سنو اور ان کی پیروی کرو۔[1]

چونکہ خلیفہ اول جانشین کا معین کرنا اپنا حق سمجھتے تھے اس لیے جانشین کو معین کر کے لوگوں پر ان کی اطاعت کو لازمی قرار دیا اسی طرح خلیفہ دوم نے زخمی ہونے کے بعد فوراً اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی تشکیل کر دی اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت عمر تعیین خلیفہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کے حق کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اسی لیے چھ آدمیوں پر مشتمل کمیٹی کی تشکیل کی۔

حضرت علیؑ نے بھی حالات کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہوئے اور اس خطرہ کا احساس کرتے ہوئے کہ لوگ پھر نہ جاہلیت کی طرف پلٹ جائیں بہت ہی پیچیدہ حالات و مضطرب فضا میں خلافت کو قبول کر لیا۔

اب آپ سوچئے کہ رسول اللہؐ اس حساس ترین مسئلہ سے کیونکر چشم پوشی اختیار کر سکتے تھے؟ جبکہ آپ کا دور زمانۂ جاہلیت سے بہت قریب تھا تو کیا ایسی صورت میں ممکن تھا کہ امت کو آنے والے خطرات سے آگاہ کئے بغیر اور ان خطرات سے

---

[1] تاریخ یعقوبی۔ ج ۲، ص ۱۲۶۔۔۔ ۱۲۷

حفاظت کا انتظام کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتے؟

یہ واقعہ ہے کہ اس منفی پہلو کی کوئی توجیہ و تاویل ممکن ہی نہیں ہے۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ رسولؐ اسلام اس عظیم خطرے کے تدارک کا کوئی بندوبست نہ کریں۔ اور یہ تو غیر سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ پیغمبرؐ اپنے بعد اسلام کی اہمیت کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے اور نہ اس کے لئے اپنے بعد کسی انتظام کے قائل تھے!

بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ رسولؐ اسلام بستر بیماری پر پڑے ہوئے شدید تکلیف کے باوجود رسالت و امامت کے بارے میں بہت متفکر و پریشان تھے چہرے سے اظہار تفکر و قلق نمایاں تھا بلکہ آپ اپنے کو بھول کر ساری توجہ اسی طرف مبذول کئے ہوئے تھے۔

ان حساس ترین لمحات اور اضطراب و بحرانی حالات میں جب تمام حاضرین رسولؐ کی زندگی و موت کے بارے میں سوچ رہے تھے اور لوگ پیغمبرؐ اسلام کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے کہ اس سکوت کو توڑتی ہوئی نبیؐ کی آواز گونجی:

میرے لئے کاغذ و دوات لاؤ تاکہ تمہارے لئے ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد گمراہی کا امکان ختم ہو جائے!!! [1]

اس واقعہ قلم و قرطاس پر فریقین متفق ہیں۔ پس رسولؐ کا یہ اقدام کرنا سب سے بڑی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ اپنی نورانی زندگی کے آخری لمحات تک اسلام کے مستقبل کیلئے متفکر تھے اور اپنے بعد آنے والے خطرات کے لیے بہت زیادہ فکر مند تھے امت کو انحراف سے بچانے کے لئے اور انحطاط سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ نے مستقبل کے بارے میں اپنی پریشانی کا اظہار کر دیا کیونکہ دنیا میں سب سے زیادہ سمجھنے والے

۱۔ مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۳۲۴، طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۴۴، صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲، تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۳۶

اور عمیق فکر رکھنے والے آپ ہی تھے۔

●

ایک بات اور بھی بہت زیادہ توجہ کے قابل ہے کہ پہلی آسمانی شریعتوں اور ادیان کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ تمام انبیا کرام وحی الٰہی کے مطابق اپنے جانشین کا انتخاب اپنی زندگی ہی میں کر دیتے تھے مثلاً جناب آدمؑ، جناب ابراہیمؑ، جناب یعقوبؑ، جناب موسٰیؑ، جناب عیسٰیؑ علیہم السلام نے اپنے اپنے وصی کا انتخاب کر کے ان کے اسماء کا اعلان بھی کر دیا تھا[1] رسولؐ کی حدیث ہے: ہر پیغمبر کا ایک وصی و وارث ہوتا ہے اور علیؑ میرے وصی و وارث ہیں۔[2]

نیز قرآن مجید کا حتمی فیصلہ ہے کہ سنت الٰہی میں کوئی تبدیلی اور کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں ہے۔ تو پھر رسولؐ اسلام کو بھی اسی سنت الٰہی پر وحی الٰہی کے مطابق عمل کرنا ضروری تھا اور اپنے وصی کا امت کے لیے اعلان کرنا واجب تھا۔ ایسا ہوا بھی کہ رسولؐ خدا نے امر پروردگار کے بموجب اور بقائے رسالت کے لیے اپنے وصی کو منتخب کر کے اعلان کر دیا اور امت کی تکلیف معین کر دی۔ اور یہ عقیدہ کتاب خدا سے ناشی ہے۔

● مسلمانوں کے اس عقیدہ کے باوجود کہ آنحضرتؐ نے ابوبکر، عمر، عثمان کو کبھی بھی اپنے جانشین کی حیثیت سے متعارف نہیں کرایا۔

● قرآن و سنت میں ان حضرات کی خلافت کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔

● یہ مسلم ہے کہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت دینی تعلیم کے مسلمات سے نہیں ہے

---

[1] اثبات الوصیۃ مسعودی، تاریخ یعقوبی

[2] تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۵، ریاض النضرۃ ج ۲ ص ۱۷۸

بلکہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور ہر مسلمان کو حق ہے کہ اپنی تحقیق و اپنی نظر کے مطابق اس مسئلہ میں مخصوص رائے رکھے۔ اور منطق سلیم کا بھی یہی تقاضا ہے ——

—— لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مذہب اہلسنت کسی مسلمان کو مسئلہ خلافت پر بحث و فحص کی اجازت نہیں دیتا۔ اور ہر شخص کا جو فطری حق ہے۔ "یعنی تحقیق و تفتیش کھلے ذہن کے ساتھ منطقی استدلال، جو قرآن و سنت کے مطابق بھی ہے" اسکو چھین لیتا ہے۔ اس لئے ہم اس نتیجہ تک پہونچنے میں بر حق ہیں کہ مسئلہ خلافت اہلسنت کی نظر میں ایک جذباتی چیز ہے، کوئی عقلی و شرعی چیز نہیں ہے۔" اور اتنی بات سب ہی جانتے ہیں کہ جب عقل پر جذبات کا غلبہ ہو جائے تو انسان نہ کسی معیار کو مانتا ہے نہ دلیل کو۔ یہی حال برادرانِ اہلسنت کا بھی ہے۔

حضرت علیؑ کی قیادت کا قانونی اعلان

رسول اکرمؐ کے انتقال کے بعد اور عظیم رہبر سے معاشرے کے خالی ہو جانے کے بعد اسلام اور امت مسلمہ کی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ اس عظیم رہبر کی جگہ پر کوئی ایسا لائق و فائق و ممتاز رہبر آئے جو علم و تقویٰ کی چوٹی پر فائز ہو تاکہ انقلاب اسلامی انحراف کا شکار نہ ہو سکے اور نہ جاہلیت کی طرف پلٹ سکے بلکہ اجتماعی اور سیاسی نظام اس رہبر کی وجہ سے مستحکم تر ہو جائے۔

کیونکہ رہبریت کا مسئلہ اگر اس امت کے ہاتھ میں دے دیا جائے جو ابھی تازہ تازہ رسوم جاہلیت کی گرفت سے آزاد ہوئی ہے اور ابھی تک جاہلیت کے عقائد کی جڑیں اسکے رگ و ریشے میں پیوست ہیں تو پھر کسی بھی طرح سے صاحب رسالت کے عظیم مقاصد کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکیں گے اور اسلام کو منفی عوامل کے خطرات سے بچایا نہ جا سکے گا۔

اس لئے ان اہم مقاصد کی تکمیل کے لیئے صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایسی شخصیت کی رہبری تسلیم کر لی جائے جو مسائل رسالت سے آگاہ ہو، وسیع علم و دانش سے آراستہ ہو، ایمان کے بلند ترین جگہ پر فائز ہو، خطا و نسیان سے اسی طرح دور ہو جس طرح رسول اکرمؐ تھے کیونکہ اس وقت اسلامی معاشرہ کو ایک ایسے ہی قائد اور رہبر کی شدید ضرورت تھی جو زمام حکومت کو سنبھال سکے اور انسانی تعلیم و تربیت کو بڑی دقت نظر سے تکمیل کی منزل تک پہونچا سکے اور اسکی قیادت کے زمانے میں شریعت کو جیسی بھی مشکل پیش آجائے اسکو حل کر سکے۔

تاریخی شواہد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کی واپسی پر رسول اکرمؐ نے علیؑ کو فرمان خداوندی کی بنا پر اپنا وصی و جانشین نامزد کر دیا اور اس طرح انقلاب کا دائمی راستہ دستبرد حق و سعادت امت کے لیے معین کر دیا۔

ہجرت کے دسویں سال جو آنحضرتؐ کی عمر کا آخری حصہ ہے آپ نے طے کیا کہ اسلام کے عظیم ترین اجتماع میں جو مکہ میں ہو گا شرکت کریں گے۔ اس خبر کے نشر ہوتے ہی کہ اس سال رسولؐ حج کریں گے دور و نزدیک سے مسلمان جوق در جوق مدینہ کے لیے نکل پڑے تاکہ رسول اکرمؐ کی ہمراہی کے شرف کے ساتھ آنحضرتؐ کے ہمراہ حج کر کے مناسک حج سیکھ لیں۔

آخر کار مہاجرین و انصار و دیگر مسلمانوں پر مشتمل یہ کاروان اپنے عظیم پیشوا کی سرکردگی میں مدینہ چھوڑ کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ مکہ پہونچتے ہی سب سے پہلے زیارت کعبہ سے آغاز کیا۔ اور شہر مکہ پر شکوہ مراسم اسلامی کے منظر کا شاہد تھا معلوم ہوتا تھا کہ ہزاروں مسلمانوں پر مشتمل بحر اوقیانوس کی جگہ ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجیں ہیں جو اپنے عظیم رہبر کے ساتھ ادائے مراسم میں مشغول ہیں۔ پیغمبر اسلام بھی اپنے خدا کے حضور حج سربلند تھے کہ اتنے آلام و مصائب برداشت کرنے کے بعد آج اپنی محنت کا صلہ دیکھ رہے تھے۔

اس سال کے حج کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے فریضۂ حج مکمل کر کے حاجیوں کی عظیم تعداد کو ہمراہ لے کر رسول خدا مدینہ کی طرف چلے۔ مورخین نے ۹۰ ہزار سے ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں کا تخمینہ لگایا ہے۔ اور جب یہ عظیم لشکر مکہ کی وادیوں کو اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا "غدیر خم نامی" بے آب و گیاہ جنگل میں پہونچا[1] تو دفعۃً جبرئیل آیت لے کر آئے اور رسول اکرمؐ سے کہا کہ اسی جگہ توقف فرمایئے۔ پیغمبرؐ نے لشکر والوں کو سفر سے

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۰۹ ـ ۲۱۳، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۳ ـ ۱۶۵

[2] تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۱۳

روک دیا اور پیچھے رہ جانے والے حاجیوں کا انتظار کرنے لگے۔

تھکے ماندے گرمی کے مارے مسافروں کو ٹھیک دوپہر میں بھڑکتی ہوئی زمین کے اوپر، چمکتے ہوئے سورج کے نیچے ٹھہرنے کا حکم سنتے ہی پورے قافلہ میں تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ جبرئیل نے آکر پیغمبر اسلام کو یہ مژدہ سنایا:

"اے رسول! جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے پہونچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے اس کا کوئی پیغام ہی نہیں پہونچایا اور تم ڈرو نہیں، خدا تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔[۱]

آیت کے مضمون میں ذرا سی دقت کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا کا یہ پیغام اتنا عظیم تھا کہ پیغمبرؐ اس کے پہونچانے سے خائف تھے اور حکم ایسا تھا کہ اگر اسکو نہ پہونچایا تو کوئی بھی پیغام نہیں پہونچایا اور اسکو پہونچا دیا تو سب کچھ پہونچا دیا۔

اس آیت میں خدا نے اس امر کی اہمیت سمجھا دی اور اس پیغام کے پہونچانے پر جو خطرات درپیش ہو گئے ان سب سے حفاظت کی ذمہ داری بھی لے لی۔

واقعہ غدیر کے ستر دن بعد آنحضرتؐ اس دار فانی سے رخصت سفر باندھ لیتے ہیں بنا بریں ۲۳ رسال تک مبدء وحی سے انسانی ہدایت و سعادت کے لئے جو چیزیں لازم تھیں ان کو حاصل کرکے دنیا والوں کے سامنے پیش کر چکے تھے لیکن یہ مسئلہ کچھ زیادہ ہی اہمیت کا حامل تھا کہ جس کی تبلیغ پر تکمیل رسالت موقوف تھی اور اتمام نعمت و رضائے الٰہی بھی اسی مسئلہ سے وابستہ تھی۔

ایک احتمال یہ بھی تھا کہ اس فریضہ کی ادائگی پر رسول خدا کو بدخواہوں کی شرارت کا نشانہ بننا ہوگا تو خدا نے رسولؐ کو یہ کہکر تسلی بھی دیدی کہ خدا انکو لوگوں کے شر سے محفوظ

۱؎ پ ۶ سش ۔ مائدہ، آیت ۶۷

محفوظ رکھے گا۔

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ اس امر کا موضوع کس قدر اہم تھا کہ اس کی ادائگی تکمیل رسالت کا سبب اور عدم ادائگی رسالت میں نقص کا سبب ہے ـــــ اس کے علاوہ اس زمانہ کے عربوں کا عام نظریہ تھا کہ منصب و سرپرستی کے لائق وہی لوگ ہوتے ہیں جو سن رسیدہ ہوں لیکن جو نوجوان ہوں زمانہ کے گرم و سرد کو نہ دیکھے ہوں وہ بلند مقامات کے لئے موزوں نہیں ہوا کرتے۔ اس اعتبار سے بھی امر الٰہی کی تبلیغ کے لیئے زمین جوانوں کے لئے سازگار نہ تھی۔

نیز وہ گذشتہ تلخ واقعات کی یادیں بھی رہبر اسلام کی روح کو بے حد اذیتیں دیتی تھیں اور رسولؐ اسلام کا رنج و غم اور بڑھ جاتا تھا۔ اور ابھی تو آپ اسامہ بن زید اور عتاب کے معاملے میں تنگ نظر صحابہ کا برتاؤ نہیں بھول پائے تھے کہ جب اسامہ کو لشکر کی سرداری بخشی اور عتاب کو مکہ کی گورنری تو ایک گروہ نے کھل کر مخالفت کی اور رسولؐ پر اعتراض کیا ـــــــــــــــــ یہی وہ عوامل و اسباب تھے کہ رسولؐ خدا حضرت علیؑ کی ولایت و جانشینی کے اعلان میں تردد فرما رہے تھے۔ کیونکہ ایک تو حضرت علیؑ کی عمر ابھی صرف ۳۳ سال تھی دوسرے عرب کا نظریہ جوانوں کی سربراہی کو قبول کرنے کے فیوچر میں نہیں تھا۔

اس کے علاوہ بہت سے وہ لوگ جو آج مسلمانوں کی صف میں تھے اور صحابہ میں شمار ہوتے تھے وہ میدان جنگ سے شکست کھائے ہوئے تھے۔ حضرت علیؑ نے ان کے قریبی رشتہ داروں کو واصل جہنم کیا تھا اس کی وجہ سے موضوع مزید حساس ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جب بھی ان تکلیف دہ واقعات کو یاد کرتے تھے ان کے دل حضرت علیؑ سے متنفر ہو جاتے تھے اور ان کے سینہ میں

آتشِ کینہ بھڑک سکتی تھی اس وجہ سے رسولؐ متامل تھے۔

لیکن اس ناہموار فضا کے باوجود ارادہ الٰہی یہ ہوا کہ حق کی عنایتوں کے زیرِ سایہ بزمِ پیغمبرؐ سے اعلیٰ ترین مقامِ معنوی جس نے حاصل کیا ہو اور جو بہترین و والاترین شخصیت ہو جانشینیٔ رسولؐ کے لیے اسی کا اعلان کیا جائے اور اس عظیم شخصیت کے معین کر دینے کے بعد پیغمبرؐ کی تبلیغ جہانی مکمل ہو جائے گی۔

●

شیعہ محدثین نے اور سنی محدثین کی ایک جماعت نے[1] تصریح کی ہے کہ آیۃ یا ایہا الرسول بلغ..... الخ غدیر خم میں نازل ہوئی ہے اور صاحبِ ما ینطق عن الہوی کو بحکمِ خدا بسبب نزولِ وحی و از روئے حکمت اس میدان میں حکم ملا کہ اسلام کے اہم ترین بنیادی موضوع کا اعلان کر دیجیے یعنی علیؑ کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیجیے۔

جی ہاں علیؑ ہی کی وہ شخصیت تھی جو کبھی شرک و گناہ سے آلودہ نہیں ہوئے جنھوں نے اپنی پوری زندگی دینی تعلیمات کی نشر و سربلندیٔ اسلام کی خاطر صرف کر دی آپ تمام پیغمبروں کا آئینہ تھے۔ قوانین و سنن دین کے محافظ تھے۔ اور انسان کی کمال و رستگاری کی طرف رہبری کرنے والے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ لباسِ امامت و پیشوائی انھیں کے قدِ رعنا پر فٹ بھی تھا۔

---

[1] سنی محدثین میں سے واحدی نے اسباب النزول کے ص ۱۵۰ پر، سیوطی نے درِ منثور کی جلد تین ص ۲۹۸ پر، قندوزی نے ینابیع المودۃ کے ص ۱۲۰ پر، آلوسی نے اپنی تفسیر کی چھٹی جلد کے ص ۱۷۲ پر، قاضی شوکانی نے فتح القدیر ج ۳ کے ص ۵۷ پر، فخر رازی نے اپنی تفسیر کی تیسری جلد کے ص ۶۳۶ پر، بدر الدین نے عمدۃ القاری کے ص ۵۸۴ پر اور شیخ محمد عبدہ نے تفسیر المنار میں آیۃ یا ایہا الرسول بلغ کے ذیل میں اسکو تحریر فرمایا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ عظیم اجتماع جو میدان غدیر میں ہو گیا تھا نماز کا وقت آنے کے بعد سب نے پیغمبر اسلام کے ساتھ نماز ظہر ادا کی[1] نماز کے بعد پورے میدان میں اکٹھا ہو جانے والے حضرات جو کسی تازہ کی حادثہ کا انتظار کر رہے تھے ان کے درمیان خدا کے تاکیدی فرمان کی بجا آوری کے لیئے رسول اکرم اٹھے۔ اور پالان شتر سے بنے ہوئے منبر پر قدم رکھا اور ایسی جگہ بیٹھے جہاں سے پورا مجمع آپ کو دیکھ سکے اور آپ کے بیان کو سن سکے۔ اس کے بعد ملکوتی آواز، شیریں لب و لہجہ، کامل دوریساصدا کے ساتھ اس وسیع فضا میں آنحضرتؐ نے ایک ایسا خطبہ دیا جس کو تمام لوگوں نے سنا۔ آپ نے اس خدائے حکیم و قدیر و بصیر کی کہ جس کے علم و حکمت کو کوئی زوال نہیں ہے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

لوگو ممکن ہے کہ میں بہت جلد تمہارے درمیان سے اٹھ جاؤں اور دعوت الٰہی پر لبیک کہوں۔ سنو! تم بھی ذمہ دار ہو اور میں بھی ذمہ دار ہوں کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ خدا ایک ہے؟ اور محمدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں؟ اور یہ کہ جنت و دوزخ حق ہے، موت حق ہے، بعث حق ہے، اور قیامت آنے والی ہے اور خدا مُردوں کو قیامت میں ان کی قبروں سے اٹھائے گا۔ سب نے بیک زبان کہا: ہاں ہم ان چیزوں کی گواہی دیتے ہیں!

اس کے بعد آپ نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: جب تم لوگ حوض کوثر پر میرے پاس آؤ گے تو میں دو بہت ہی گرانقدر چیزوں کے بارے میں تم سے پوچھوں گا کہ تم نے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا۔ ایک تو کتاب خدا کے بارے میں جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا تمہارے۔ اسکو

---

[1] مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۲۸۱؛ تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۱۲

مضبوطی سے پکڑے رہو تاکہ گمراہ نہ ہو سکو اور دوسری میری عترت و اہلبیتؑ میں خداوند لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ ان دونوں میں حوض کوثر کے پہنچنے تک کوئی اختلاف نہیں ہو گا ——— لہٰذا تم لوگ ان دونوں کے متعلق امانت سے روگردانی نہ کرنا تم لوگ جب تک ان دونوں سے متوسل رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہوگے ایک کتاب خدا اور دوسرے میرے اہلبیتؑ ۔ ۱؎

پھر علیؑ کو اپنے قریب بلا کر ان کے ہاتھ کو پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ لوگ باقاعدہ پہچان لیں اس کے بعد فرمایا : مسلمانو تمہارے نفوس پر تم سے زیادہ اولویت کون رکھتا ہے ؟ لوگوں نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتا ہے تب رسولؐ نے فرمایا : جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے یہ علیؑ مولیٰ ہیں ۲؎ خداوندا جو علیؑ کو دوست رکھے تو بھی اس کو دوست رکھ اور جو علیؑ کو دشمن رکھے تو بھی اس کو دشمن رکھ ۳؎ جو علیؑ کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر ، جو علیؑ کی مدد نہ کرے تو بھی اس کی مدد نہ کر سکے ۴؎ بار الٰہا حق کو ادھر پھیر جدھر علیؑ پھریں ۵؎ !

۱؎ صحیح ترمذی ج ۵ ص ۳۲۸ ۔ ۲؎ کنز العمال ج ۱۵ ص ۱۲۲ ۔ ۳؎ مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۱۱۸ و ۱۱۹ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۰۹ ، تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۰۹ و ۲۱۳ ،

۴؎ مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۰۳ و ۱۰۵ ، شواہد التنزیل ص ۱۹۲ ج ۱ ، مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۱۱۹ ، تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۱۱ ۔ ۵؎ حدیث غدیر مختلف طریقوں سے اہلسنت کی کتابوں میں درج ہے ۔ الغدیر ج ۱ ص ۱۴ سے ۷۲ تک دیکھئے ۔ اس حدیث کو ایک سو دس صحابہ کرام نے روایت کی ہے ۔ ان میں سے ابوبکر ، عمر بن خطاب ، ابی بن کعب ، اسامہ بن زید ، انس بن مالک ، جابر بن عبداللہ ، زید بن ارقم ، سعد بن عبادہ ، طلحہ ، زبیر ، ابن مسعود وغیرہ مشہور صحابی بھی شامل ہیں ۔ ۔ باقی صفحہ آئندہ پر ۔

ان کلمات کے اختتام پر فرمایا تم لوگ دوسروں کو مطلع کر دو جو لوگ موجود ہیں وہ غائب حضرات کو اس واقعہ کی اطلاع کر دیں۔

بیشک جو شخص آج فرمان الٰہی اور پیغام رسالت پناہی کی بنا پر سریر آرائے تخت ولایت ہوا اور امت کی ہدایت کا سردار بنایا گیا وہ حضرت علیؑ تھے اس طرح عالم اسلام کا سب سے شائستہ ترین شخص جو منبع علوم و فضائل تھا مسلمانوں کی رہبری کیلئے منتخب کیا گیا۔ اور رسول اسلامؐ نے امامت و خلافت کے مسئلہ کا اعلان کر کے قیامت تک کے لیے مسلمانوں پر حجت تمام کر دی۔

ابھی مجمع اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ جبرئیل امین وحی رب العالمین لے کر رحمۃ للعالمین کے پاس پہونچے کہ خدا نے فرمایا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً (پ ۶ س ۵، مائدہ، آیت ۳)[1]

بقایا حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ ترمذی نے اپنی صحیح کے ج ۲ ص ۲۹۷ پر، حاکم نے مستدرک کے ج ۳ ص ۱۰۹ پر، فخر رازی نے مفاتیح الغیب کے ج ۳ ص ۶۳ پر، واحدی نے اسباب نزول کے ص ۵۰ پر، ہیثمی نے مجمع الزوائد کے ج ۹ ص ۱۰۴ پر، یعقوبی نے اپنی تاریخ کے ج ۲ ص ۹۳ پر، ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ کے ج ۵ میں، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد کے ج ۷ ص ۳۷۷ پر، ثعلبی نے اپنی تفسیر کے ص ۱۲۰ پر، ابن حجر نے صواعق کے فصل ۵ باب اول میں اس حدیث کا تذکرہ کیا ہے۔

[1] پ ۶ س ۵ آیت ۳، مائدہ۔ جلال الدین سیوطی نے درمنثور کے ج ۲ ص ۲۵۹ پر، ابن کثیر نے ج ۲ ص ۱۴ پر، حموینی نے فرائد السمطین کے باب ۱۲ میں، خطیب نے تاریخ بغداد کے ج ۸ ص ۲۹۰ پر، صاحب اتقان نے ج ۲ ص ۳۱ پر، خوارزمی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں نازل ہوئی ہے۔

ترجمہ : آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اس دین اسلام کو پسند کیا۔

یعقوبی[1] نے لکھا ہے کہ یہ آخری آیت ہے جو رسول خدا پر غدیر خم میں نازل ہوئی پیغمبر اسلام جب منبر سے اترے تو ساری فضا نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی لوگوں نے بڑی گرمجوشی اور مسرت اور سرور کے ساتھ ولایت علیؑ کا استقبال کیا۔ تمام حجاج گروہ در گروہ حضرت علیؑ کے پاس جاکر رہبریت کی تہنیت و تبریک پیش کرنے لگے۔ اور ان کو مومنین و مومنات کے مولیٰ کے خطاب سے پکارنے لگے۔

اس زمانہ کے مشہور شاعر حسان بن ثابت نے جو اس مجمع میں موجود تھے رسول اکرمؐ سے اجازت لے کر اس روز عید کے لیئے شاندار قصیدہ نظم کیا اور لوگوں کے سامنے اس کو پڑھا۔[2]

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۳۶

[2] يناديهم يوم الغدير نبيهم ؛ بخم واكرم بالنبيّ مناديا
يقول فمن مولاكم ووليكم ؛ فقالوا ولم يبدوا هناك التعاديا
الٰهك مولانا وانت ولينا ؛ وما لك منا في البرية عاصيا
هناك دعا قم يا عليّ فانني ؛ نصبتك من بعدي اماما وهاديا

ترجمہ : غدیر کے دن مسلمانوں کا نبیؐ خم کے میدان میں صدا دے رہا تھا اور کتنا اچھا نبی ہے جو آواز دے رہا ہے۔

۲. فرمایا تمہارا مولا آقا کون ہے سب نے کہا۔ کسی نے بھی مخالفت کا اظہار نہیں کیا۔ ہم آپ کا خدا ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے ولی ہیں پوری دنیا میں ہم لوگوں میں سے کوئی

آیہ اکملت کی دلالت بخوبی اس بات پر موجود ہے کہ دین خدا اس دن مرحلۂ کمال کو پہونچا اور نعمت الٰہی تمام ہوئی ، دین کا کامل ہونا اور نعمت کا تمام ہونا خود اس بات کو بتاتا ہے کہ اس دن کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے جس کی اہمیت کا قرآن اظہار کر رہا ہے کہ اسی کی وجہ سے خدا کی مرضی حاصل ہوئی اور اسلام پسندیدہ دین بنا یعنی علیؑ کو جانشین بنانے کے بعد دین حق اپنے کمال کو پہونچ گیا اور وصی پیغمبرؐ کے انتخاب سے نعمت تمام ہوگئی ۔

حدیث متواتر اور فریقین کی متفق علیہ و معتبر تاریخی کتابیں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ آیہ اکملت لکم ۔ ۔ ۔ الخ رسول خدا پر غدیر خم میں نازل ہوئی یعنی جس دن رسولؐ نے اپنے بعد کے امامت و قیادت کے لیے علیؑ کا اعلان کیا اس دن یہ آیت اتری اور تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ سورہ مائدہ ـــــ اسی میں آیت اکملت لکم دینکم ہے ـــــ وہ آخری سورہ ہے جو رسولؐ اسلام پر نازل ہوا اس کے بعد کوئی نئی سورت نہیں نازل ہوئی اور یہ سورہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں نازل ہوا ہے ۔

بعض لوگوں کو یہ گمان ہو گیا ہے کہ " الیوم " سے مراد زمانۂ بعثت ہے کہ اس دن خدا نے دین کو کامل اور نعمت کو تمام کیا ہے ۔ مگر یہ گمان بالکل بے بنیاد ہے ۔ حقیقت و واقع سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے ۔ اور نہ یہ تاریخی حقیقت

= آپ کے حکم کا نافرمان نہیں ہے ۔

ہر پھر نبیؐ نے کہا اے علیؑ اٹھو ! میں نے تم کو اپنے بعد کے لیے امام و ہادی معین کر دیا ہے ۔

آیت سے کسی طرح مربوط ہے۔ کیونکہ یوم بعثت تو نعمت خدا کی ابتدا کا دن ہے نہ کہ انتہا کا دن ہے۔ اور ان دونوں میں بہت زیادہ تفاوت ہے کجا ابتداء کجا انتہا!

آیت کہہ رہی ہے آج دین کو کمال بخشا، نعمت کو تمام کیا یعنی جس دن یہ اہم واقعہ ہوا خدا نے اس دن یہ سب کیا۔ حدیث و تاریخ دونوں میں سے کوئی بھی اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا کہ یہ آیت بعثت میں اتری۔

واقعہ غدیر اور جس ماموریت کی تعمیل پیغمبر اسلام نے کی تاریخ اسلام میں اس کی بہت زیادہ گونج رہی۔ متعصب اور جمود فکری رکھنے والے مورخین کے علاوہ تمام ان مورخین نے جن کا نظریہ صرف واقعات کا تحریر کرنا اور تاریخی حقائق کا محفوظ رکھنا تھا سبھوں نے اس داستان کو بیان کیا ہے اور اس کے متعلق جزئیات تک کو بھی نہیں چھوڑا۔

زمانہ رسولؐ سے قریب صدیوں میں اس دن کی مسلمانوں میں بہت شہرت تھی اور متعدد شواہد ایسے موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس دن جشن منایا کرتے تھے اور تمام لوگ شرکت کرتے تھے۔

مشہور مورخ ابن خلکان اٹھارہویں ذی الحجہ کو عید غدیر کے نام سے یاد کرتا ہے۔ [1]

مسعودی نے شب ۱۸ ذی الحجہ کو شب عید غدیر کے نام سے ذکر کیا ہے [2]

پانچویں صدی ہجری کا مشہور ایرانی دانشمند ابوریحان بیرونی روز غدیر خم کو یوم عید شمار کرتا ہے کہ مسلمان اس دن جشن مناتے ہیں۔ [3]

---

[1] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۶۰۔ [2] التنبیہ والاشراف ص ۲۲۲ اور میں نے ص ۲۲۱ پر دیکھا ہے لکھا ہے غدیر اٹھارہویں ذی الحجہ ہے حضرت علیؑ کی اولاد اور ان کے شیعہ اس دن کا احترام کرتے ہیں۔ [3] ترجمہ آثار الباقیہ ص ۳۳۴

مٹی بن جاتا ہے اور پھر وہ اس کی ایک نئی شکل ہوتی ہے کہ کسی دن وہ نبات بن کر ابھرتا ہے۔ اور حیوان کی غذا ہو کر حیوان کے جسم کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا جوہر بہرحال ثابت رہتا ہے۔ اور ان تمام تحولات کے درمیان وہ معدوم نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ ہمارے نیک اعمال بدے منتشر ہونے والی طاقت کی مختلف شکلیں یا دیت کا رنگ اختیار کر کے مخزن کائنات میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اور سعادت و خیر کی حیثیت سے یا شقاوت و عذاب دائم کی حیثیت سے ہمارے انجام کی یقینی شکل و صورت اختیار کر لینے کی حامل موثر ہی طاقت ہے۔

ہمارے زمانے میں فنون ٹیکنالوجی کے محققین اور علماء کی کوششیں اس حد تک ترقی آور ہو ہی گئی ہیں کہ وہ سابق بنی انسان کی آواز کی موجوں کو واپس لا سکتی ہیں اور وہ ایک مخصوص حد تک پیچیدہ آلات کے ذریعہ بعض صنعت کاروں کی ان آوازوں کو جو بنائی ہوئی چیز پر ارتعاش کی صورت میں نقش ہو کر بھی واپس لا سکتی ہیں۔

بذات خود یہ علمی کامیابیاں بعث کے حق ہونے پر دلیل ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جس سے معاد کے بارے میں غور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو غور و فکر سے مقرون ہے اور عملی طریقے سے اس کا اثبات کیا جا سکتا ہے۔ اور جب ایسا ہے تو پھر خدا انسانی جسم کے ذرات جو منتشر ہو چکے ہیں انہیں واپس لا کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے؟

قرآن اس حقیقت کی طرف متعدد بار اشارہ کرتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (سورہ طہ آیۃ ۵۵) یعنی ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا اور مرنے کے بعد اسی زمین میں لوٹا کر لائیں گے اور اس سے دوسری بار (قیامت کے دن) تمہیں نکال کھڑا کریں گے۔ یہ آیۂ کریمہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ہم خداوند عالم کی قدرت خلاقہ میں غور و فکر کریں۔ اور یہ آیۃ دنیا و آخرت میں انسان کے ماضی و مستقبل کو کچھ اس انداز سے پیش کر رہی ہے

جو انسان کے مضطرب دل کو سکون عطا کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا کیونکہ ایسا ہونے پر خلقت میں ہونے والے تغیرات بے مقصد و عبث ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ زندگانی دنیا میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خلقت کی ہدف غائی بن سکے اور اگر ہم پورے نظام وجود کو بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نتیجہ بہت ہی کمزور ہے یا اس مقصد رفیع و عظیم کی قیمت نہیں قرار پا سکتی۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ زمین کے کیمیاوی اثرات کی وجہ سے انسان کا جسم منتشر و ناپید ہو کر ضائع و ختم ہو جاتا ہے اور دوبارہ اسے زندہ نہیں کیا جا سکتا، قرآن انہیں متوجہ کر کے کہتا ہے: فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۔ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۔ (س ق، آیۃ ۲،۳،۴)

پس کفار کہنے لگے یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔ بھلا جب ہم مر جائیں گے اور (سڑ گل کر) مٹی ہو جائیں گے تو پھر یہ دوبارہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید (بات) ہے۔ ان کے اجسام سے زمین جس چیز کو (کھا کھا کر) کم کرتی ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ اور ہمارے پاس تو تحریری یادداشت کتاب (لوح محفوظ) (موجود) ہے۔

جو لوگ مُردوں کے زندہ ہونے کی تصدیق نہیں کرتے یہ آیۃ ان لوگوں کے لئے بیان ہے اور یہ آیت اس بات کی تصریح کر رہی ہے کہ بدن کے تکوین میں استعمال شدہ عناصر جو ٹوٹ پھوٹ کر سڑ گل جاتے ہیں اور خزانۂ فطرت میں پلٹ جاتے ہیں ہم ان کی جگہ کو جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ قیامت کے دن ان کے متفرق اجزاء کو ہم جمع کریں گے اور بدن کو از سر نو زندہ کریں گے، جسے تم امر محال خیال کرتے ہو۔ یہ اگرچہ ایک جدید قالب میں ہے۔ لیکن پھر بھی پہلے کے مثل ہے۔

صدر اسلام میں ایک مرتبہ رسول خدا (ص) معاد کے بارے میں تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں

نفوس پر اپنی اولویت کا اقرار لے لیا تو فوراً فرمایا جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علیؑ بھی مولیٰ ہیں، جس کا فطری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ یہاں بھی مولیٰ بمعنی اولیٰ استعمال کیا گیا ہے جو منصب رسولؐ نے اپنے لئے ثابت کیا ہے وہی علیؑ کے لئے۔ اور اگر اولویت کے معنی مراد نہ ہوتے تو پیغمبرؐ کا اپنے لئے اولویت کا اقرار لینا بے معنی سی بات ہوتی، کیا اس جملہ سے ایک معمولی سی اسلامی دوستی سمجھ میں آتی ہے؟

اردو کے مشہور شاعر علی حسن صاحب جائسی فرماتے ہیں،

ہے چہ ادراک معنی من کنت مولیٰ میسری ہے سود ٭ علیؑ مولا بآن معنی کہ پیغمبر بود مولیٰ۔ مترجم۔

رسولؐ خدا نے ابتداء کلام میں لوگوں کو یہ کہکر مخاطب کیا: کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ خدا واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے؟ کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ محمدؐ رسول اللہ ہیں؟ اور جنت و جہنم حق ہے؟ اس سوال کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں اصول کے ساتھ ایسی ہی ایک اصل کا اور اضافہ کریں؟ کیا پیغمبرؐ کا ہدف اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو سمجھائیں علیؑ کی ولایت و خلافت کا اعتراف تینوں اصولوں کی طرح ایک بنیادی چیز کا اعتراف ہے۔

اگر رسولؐ کا مقصد مولیٰ سے محض دوست و مددگار کے ہوتے تو اس اعتبار سے علیؑ کی ولایت اسی طرح سنت اسلامی ہوتی جس طرح دیگر مومنین کی ولایت سنت اسلامی ہے۔ اسمیں علیؑ کے تخصیص کی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ یہ بات تو ابتدائے اسلام سے اسلامی اخوت کے الف، با میں شمار ہے اس لئے کہ یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ اس موضوع کا اعلان اتنے بڑے اجتماع میں کیا جائے اور وہ بھی ان مقدمات کے ساتھ۔ اور اتنی لمبی چوڑی تقریر کے بعد! اور نہ اس کی ضرورت تھی کہ پہلے لوگوں سے اصول سہ گانہ کا اقرار کرائیں پھر اس مطلب کو بیان کریں۔

اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ آنحضرتؐ اس مجمع عظیم میں حضرت علیؑ کا نام لینے سے پہلے اپنی موت کے قریب آنے کا ذکر فرماتے ہیں اور خبر دیتے ہیں کہ میں عنقریب تم لوگوں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ یہ ساری باتیں کر کے رسولؐ لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے رہبر کے مر جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوگا اس کو پُر کرنا ضروری ہے اور فوراً علیؑ کا تعارف کرا کے بتانا چاہتے ہیں کہ یہی شخص اس خلا کو پُر کر سکتا ہے ورنہ صرف علیؑ کی دوستی یا ان کی مدد رسولِ اسلام کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پُر نہیں کر سکتی۔ آخر اس شدید گرمی میں ایک لمبی چوڑی تقریر یہاں لاکھ کے مجمع میں کر کے صرف یہ بتانا کہ جس کا میں دوست ہوں اس کے علیؑ بھی دوست ہیں یہ کوئی معقول بات ہے؟ کیا قرآن نے مومنین کو ایک دوسرے کا بھائی اور دوست نہیں کہا ہے؟[1] اور ایک دوسرے کو بھائی کی حیثیت سے متعارف نہیں کرایا ہے؟[2] جب یہ سب قرآن پہلے کر چکا ہے تو ایسی شدید گرمی میں اس کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس لئے ایسی حالت میں اور اس عظیم حادثہ کے پیش نظر رسولِ خدا نے اس کے لئے جتنی اہمیت دی اور جیسے مقدمات مہیا کئے ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا کہ صرف علیؑ کی محبت کا اظہار مقصود تھا۔ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے۔

ایک اور بات دیکھئے رسولؐ کا خطبہ ختم ہونے کے بعد اصحاب رسولؐ کا حضرت علیؑ کے پاس تانتا بندھ جانا اور علاوہ لوگوں کی تبریک و تہنیت پیش کرنا اور مستقل نماز مغرب تک اس سلسلہ کا چلتے رہنا خود قرینہ ہے کہ رسولؐ نے علیؑ کی جانشینی کا اعلان کیا تھا۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ مبارکباد دینے والوں میں ابوبکر و عمر

---

[1] پ ۱۰ ص، توبہ، آیت ۷۱، [2] پ ۲۶ ص، حجرات، آیت ۱۰.

طلحہ، زبیر بھی تھے۔ بلکہ سب سے پہلے عمر حضرت علیؑ کے پاس آئے اور کہنے لگے: مبارک ہو مبارک اے علیؑ تم تو میرے اور تمام مومنین و مومنات کے مولیٰ ہو گئے

حضرت علیؑ کو قیادت و جانشینی کے علاوہ کون سا دوسرا منصب عطا کیا گیا تھا۔ جس پر مبارکباد پیش کی جا رہی ہے؟ کیا حضرت علیؑ کی محبت اس وقت تک مسلمانوں سے مخفی تھی؟

پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسان بن ثابت بھی اس مجمع میں موجود تھے انھوں نے مولیٰ کے معنی امامت و ولایت کے ہی سمجھے اور اپنے اشعار میں کہا:

هناك دعا قم يا علي فانني   نصبتك من بعدي اماما وهاديا

پیغمبرؐ نے علیؑ سے کہا اٹھو: میں نے تم کو بعد کے لئے امام و ہادی بنا دیا ہے

بعد کی صدیوں والے شعراء اور ادباء جو زبان عرب کے استاد مانے جاتے تھے انھوں نے بھی رسول اسلامؐ کی گفتگو کا مقصد امامت و ولایت کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا۔

نوٹ: رہی یہ بات کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف استعمال ہی نہیں ہوا ہے۔ تو یہ غلط ہے متنبی کہتا ہے:

ترفق ايها المولى عليهم   فان الرفق بالجاني عتاب

۱؎ مسند احمد حنبل ج ۴ ص ۲۸۱، صواعق ابن حجر ص ۲۶، تفسیر طبری ج ۳ ص ۴۲۸، سر العالمین غزالی ص ۹، تفسیر فخر رازی ج ۳ ص ۶۳۶، فرائد السمطین حموینی باب ۱۳، البدایہ والنہایہ ابن کثیر شافعی ج ۵ ص ۲۰۹، فصول المہمہ ابن صباغ مالکی ص ۲۵، ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۶۹۔

اس میں مولیٰ کے معنی اولیٰ بالتصرف کے علاوہ کچھ میں آہی نہیں ۔ مترجم ۔

● ● ●

اگر انسان کھلے ذہن کے ساتھ تعصب کی عینک اتار کر رسولؐ کے پورے خطبے پر توجہ کرے اور موجودہ شواہد و قرائن میں دقت نظر سے کام لے تو حضرت علیؑ کے لئے جو لفظ مولیٰ استعمال ہوا ہے اس کے معنی اولیٰ بالتصرف اور ولایت مطلقہ کے کچھ اور سمجھ ہی میں نہ آئیں گے ۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت علیؑ کے لئے غدیر میں رسولؐ اکرم نے لفظ فرمانروا کیوں نہیں استعمال کیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت لفظ امیر کو زیادہ تر مشاغل نظامی اور امور حج کی سرپرستی کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے ۔ اور امور امت کے ادارے کے لئے لفظ ولایت و سرپرستی کا استعمال فرماتے تھے اور اپنے لئے مسلمانوں کے ولی کا لفظ استعمال کرتے تھے ـــــ اور چونکہ حضرت علیؑ کو امور امت اور لوگوں کے ادارے کے لئے اپنا قائم مقام نامزد کر رہے تھے اس لئے جیسے اپنے لئے ولی کا لفظ استعمال کرتے تھے حضرت علیؑ کے لئے بھی اسی لفظ کو استعمال فرمایا ـــــ اور فرمانروا کی لفظ نہ تو قرآن نے اپنے رسولؐ کے لئے استعمال کی ہے اور نہ رسولؐ خدا نے کسی حدیث میں اپنے لئے استعمال فرمایا ہے ۔ اس لئے حضرت علیؑ کے لئے فرمانروی کی لفظ نہیں استعمال کی ۔ قرآن نے لفظ ولی و سرپرست کو خدا اور رسولؐ کے ساتھ ان مومنین کے لئے استعمال کیا ہے جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں ۔ ملاحظہ ہو ۔

اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ

الزَّکَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۔ پ ۶ س ۵ مائدہ آیت ۵۵ ۔۔ ۱

۔ اے ایمان والو، تمہارے والی و سرپرست صرف یہی ہیں، خدا اور اسکا رسولؐ اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور بحالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

درحقیقت رسولؐ اسلام، جو مسلمانوں کے سرپرست ہیں، ان کا امت اسلامی سے رابطہ باپ بیٹے کا رابطہ ہے جو امت اسلامی کے مصالح کی حفاظت کرتا ہے ان دونوں کے درمیان حاکم و محکوم والا رابطہ نہیں ہے۔

اسی طرح رسولؐ کی طرف سے حضرت علیؑ کے لئے خلیفہ و جانشین کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جانشین بنانے والے کے جانے کے بعد جانشین کی پیروی و اطاعت واجب و لازم ہوتی ہے لیکن رسولؐ اکرم کا نظریہ یہ تھا کہ میری زندگی میں بھی علیؑ کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے اس لئے حضرت علیؑ کو سرپرست کے لفظ سے یاد فرمایا کہ جس میں حیات رسولؐ اور ممات رسولؐ کے بعد بھی جانشینی مضمر ہے اور حدیث غدیر کی بنا پر حضرت علیؑ نائب رسولؐ ہیں اور رسولؐ کی طرح مسلمانوں کے سرپرست بھی ہیں۔

• ترمذی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا: علیؑ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ علیؑ کے علاوہ کسی کو حق نہیں ہے کہ میری طرف سے کوئی کام کرے ۔ ۲

---

۱ سنی و شیعہ مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

۲ سنن ترمذی ج ۵ ص ۳۰۰، سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۴۴، مسند احمد حنبل ج ۴ ص ۱۶۴ ــ ۱۶۵

حاکم نے مستدرک میں رسول خدا سے نقل کیا ہے کہ رسولؐ نے فرمایا :

جس نے میری پیروی کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی، اور جس نے علیؑ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت میری اطاعت کی اور جس نے علیؑ کے حکم سے سرتابی کی اس نے میری نافرمانی کی۔ [1]

بنابریں جب رسولؐ خدا نے مسلمانوں سے فرمایا : میری طرح علیؑ تمام مسلمانوں کے سرپرست ہیں اور ان کی پیروی میری پیروی ہے تو درحقیقت عمومی رہبری و ذمہ داری کو حضرت علیؑ کے لئے خود اپنی جگہ پر معین و ثابت کر کے مسلمانوں کو اطلاع دی ہے اور لوگوں کو علیؑ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔

ایک شیعہ دانشمند تحریر کرتا ہے : میں بڑے خلوص کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ اگر پیغمبر اسلام نے غدیر کے دن لوگوں کے مجمع میں اس طرح فرمایا ہوتا : جس کا میں مولیٰ ہوں ابوبکر اس کے مولیٰ ہیں خداوندا جو ابوبکر کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو ابوبکر کو دشمن رکھے تو بھی اس کو دشمن رکھ۔ تو میں بغیر کسی شک و تردید کے یقین کر لیتا کہ آنحضرت نے ابوبکر کو اپنا خلیفہ معین کیا ہے۔ اور نہ میں یہ تصور کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس سلسلہ میں کسی قسم کا شک ہوتا، بلکہ سب ہی یقین کر لیتے، اگر رسولؐ فرما دیتے ابوبکر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سزاوار ہیں۔ اور قرآن گمراہی سے بچانے والا ہے۔ تو ابوبکر کے بارے میں کسی چون و چرا کی گنجائش ہی باقی نہ تھی۔

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۲۱

میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ حضرات کو اس بات کی طرف متوجہ کروں کہ پیغمبرؐ نے غدیر کے دن جو حدیث (من کنت مولاہ الخ) فرمائی تھی مسلمانوں کو اس حدیث سے علیؑ کی جانشینی کو ثابت کرنے میں جو تردد ہے وہ تعصب یا دشمنی کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہے جس کا عقیدہ یہ ہے کہ رسولؐ نے کسی کو اپنا جانشین نہیں بنایا اس عقیدہ پر یہ لوگ بچپنے سے جوان ہوئے ہیں اس لئے ان کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ علیؑ کی جانشینی اور اس عقیدہ میں جمع نہیں کیا جا سکتا اس لئے یہ لوگ حدیث غدیر کی دلالت میں آئیں بائیں کرتے ہیں۔ [1]

البتہ اس احتمال کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرتؐ کے انتقال کے بعد خلیفہ کے انتخاب میں بعض اصحاب رسولؐ نے جان بوجھ کر دستور رسولؐ کی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ اپنے حساب میں اشتباہ کر گئے اور انکو یہ خیال ہوا کہ امت کی رہبری کا مسئلہ بنیادی مسئلہ ہے۔ لہذا ان کو اختیار ہے کہ پیغمبرؐ کے منتخب کئے ہوئے شخص کو چھوڑ کر امت اسلامی کے عمومی مصالح کے ادارہ کے لئے کسی دوسرے شخص کو منتخب کر لیں۔

اس قسم کے اصحاب کا خیال یہ تھا کہ پیغمبر اسلام نے حضرت علیؑ علیہ السلام کا جو انتخاب کیا ہے وہ بھی اجتماعی مسائل کا ایک جزو ہے۔ اور اجتماعی مسائل کے سلسلہ میں آنحضرتؐ اکثر اوقات اپنے اصحاب سے مشورہ کر لیا کرتے تھے اس لئے یہ مسئلہ بھی مشورہ سے طے ہو سکتا ہے اور یہ لوگ پیغمبرؐ کے مقصد کے تمام

---

[1] کتاب امیرالمومنین ع۔

پہلوؤں سے واقف بھی نہیں تھے اور نہ ہی یہ لوگ انتخاب کے عواقب
کو سوچ سکتے تھے۔ اس لئے اس اشتباہ میں مبتلا ہو گئے ۔

عدم استدلال علی علیہ السلام از حدیث غدیر

کچھ بھولے بھالے لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ رسولؐ خدا کے مرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے سقیفہ میں اور انصار و مہاجرین سے یہ استدلال کیوں نہیں کیا کہ مجھے رسولؐ خدا اپنا جانشین بنا گئے ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ رسولؐ کی جانشینی کے بارے میں مجھ سے معارضہ کرے اور خلافت کا دعویدار بن جائے۔ اگر حضرت علیؑ یہ استدلال کرتے تو ہزاروں ہزار لوگ جو غدیر کے چشم دید گواہ تھے کیا وہ انکار کر دیتے یا اس کو بھلا دیتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ مختلف مناسب مواقع پر اپنی حقانیت کے لئے حضرت علیؑ نے غدیر سے استدلال کیا ہے اور جریان سقیفہ پر اعتراض کیا ہے۔ اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ بھی کیا ہے۔ چنانچہ مورخین کا بیان ہے: جب فاطمہؑ بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ حضرت علیؑ کے ساتھ جاکر انصار سے مدد کی درخواست کرتی تھیں۔ تو انصار جواب دیتے تھے: اے ہمارے نبیؐ کی دختر اب تو ہم نے ابوبکر کی بیعت کر لی ہے اگر علیؑ اس سے پہلے ہمارے پاس آتے تو ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہ کرتے۔ حضرت علیؑ اس کا جواب دیتے تھے: کیا یہ مناسب تھا کہ پیغمبرؐ کے کفن و دفن کو چھوڑ کر میں خلافت کے لئے بھاگا پھرتا۔[۱]

---

۱ الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ ج ۱ ص ۱۲ - ۱۳، شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۵

شوریٰ میں جب عبد الرحمٰن بن عوف نے عثمان کی خلافت کیلئے اپنا میلان ظاہر کیا تو حضرت علیؑ نے فرمایا: میں ایسی حقیقت تمہارے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ میں تم سب لوگوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ میرے علاوہ کوئی ایسا ہے جس کے بارے میں رسولِ خدا نے فرمایا ہو: جس کا میں مولیٰ ہوں اس کے علی مولیٰ ہیں، خداوندا جو علی کو دوست رکھے تو بھی اس کو دوست رکھ۔ اور جو علی سے دشمنی رکھے تو بھی اس کو دشمن رکھ۔ حاضرین اس بات کو غائب لوگوں تک پہونچادیں! اس پر تمام لوگوں نے کہا اے علیؑ یہ بات تمہارے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ [1]

صحابہ کے تیس آدمیوں کی مسجدِ رحبہ میں غدیر کے سلسلے میں گواہی تاریخی مسلمہ ہے، مورخین کا بیان ہے: ایک دن رحبہ کے جامع مسجد میں عظیم الشان اجتماع کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے حضرت علیؑ نے فرمایا:

مسلمانو! میں تم لوگوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تم میں سے جو لوگ غدیر خم میں موجود رہے ہوں اور آنحضرت سے میری جانشینی کی خبر اپنے کانوں سے سنی ہو اور لوگوں نے جو میری اس کے بعد بیعت کی تھی اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو وہ کھڑے ہو جائیں اور اس کی گواہی دیں:

حضرتؑ کے قسم دلانے پر مجمع سے تیس آدمیوں نے اٹھ کر بلند آواز سے واقعۂ غدیر کی گواہی دی [*] ایک دوسری روایت میں ہے کہ بہت سے لوگوں نے اٹھ کر گواہی دی۔ [2]

---

[1] مناقب خوارزمی حنفی ص ۲۱۷ [*] جس میں ۱۲ آدمی بدری تھے

[2] ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۶۲، تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۱۱، مسند احمد حنبل ص ۱۱۸، ۱۱۹

[3] مسند احمد حنبل ج ۴ ص ۳۷۰ تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۱۳

مسجد رحبہ میں لوگوں کا اجتماع اور واقعۂ غدیر کی گواہی سن ۳۵ ہجری میں حضرت علیؑ کے دور خلافت میں واقع ہوئی اور واقعہ غدیر سنہ ۱۰ ھ میں واقع ہوا تھا اس طرح جامع رحبہ اور واقعہ غدیر کے درمیان ۲۵ سال کا فاصلہ تھا۔ [1]

ظاہری بات ہے کہ چوتھائی صدی کا فاصلہ بہت ہوتا ہے اس مدت میں بہت سے بوڑھے صحابی مر چکے تھے خلفاء کے زمانہ میں جو جنگیں ہوئی ہیں ان میں بہت سے صحابی شہید ہو چکے تھے، بہت سے صحابی ایسے تھے جو ادھر ادھر منتشر تھے سب کوفہ کے اندر موجود نہ تھے اس لیے اس تاریخی گواہی کی اہمیت واقعہ غدیر کے سلسلہ میں بہت واضح و روشن ہے۔

احمد بن حنبل تحریر کرتے ہیں: اس کے باوجود بھی تین آدمیوں نے گواہی نہیں دی حالانکہ یہ تینوں غدیر میں موجود تھے حضرت علیؑ نے ان تینوں پر نفرین کی اور یہ تینوں گرفتار بلا ہوئے۔ [2]

ابو طفیل کا بیان ہے:

میں جب رحبہ سے نکلا تو میرے دل میں یہ احساس تھا کہ آخر کیا بات ہے کہ امت کی اکثریت نے اس حدیث پر عمل کیوں نہیں کیا؟ اس لیے میں نے زید بن ارقم سے ملاقات کر کے کہا: میں نے حضرت علیؑ کو ایسا ایسا کہتے ہوئے سنا ہے۔ اسی پر زید نے کہا: یہ حقیقت قابل انکار نہیں ہے اس کو تو میں نے بھی پیغمبرؐ سے سنا ہے۔ [3]

---

۱ المراجعات ص ۱۶۰

۲ مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۱۱۹، معارف ابن قتیبہ ص ۱۹۴

۳ سنن ابن ماجہ ج ۳ ص ۲

حضرت علیؑ کا حدیث غدیر سے استدلال صرف انھیں مواقع کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ حضرت علیؑ مسلسل حدیث غدیر سے جنگ جمل جنگ صفین اور کوفہ میں استدلال فرماتے رہے ہیں۔ خود مسجد پیغمبرؐ میں دو سو سربرآوردہ مہاجرین وانصار کے درمیان کئی مرتبہ تکرار فرمایا ہے۔ [1]

اس کے علاوہ کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ سقیفہ کی کارروائی کے بعد حضرت علیؑ نے شدید ردّعمل کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ صبر و شکیبائی سے کام لیا جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں: فَصَبَرْتُ وَفِي الْعَيْنِ قَذًى وَفِي الْحَلْقِ شَجًى [2]

مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شرف الدین کا وہ جواب جو شیخ سلیم البشری کے خط کے جواب میں تحریر کیا ہے یہاں پر نقل کر دیا جائے:

"تمام لوگ جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ اور ان کے چاہنے والے بنی ہاشم ہوں یا غیر بنی ہاشم ابوبکر کی بیعت کے وقت سقیفہ میں موجود ہی نہ تھے نہ ہاں ان حضرات نے قدم بھی نہیں رکھا یہ حضرات تو رسولؐ اسلام کی تجہیز و تکفین میں مشغول تھے جو ایک واجب امر تھا اس کے علاوہ ان کے ذہنوں میں کوئی دوسری بات تھی ہی نہیں۔ پیغمبرؐ کو ابھی دفن بھی نہیں کیا گیا تھا کہ اہل سقیفہ نے اپنا مقصد پورا کر لیا۔ بیعت ابوبکر کر لی، اور ابوبکر سے محکم عہد و پیمان باندھ لیا اور مخصوص دور اندیشی کی بنا پر اس بات پر متفق ہو گئے کہ حکومت کو کمزور کرنے کے لئے

---

[1] فرائد السمطین حموینی باب ۵۸۔ [2] نہج البلاغہ خطبہ شقشقیہ

جو بھی اقدام کیا جائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

پس حضرت علیؑ سقیفہ میں تھے کہاں جو لوگوں کے سامنے استدلال کرتے؟ اور بیعت کے بعد لوگوں نے کب حضرت علیؑ کو استدلال کرنے کا موقع دیا؟ ایک طرف زبیر کی دسیاست بازی سے اور دوسری طرف سختی ظلم و جبر سے کام لیا گیا۔ خود ہمارے زمانے میں کیا چند آدمی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اقدام کر سکتے ہیں؟ اور حکومت کو شکست دے سکتے ہیں؟ اور اگر کوئی ایسا ارادہ کرے تو کیا افراد حکومت اس کو آزاد چھوڑ دیں گے؟ افسوس... افسوس... ! ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر آپ گذشتہ زمانہ کا قیاس اپنے زمانہ پر کیجئے۔ لوگ تو وہی لوگ ہیں۔ زمانہ بھی وہی زمانہ ہے اس کے علاوہ اگر حضرت علیؑ کچھ کرتے تو اس کا نتیجہ فتنہ و فساد اور ان کے حق کی بربادی کے علاوہ کچھ بھی نہ ہوتا جبکہ حضرت علیؑ کی نظر میں اساس اسلام و کلمۂ توحید کی حفاظت ہی سب سے اہم مقصد تھا۔ حضرت علیؑ اس وقت بہت بڑی مصیبت میں گرفتار تھے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی مثل تھی۔ وہ عظیم بوجھ کی سنگینی کا شدت سے احساس کر رہے تھے۔ ایک طرف تو نص و وصیت کی بنا پر اسلام کی خلافت آپ سے تخت نشینی کی فریاد کر رہی تھی۔ اور ایسے جگر خراش نالوں سے فریاد کر رہی تھی کہ پتھر کا دل بھی پگھل جائے دوسری طرف فتنے، سرکشی، حالات کی ناسازگاری آپ کو متوجہ کر رہی تھی۔ کہ تخت خلافت کے حصول کی کوشش نہ کیجئے گا ورنہ جزیرۃ العرب۔ درہم برہم ہو جائے گا لوگ الٹے پاؤں پلٹ جائیں گے، اسلام پھلنے پھولنے سے پہلے باد خزاں کی نذر ہو جائے گا مدینہ کے منافقین کا مستقل

تھا پیغمبرؐ کی وفات کے بعد یہ لوگ پھر طاقت پکڑ گئے تھے اس وقت مسلمانوں کی حالت بھیڑوں کے اس گلّہ کے مانند تھی جو سردیوں کی تاریک راتوں میں سیلاب کا شکار ہو جائے کہ اگر اسی جگہ رہتا ہے تو سیلاب بہالے جائے گا وہاں سے بھاگتا ہے تو چاروں طرف بھیڑئیے خونخوار درندے اس کو پھاڑ کھائیں گے۔

مسیلمہ کذاب، طلحہ بن خویلد، سجاح بنت حارث اور ان کے حواری موالی اسلام کے فنا کرنے، اور مسلمانوں کو پراگندہ کرنے کے چکر میں الگ تاک لگائے بیٹھے تھے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایران و روم کی دو عظیم سلطنتیں اور دیگر چھوٹی موٹی حکومتیں اسلام کے تباہ کر دینے کی فکر میں تھیں۔ بہت سے دوسرے لوگ جو حضرت محمدؐ اور ان کے اصحاب سے کینہ رکھتے تھے وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے ہر وقت اور ہر طریقہ سے اسلام کا تیا پانچہ کر ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے رسولؐ اسلام کے مرنے کے بعد فضا اچھی خاصی ہموار ہو چکی ہے۔

ان حالات میں حضرت علی علیہ السلام ایک دوراہے پر کھڑے تھے ظاہر سی بات ہے کہ حضرت علیؑ جیسا شخص اپنے حق خلافت کو اسلام و مسلمانوں کے لئے حتماً فدا کر دے گا۔ لیکن عین اس حالت میں کہ جب حضرت علیؑ اپنے حق کی قربانی دے رہے تھے یہ بھی چاہتے تھے کہ جن لوگوں نے آپ کے حق پر ڈاکہ ڈالا ان کو یہ بھی بتا دیں کہ خلافت صرف میرا حق ہے مگر اس احتجاج کو اس طرح پیش کرنا چاہتے تھے جس سے مسلمانوں کا اتحاد پارہ نہ

ہو جائے۔ اور کوئی فتنہ نہ کھڑا ہونے پائے، نہ دشمن اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکے اس لئے آپ خانہ نشین ہو گئے کسی کی بیعت نہیں کی۔ لیکن صاحبانِ اقتدار نے مجبور کر کے حضرتؑ کو ان کے گھر سے نکالا اور مسجد میں لائے اور اس سلسلہ میں بھی حضرت نے ان کو خونریزی کا موقع نہیں دیا۔ اب اگر حضرت علیؑ خانہ نشین نہ ہو جاتے اور خود ہی جا کر بیعت کر لیتے تو ان کی خلافت پر کوئی دلیل نہ رہتی اور نہ ان کے شیعوں کے پاس کوئی برہان ہوتا!

لیکن حضرت علیؑ نے یہ رویہ اختیار کر کے دو اہم کام انجام دیدئے! ایک تو اسلام کی حفاظت و نگہبانی کر لی۔ دوسرے اسلام کے اندر خلافتِ حقہ کی شرعی صورت کو بھی بچا لیا، اس کو برباد نہیں ہونے دیا۔ اور چونکہ حضرت علیؑ نے محسوس کر لیا تھا کہ اسلام کی بقا اس وقت جنگ نہ کرنے اور خلفاء سے مصالحت کرنے پر موقوف ہے اس لئے آپ نے ایسا کر ڈالا۔ اور یہ سب صرف اس لئے تھا کہ شریعت بچ جائے۔ دین محفوظ ہو جائے۔

اور جب بھی واجب عقلی و شرعی کے مطابق اہم و مہم میں تعارض پیدا ہو جائے تو مہم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اہم کو اختیار کر لیتے ہیں آپ نے بھی اپنے منصب و حق سے چشم پوشی کر کے اہم چیز (یعنی اسلام) کو بچا لیا۔

یہی وہ حالات تھے جن کی بنا پر حضرتؑ نے تلوار نہیں اٹھائی اور دھواں دھار تقریروں کے استدلات سے نومولود نظام اسلام میں گڑبڑی نہیں پھیلائی۔ اسی لئے خود حضرت علیؑ، ان کی اولاد، ان کے دانشمند دوست و محب حضرات نے اس دن سے آج تک زمان و مکان کا لحاظ رکھتے

ہوئے حکیمانہ روش کے ساتھ پیغمبر ؐ کی وصیتوں کو یاد کراتے رہے ہیں۔
اور احادیث رسول ؐ نشر کرتے رہے ہیں جیسا کہ محققین و دانشمند حضرات
اس کی گواہی دیں گے۔ [1]

---

[1] ترجمہ المراجعات ص ۳۲۹

حضرت علی علیہ السلام کا قیمتی موقف

صرف غدیر ہی ایک ایسی جگہ نہیں ہے جہاں حضور سرور کائنات نے بھرے مجمع میں اپنے بعد کے لئے حضرت علیؑ کی جانشینی کا اعلان کیا ہو بلکہ بعثت کے تیسرے سال جب حکم الٰہی ہوا کہ تبلیغ اسلام آشکارا طور پر کیجئے تو آپ نے اپنے بعد کے لئے علیؑ کی جانشینی کا اعلان کیا تھا کیونکہ تین سال تک تو رسولؐ اکرم پوشیدہ طور پر تبلیغ اسلام کرتے رہے پھر یہ حکم آیا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ [1] اے رسول تم اپنے قریبی رشتہ داروں کو (عذاب خدا سے) ڈراؤ۔ یعنی علی الاعلان تبلیغ کرو۔

اس وقت رسولؐ نے حضرت علیؑ سے کہا قریش کے چالیس آدمیوں کی دعوت کرو۔ اس دعوت میں پیغمبرؐ اسلام کے چالیس رشتہ دار شریک ہوئے پہلے دن تو ابولہب کی بےہودہ و خشم انگیز گفتگو سے مجلس درہم برہم ہو گئی دوسرے دن بھی اتنے ہی لوگوں کی دعوت دی گئی کھانا کھانے کے بعد جب غذائے فکری و روحانی کی نوبت آئی تو رسولؐ اکرم اٹھ کر کھڑے ہوئے اور حمد و ثنائے الٰہی کے بعد فرمایا:

میں قسم کھا کے کہتا ہوں خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور مجھے اسی کی طرف سے تمہارے اور پوری انسانیت کے لئے رسول بنا کر

---

[1] پارہ ۱۹ سورۂ ۲۶ شعراء آیت ۲۱۴

بھیجا گیا ہے ۔ میں تمہارے لئے خیر دنیا و آخرت لے کے آیا ہوں میرے خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم کو آئین اسلام کی طرف دعوت دوں اور خوشخبری دوں کہ آپ لوگوں میں سے جو میری دعوت کو پہلے قبول کرے گا اور امر رسالت میں میری مدد کرے گا وہی میرا وصی اور بھائی اور میرے مرنے کے بعد میرا جانشین ہوگا ۔

حاضرین بزم پر یہ گفتگو بہت گراں گزری اس تقریر نے ان کے شیشہ غرور کو چکنا چور کر دیا معلوم ہوتا ہے جیسے حق کی آواز اور صدائے رسالت ، صدا بصحرا ثابت ہو گئی کہ ناگاہ علیؑ کی آواز ابھری : اے محمدؐ میں خدائے یکتا اور آپ کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں ۔ اور بت پرستی سے بیزاری اختیار کرتا ہوں ۔

رسولؐ اسلام نے حضرت علیؑ سے کہا تم اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ اس کے بعد دوبارہ وسہ بارہ پھر اسی جملہ کی تکرار فرمائی لیکن آواز حق نے کسی کے دل پر مثبت اثر نہیں چھوڑا ۔ حضرت علیؑ کے علاوہ کسی نے مثبت جواب نہیں دیا ۔ حضرت علیؑ نے دعوت الٰہی کے قبول کرنے اور پیغمبرؐ کی موافقت کرنے میں تاخیر نہیں کی اور ایسے وقت میں اقرار کیا جب آپ جوانی کی سرحدوں سے قریب ہو رہے تھے ۔ تمام لوگوں کی خاموشی کے بادجود حضرت علیؑ نے دوبارہ اٹھ کر آنحضرتؐ کے پیغام پر لبیک کہا ۔ اس وقت پیغمبرؐ نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

علیؑ میرے بھائی ، میرے وصی ، تم میں میرے جانشین ہیں ، ان کی اطاعت و پیروی کرو اور ان کی بات مانو ۔ بقیہ صفحہ آئندہ پر ؛

اس تقریر کا ردعمل مہمانوں پر بہت سخت ہوا اور ان لوگوں نے جلسے کو اس طرح واک آؤٹ کیا جو کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔

تاریخ کا یہ واقعہ اتنا مشہور اور واضح و روشن ہے کہ متدین قسم کے مؤرخین کا تو ذکر ہی کیا ہے تنگ نظر مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ اور اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکے۔

ان خطرناک حساس ترین لمحات میں پیغمبر اپنے کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ اور ایک ایسے یاور طاقتور مددگار کی ضرورت کا شدت سے احساس کر رہے تھے۔ جو آپ کی پشت پناہی کر سکے لہٰذا طاقت بھی ایسی ہو جو اپنے کو پیغمبر میں فنا کر دے اور بہادری، اخلاص، خدا ترسی میں واحد و یگانہ ہو، علم و حکمت سے سرشار ہو، ہوا و ہوس نفسانی سے دور ہو اور انتہا یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد ان کا جانشین بن سکے۔

اتنی بات تو رسولؐ خدا حتمی طور سے جانتے تھے کہ ہمارے رشتہ داروں میں اگر کسی نے ہماری دعوت قبول بھی کر لی اور اسلام کا گرویدہ بھی ہو گیا پھر بھی وہ پیمان ہمکاری باندھنے پر ہرگز تیار نہ ہو گا۔ اور عرب کے تمام گروہوں (بت پرستوں، یہودیوں، عیسائیوں) سے مقابلہ کے لئے کسی قیمت پر

حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۱۱۱، ۱۵۹، الکامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۲، تفسیر طبری ج ۱۹ ص ۷۴، تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۱۹، کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص ۸۹، خصائص نسائی ص ۱۸، سیرت حلبی ج ۱ ص ۳۰۴، شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۲۵۵، جمع الجوامع سیوطی ج ۶ ص ۳۰۸، شرح الشفاء خفاجی ج ۳ ص ۳۷

تیار نہ ہوگا کیونکہ اس قسم کے پیمان بندی کا مطلب مسلسل جنگ و جدال اور تمام عربوں کی طرف سے بے واسطہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ کچھ بھی ہو جائے عرب اپنے عقائد کو بدل کر بت پرستی چھوڑ دینے پر کبھی بھی تیار نہ ہوں گے اور طبعاً اس قسم کی پیشکش کا مطلب ان سے ہمیشہ کی دشمنی مول لینا ہے اور اس کا نتیجہ دائمی جنگ و جدال کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ بلکہ ایسے تصادم کا بھی امکان ہے جس میں پیغمبرؐ کے اموال ان کی اور ان کے متعلقین کی جانیں بھی تلف ہو جائیں۔ اس لئے ان نامساعد حالات میں جو شخص اپنے کو رسولِ خدا کے لئے ڈھال بنانے کا اور جان دینے کے لئے تیار ہوگا وہ ایک غیر معمولی شخص ہوگا۔ اور یہ بات بھی شک سے بالا ہے کہ پیغمبرؐ کے قرابتداروں میں کسی کے اندر یہ خصوصیات نہیں تھے۔ صرف ایک حضرت علیؑ تھے جنھوں نے مدد کا وعدہ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ بعد کے حالات و واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ علیؑ اپنے قول کے سچے، اور اس میں پکے، ایک بے مثل و غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔

اور یہیں سے رسولِ اسلام کے اس دن والے پیغام کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے کیوں ایسے شخص کو اپنا وصی و جانشین بنانے کا اقرار کیا جس نے مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

چونکہ پیغمبرؐ خواہش و ہوا و ہوس سے کچھ نہیں کہتے جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ وحی پروردگار ہوتی ہے۔ [1]

اس قرآنی نکتہ کے پیش نظر اول روز تبلیغ کی امت کی رہبری

---

[1] پ ۲۷ سورۂ النجم آیت ۳-۴

وزعامت کے لئے حضرت علیؑ کو منتخب و معین کر دیا اور اس مسئلہ کو اسی دن ختم کر دیا۔

اس حدیث کی دلالت براہ راست اس بات پر ہوتی ہے کہ جانشینیٔ رسولؐ کا مسئلہ عوام کے ہاتھ میں نہیں ہے کہ جس کو چاہیں اس عظیم ترین مرتبہ پر فائز کر دیں بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف خدا و رسولؐ سے ہے اور یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ جس دن مخصوص رشتہ داروں کی دعوت کی گئی اسی دن اور اسی بزم میں امامت و نبوت دونوں کا اعلان کر دیا گیا۔

ابن ہشام مورخ تحریر کرتا ہے:

تمام مردوں میں علیؑ ابن ابیطالب پہلے مرد تھے جو پیغمبرؐ پر ایمان لائے ان کے ساتھ نماز پڑھی اور رسولؐ جو چیزیں خدا کی طرف سے لیکر آئے تھے اس کی تصدیق کی حالانکہ اس وقت آپ کی عمر صرف دس سال تھی۔ [1]

انس بن مالک کہتے ہیں: دوشنبہ کے دن رسولؐ خدا مبعوث برسالت ہوئے۔ اور سہ شنبہ کو حضرت علیؑ ایمان لائے۔ [2]

ابن ماجہ نے اپنی سنن میں لکھا ہے۔ اور حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا:

میں خدا کا بندہ رسولؐ خدا کا بھائی ہوں۔ صدیق اکبر ہوں میرے علاوہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۵

[2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۱۲

کسی نے اس کا دعویٰ کیا تو وہ جھوٹا ہے میں نے تمام لوگوں سے سات سال پہلے نماز پڑھی ہے۔[1]

رسول اکرم نے متعدد مرتبہ مناسب مواقع پر لوگوں کے گوشزد کر دیا تھا کہ امت کی رہبری کا مسئلہ خدا کے ہاتھ میں ہے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

سرداران قبائل میں سے ایک سردار جس کا نام اخنس تھا اس نے اس شرط کے ساتھ رسول اکرم کی بیعت کرنی چاہی کہ آپ اپنے بعد میری رہبری و قیادت کا وعدہ کریں تو مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔ پیغمبر نے جواب دیا:

رہبری و قیادت کا مسئلہ مجھ سے نہیں، خدا سے متعلق ہے خدا جس کو چاہے گا معین کرے گا۔!

اخنس نے جواب میں کہلا دیا: یہ بات میرے بس سے باہر ہے کہ رنج و مصیبت میں برداشت کروں اور رہبری و پیشوائی دوسرے کے حصہ میں آئے۔[2]

اسی بنا پر یہی بات ہم کہتے ہیں کہ جس کو خدا اور رسول نے منتخب کیا ہو اس پر لوگوں کے منتخب کئے ہوئے شخص کو کیونکر مقدم کر دیں؟ کیا ایسے انسان کو دوسروں کی سرپرستی میں دیا جا سکتا ہے؟ کیا ایسا شخص دوسروں

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۱۲، سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۴۴ حدیث ۱۲۰۔ [2] تاریخ طبری ج ۲ ص ۱۷۲

کی پیروی و اطاعت کرے یہ معقول ہے؟ جبکہ قرآن بیانگ دہل اعلان کر رہا ہے: خدا اور رسولؐ کے مقابلہ میں کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے جو خدا و رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں ہے۔ [1]

لہٰذا خدا جس شخصیت کو بھی امت کی رہبری کے لئے منتخب کر دے وہی خلیفہ ہے چاہے اس کو تخت حکومت تک پہونچنے میں ہزاروں روڑے اٹکائیں۔ جیسے اگر خدا کسی کو نبیؐ یا رسولؐ نامزد کر دے تو وہی شخص نبیؐ و رسولؐ ہوگا۔ چاہے کوئی ایمان لائے یا نہ لائے کوئی اطاعت کرے یا نہ کرے۔

• • •

رسولؐ اسلام ایک اور مقام پر حضرت علیؑ کی ولایت امت اسلامی کے لیے ہے، اس مطلب کو ظاہر فرماتے ہیں اور وہ حدیث منزلت ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

ایک دن پیغمبرؐ اسلام کو اطلاع ملی کہ روم کا لشکر باقاعدہ تیار ہو کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اور ان کو قوی امید ہے کہ بہت جلد یہ لوگ فتحیاب ہو جائیں گے۔ آنحضرتؐ نے پیش بندی کے لئے غور و فکر شروع کر دی اور عمومی تقریر کر کے بہت سے مسلمانوں کو مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا۔

دوسری طرف آنحضرت کو یہ اطلاع ملی کہ مدینہ کے منافقوں نے

---

[1] احزاب آیت ۳۶

اپنی طاقت اکٹھا کرلی ہے۔ اور ان کا ایک خطرناک نقشہ ہے کہ پیغمبرؐ کی روانگی کے بعد مدینہ میں قتل و غارت شروع کردیں۔

پیغمبر اسلام نے مدینہ کی حفاظت کے لئے تو اپنی جگہ پر حضرت علیؑ کو معین کردیا اور حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں صبر سے کام لیں اور مسلمانوں کے جملہ امور کو حل و فصل کرتے رہیں جب منافقوں کو پتہ چلا کہ ان کا راز فاش ہوگیا اور ان کے خیانت کارانہ اقدام کی روک تھام کردی گئی ہے تو انھوں نے ایسی افواہیں پھیلانا شروع کردیں جس سے حضرت علیؑ کی عظمت گھٹ جائے۔ چنانچہ انھوں نے جگہ جگہ یہ کہنا شروع کردیا کہ رسول خدا کے دل میں علیؑ کی محبت نہیں رہ گئی ہے۔ اس مرتبہ علیؑ کو ساتھ آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اتنے عظیم جہاد میں رسول خدا کو حضرت علیؑ کی شرکت پسند نہیں ہے۔

ان پروپگنڈوں اور افواہوں سے حضرت علیؑ بہت آزردہ خاطر اور غمگین ہوگئے اور بیتابانہ حضرت رسولؐ کی خدمت میں پہونچے اور ابھی رسولؐ مدینہ سے نکلے ہی تھے کہ حضرت علیؑ نے پیغمبرؐ سے جاکر تمام ماجرا کہہ سنایا تو پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کے سلسلہ میں ایک یادگار جملہ ارشاد فرمایا:

کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی بس اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ [1]

۱۔ صحیح بخاری ج ۳ ص ۵۸، صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۲۳، سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۲۸ = باقی آئندہ صفحہ پر

رسولخدا کی حدیث کے اس آخری فقرہ کو :

" یہ مناسب نہیں ہے کہ تم کو اپنا خلیفہ و جانشین بنائے بغیر میں یہاں سے چلا جاؤں "، بہت بڑے بڑے محققین اہل سنت نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ [1]

سعد وقاص جو حضرت علیؑ کا شدید ترین مخالف تھا حضرت علیؑ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اسی حدیث کا سہارا لیتا ہے اور کہتا ہے :

جب معاویہ نے مکہ کے لوگوں سے اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت لینی چاہی تو "دار الندوۃ" میں ایک جلسہ قرار دیا لوگوں کے جمع ہونے کے بعد اس نے حضرت علیؑ کی شان میں جسارت شروع کر دی۔ اور منتظر تھا کہ سعد وقاص بھی اسکی تائید میں کچھ نہ کچھ کہے لیکن خلافِ توقع سعد نے معاویہ کی طرف رخ کر کے کہا :

جب بھی علیؑ کی نورانی زندگی کے تین گوشے مجھے یاد آجاتے ہیں تو صمیم قلب سے میں یہ تمنا کرتا ہوں: کاش یہ تینوں باتیں مجھ سے مخصوص ہوتیں :

۱۔ جس دن رسولؐ نے علیؑ سے کہا : مجھ سے تمہاری نسبت وہی ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی

= مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۰۹، مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۳۳۱، صواعق ص ۳۰، کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۲، ینابیع المودت ص ۳۳، خصائص نسائی ص ۷، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۴

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۲، خصائص نسائی ص ۶۳، فرائد السمطین ج ۱ ص ۳۲۷، "تلخیص مستدرک" =

نبی نہیں ہوگا

۲۔ خیبر میں فرمایا : کل میں علم ایسے شخص کو دوں گا جو خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہوگا، اور خدا اور رسول اس کو دوست رکھتے ہونگے وہی فاتح خیبر ہے اور جنگ سے روگردانی کرنے والا نہیں ہے۔

۳۔ مباہلہ کے دن رسولخدا نے علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ کو جمع کرکے درگاہ الٰہی میں عرض فرمایا : پروردگارا یہی میرے اہلبیت ہیں۔ ؎۱

پیغمبرؐ اسلام نے اس حدیث میں حضرت علیؑ کو بمنزلۂ حضرت ہارون قرار دیا ہے یعنی جس طرح جناب ہارون جناب موسیٰ کے بھائی، وزیر انکی امت کے رہبر، موسیٰ کے نائب عام اور دیگر خصوصیات کے حامل تھے وہ سب حضرت علیؑ کو رسول اکرمؐ سے حاصل تھیں صرف نبوت علیؑ کو حاصل نہیں تھی۔

قرآن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پروردگار عالم نے جناب موسیٰ کی ہر درخواست، جو ہارون سے متعلق تھی، قبول فرمائی تھی۔ مثلاً جناب ہارون کو حضرت موسیٰ کا وزیر و مددگار بنایا تھا۔ حضرت موسیٰ کی امت میں جناب ہارون کو انکا خلیفہ و جانشین قرار دیا تھا اور جناب ہارون کو نبی بھی بنایا تھا۔ ؎۲

ذہبی ج ۳ ص ۱۳۲، مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۳۳۱، مناقب خوارزمی ص ۷۲، کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص ۱۱۶، تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۲۰۳، انساب الاشراف بلاذری ج ۲ ص ۱۰۶، تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۳۸، الاصابہ عسقلانی ج ۲ ص ۵۰۹۔ ؎۱ صحیح مسلم ج ۷ ص ۱۲۰، تقریباً یہی مضمون تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۳۳۳، تاریخ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۳۱، کنز العمال ج ۱۳ ص ۱۳۳، سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۵۹، خصائص نسائی ص ۵، ینابیع المودۃ قندوزی =

اور حضرت ہارون تمام بنی اسرائیل کے رہبر تھے۔ لہٰذا حضرت علیؑ بھی تمام مناصب کے حامل ہونگے وہ بھی تمام مسلمانوں کے حاکم ہوں گے۔ رسولؐ کی عدم موجودگی میں فطری طور سے آنحضرتؐ کے نائب ہونگے اور یہ نیابت نیابتِ عامہ ہی کا ایک دور شمار ہوگی۔ جس طرح جب موسیٰ کوہ طور پر گئے تھے تو جناب ہارون کی نیابت اسی نیابت عمومی کا ایک حصہ تھی۔ وقتی نیابت نہیں تھی۔ لہٰذا حدیث منزلت کی دلالت بھی اسی بات پر ہوتی ہے کہ نبوت کے علاوہ تمام مناصب ومقامات حضرت علیؑ کے لئے مخصوص تھے۔

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ حضرت علیؑ کی نیابت صرف انھیں دنوں کے لئے مخصوص ہوتی تھی جن دنوں رسولؐ اکرم مدینہ سے باہر ہوتے تھے اور بس! یعنی حضرت علیؑ کی نیابت کلی نہیں تھی جو آنحضرتؐ کے سانحہ ارتحال کے بعد تک اور حضرت علیؑ کی زندگی تک باقی رہتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ رسولؐ اکرم جب بھی مرکز کو چھوڑ کر جاتے تھے کسی نہ کسی کو بطور جانشین چھوڑ کر تشریف لے جاتے تھے۔ پس اگر حضرت علیؑ کی جناب ہارون سے تشبیہ دینے کا مطلب صرف اتنا ہی تھا کہ ان کی نیابت مدینہ تک ہے اور وہ بھی صرف ان مخصوص دنوں میں جب رسولِ خدا مدینہ سے باہر ہوں تو دوسرے اصحاب کے لئے جو پیغمبرؐ کے منظورِ نظر بھی تھے، یہ جملہ کیوں نہیں فرمایا؟ اور اسی قسم کے کلمات یا اس سے ملتے جلتے کلمات سے ان کی خدمات کا تذکرہ کیوں

= حنفی باب ۶ حاشیہ پر بھی ہے ۱؎ سورہ طٰہٰ آیات ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲

نہیں فرمایا ؟

تاریخ حضرت علیؑ کے علاوہ کسی کے لیے یہ نہیں بتاتی کہ آنحضرتؐ نے ایسی عبارت زبان پر جاری فرمائی ہو واقعہ یہ ہے کہ اس سے جہاں حضرت علیؑ کی فضیلت کا اعلان اور اپنے لئے جانشین بنانے کا اقرار تھا اس کے ساتھ ساتھ بھی چاہتے تھے کہ لوگوں پر ثابت کر دیں کہ صرف علیؑ ہی تنہا نائب رسولؐ ہیں ۔

اگر وقتی نیابت منظور ہوتی تو حدیث کے اندر نبوت کا استثنار نہایت لغو اور غیر مربوط ہو جاتا کیونکہ اس وقت حدیث کا مطلب یہ ہوتا : اے علیؑ جب تک میں واپس نہ آؤں تم میرے خلیفہ ہو لیکن میرے بعد پیغمبر نہیں ہو ۔ اس لئے کہ یہ استثنار تو اس وقت درست ہوگا جب مقامات ہارونی رسولخدا کے بعد تک حضرت علیؑ کیلئے ثابت ہوں ۔

اس کے علاوہ حضرت رسولؐ نے اس جملہ کو صرف مدینہ میں جانشین بناتے وقت ہی نہیں فرمایا بلکہ دوسری جگہوں پر بھی فرمایا ہے ۔ جس کی تاریخ گواہ ہے ۔ انہیں ایک موقع تو وہ ہے کہ ہجرت کے ابتدائی دنوں میں جب رسولخدا مسلمانوں کے دو دو شخصوں میں برادری قائم کر رہے تھے تو حضرت علیؑ بہت ہی غمگین حالت میں رسولؐ کے پاس آئے اور عرض کیا : آپ نے تمام مسلمانوں میں برادری قائم کی اور مجھے کسی کا بھائی نہیں بنایا کیا بات ہے ؟

رسولخدا نے اصحاب کی موجودگی میں فرمایا : اس خدا کی قسم جس نے مجھے نبی برحق بنا کر مبعوث فرمایا : میں تمہارے معاملے میں تاخیر صرف

اس لئے کر رہا تھا کہ تم کو اپنا بھائی قرار دوں (پس) تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے ہارون موسیٰ کیلئے تھے بس اتنے سے فرق کے ساتھ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا تم میرے وارث و بھائی ہو۔[1]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ حضرت علیؑ کا نبی نہ ہونا انکی عدم لیاقت کی بنا پر نہیں تھا بلکہ ختم نبوت کے بعد اب گنجائش ہی نہیں تھی اگر آنحضرت کے بعد نبوت ختم نہ ہوتی تو صد در صد حضرت علیؑ نبی ہوتے رسول اسلام نے مختلف مقامات پر حضرت علیؑ کو اپنا بھائی قرار دیا ہے چنانچہ سیرۃ حلبی میں منقول ہے:

آنحضرتؐ نے اصحاب کے ایک گروہ میں رشتہ اخوت باندھنے کے بعد جیسے ابوبکر و عمر، اسید بن حضیر اور زید بن حارثہ، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ربیع، ابوعبیدہ اور سعد بن معاذ وغیرہ کے درمیان اخوت قائم کر کے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: یہ میرا بھائی ہے پس حضرت علیؑ اور رسولخدا دونوں بھائی تھے۔[2]

ایک مرتبہ ایک ایسے ہی موقع پر جس کا تعلق حضرت علیؑ، جناب جعفر اور زید بن حارثہ سے تھا حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا: لیکن اے علی تم تو میرے ہمراہ ہو اور میرے بھائی ہو۔[3]

---

[1] کنز العمال در حاشیہ مسند ج ۵ ص ۳۱۔

[2] سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۹۰ نیز سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۵۰۵

[3] طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۱۳

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: تم بہشت میں بھی میرے ہمراہ میرے رفیق اور میرے بھائی ہو۔[1]

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ آخر برادری سے رسولؐ کا مقصد کیا ہے؟

رسولؐ اسلام نے ہر قومی، نسلی، قبائلی، امتیاز جو سنت عدالتِ الٰہی کے خلاف تھا اس کو ختم کر کے چھوڑا چنانچہ مدینہ پہونچ کر مسلمانوں کے درمیان صیغۂ اخوت جاری کیا۔ رسولؐ اسلام یہ چاہتے تھے کہ برادری محض ایک نظریہ نہ رہے بلکہ امت مسلمہ کے اندر حسّی طور سے جاری و ساری ہو جائے اسی لئے آپ کے حکم کے مطابق دو، دو شخصوں کو بھائی قرار دیا گیا۔ اپنے بھائی کی اخوت کو اس طرح عملی جامہ پہنایا کہ شاید خونی رشتہ بھی اس منزل تک نہیں پہونچ سکتا۔ اسلامی اخوت کا معیار خدا سے قربت، معارفِ دینِ الٰہی پر ایمان کامل رکھنے پر رکھا گیا ہے۔ روحانی برادری نے نسبی برادری کی جگہ لے لی ہے۔

دو قبیلہ و دو شہر کے رہنے والوں کے درمیان پیوند برادری نے دیگر افراد قبیلہ کے درمیان بھی خلوص و دوستی بڑھا دی اور وسیع پیمانہ پر روحانی و عواطفی تعلقات قائم ہو گئے۔

● ● ●

جہاں تک حضرت رسولؐ و حضرت علیؑ کی برادری کا سوال ہے وہ تو ہجرت سے بھی دس سال پہلے کی ہے یعنی آغاز بعثت میں جب پیغمبر اسلام

---

[1] استیعاب ج ۲ ص ۴۶۰، تاریخ بغدادی ج ۱۲ ص ۲۶۸ فضائل الخمسہ ج ۱ ص ۱۱۳

نے اپنے گھر ہی کے اندر ایک جلسہ بلایا تھا اور اپنے رشتہ داروں کو جمع کر کے ان سے مدد چاہی تھی اسی جلسہ میں — یعنی دعوت ذو العشیرہ ہی میں — اعلان کر دیا تھا۔

اور یقیناً یہ اخوت وہ والی اخوت نہیں ہے جو پیغمبر اسلام نے دو قبیلوں اور دو شہروں کے لوگوں میں کی تھی کیونکہ حضرت علیؑ اور رسول اسلام میں پہلے ہی سے کوئی خلا نہیں تھا جس کو اس اخوت کے ذریعہ پُر کیا جاتا بلکہ یہ دونوں پہلے ہی سے حقیقی چچازاد بھائی تھے اور بہت قریب تھے اور دونوں کے روابط ہر اعتبار سے بہت ہی محکم و مضبوط تھے۔ اس لئے ماننا پڑیگا کہ اس برادری کا مطلب مشابہت فکری و روحی اور جذب باطنی کے علاوہ کچھ نہ تھا کیونکہ صرف حضرت علیؑ ہی کی ایک ایسی ذات تھی جو خصلت و عادت، دانش و بینش، اخلاص، عشق معنوی میں سب سے زیادہ رسولؐ سے مشابہ تھی ان دونوں کی برادری مخصوص معنی و اہمیت کی حامل تھی۔ اور یہ صرف اس دنیا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت میں بھی اسی طرح پائدار و مضبوط ہوگی۔ جیسا کہ حاکم نے مستدرک میں دو صحیح طریقوں سے لکھا ہے کہ رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا: تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ [1]

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر و ابو عبیدہ پیغمبر اسلام کے پاس موجود تھے کہ آنحضرت نے اپنا ہاتھ حضرت علیؑ کے شانہ پر رکھا اور فرمایا:

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۴ اور صحیح ترمذی ج ۵

: اے علیؑ تم پہلے شخص ہو جو اسلام لائے اور میرے اوپر ایمان لائے
اے علیؑ تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی[1]

●

حضرت عمر نے ایک شخص کو دیکھا جو حضرت علیؑ کو برا کہہ رہا تھا حضرت عمر نے اس سے کہا تو منافق ہے۔ کیونکہ میں نے رسولِ خدا سے سنا ہے وہ فرماتے تھے: صرف علیؑ ایسے ہیں جنکی نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی بس اتنا فرق ہے کہ میرے بعد نبی نہیں ہوگا[2]

دلچسپ بات یہ ہے کہ لفظ انما کی دلالت حصر پر ہوا کرتی ہے اسلئے رسولؐ کا مقصد وقتی نیابت و خلافت نہیں ہے کیونکہ وقتی نیابت تو دوسروں کو بھی حاصل ہو چکی ہے عمر کی بات سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے بھی نبوت کے علاوہ تمام جہات معنوی میں حضرت علیؑ کو رسولؐ کے برابر سمجھا تھا کیونکہ توہین کرنے والے سے کہا تو منافق ہے۔ اور نفاق کفر سے بھی بدتر چیز ہے۔

دیکھئے مومن چاہے جتنا بلند ہو اس کو برا کہنے سے کوئی کافر نہیں ہو جاتا اور نہ منافق ہو جاتا ہے۔ خود عمر اور دوسرے صحابہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہا کرتے تھے اور کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ تم کافر ہو گئے ہو یا منافق ہو گئے ہو البتہ رسولؐ کی توہین موجب کفر ہے چونکہ عمر بن خطاب نے

---

[1] کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۵

[2] تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۳۳۱ و ص ۳۳۴، تاریخ خطیب بغدادی ج ۷ ص ۴۵۳

حدیث سے یہ سمجھا کہ حضرت علیؑ رسولؐ کے برابر ہیں اس لئے برا کہنے والے کو کہا تو منافق ہے ۔

•

رسول خدا کی ان مشہور و متواتر حدیثوں میں جنکو اہلسنت نے اپنی مشہور کتابوں میں لکھا ہے ایک حدیث سفینہ بھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کے خاندان میں مسلمانوں کی رہبری و لیاقت کی صلاحیت ہے ابوذر غفاری کہتے ہیں حضرت رسولؐ نے فرمایا :

تمہارے درمیان میرے اہلبیت کی مثال کشتیٔ نوح جیسی ہے جو بھی اس پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جس نے منہ موڑا غرق ہو گیا ۔ ؎۱

رسولؐ نے اپنی اس حدیث میں عترت کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ جو لوگ ان سے دور رہیں گے وہ خود ہی تاریکی و گمراہی میں ڈوب جائیں گے ۔

اہلبیت کو کشتیٔ نوح سے تشبیہ دینے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی دینی ذمہ داریوں کو ان سے اخذ کرے گا اور انکے احکام پر عمل کریگا وہ قیامت کے ہولناک عذاب سے نجات پا جائے گا اور جو لوگ تمرد و سرکشی کریں گے خاندان رسالت کے محور سے دور ہونگے وہ لوگ اس شخص کی طرح ہونگے جس نے طوفان نوح میں خطرہ کا احساس کر کے نجات کے

؎۱ کنز العمال ج ۱ ص ۲۵۰، صواعق ابن حجر ص ۷۵، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۴۳، ینابیع المودۃ ص ۲۵۶، الفصول المہمہ ابن صباغ مالکی ص ۱۰، اسعاف الراغبین ص ۱۱۰، نور الابصار ص ۱۱۴

لئے دامن کوہ میں پناہ لینی چاہی تھی بس اتنا فرق ہوگا کہ وہ پانی میں ڈوب گیا اور یہ دوزخ میں عذاب الٰہی کے اندر غوطہ لگائے گا۔

اہلبیت کیلئے آنحضرتؐ نے ایک جگہ اسطرح فرمایا ہے:

: میرے اہلبیت کی مثال ستاروں کی سی ہے کہ خشکی اور دریا میں چلنے والے انسان انھیں ستاروں کے وسیلہ سے راستہ طے کرتے ہیں اور ضلالت و گمراہی سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ ۱؎

میرے اہلبیت کے دامن میں پناہ لینے والے گمراہی، نابودی، اور اختلاف سے محفوظ رہتے ہیں اور "جو گروہ ان سے برسرپیکار ہوتا ہے وہ تشتت و پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے اور شیطان کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے"۔ ۲؎

اسی طرح اس حدیث سے اہلبیتؑ کی عصمت و طہارت کا بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ جو بھی شخص گنہگار، خطاکار ہوگا اور رسولِ اسلام کے معین کئے ہوئے راستہ سے الگ ہوگا وہ دوسروں کو کسی بھی طرح گمراہی و بدبختی سے نجات نہیں دلا سکتا ــــ اسی لئے ہم کہتے ہیں اگر شیعہ بھی اہلبیت رسولؐ کی پیروی نہ کریں اور انکے بتائے ہوئے راستہ سے الگ ہوجائیں تو ان پر بھی اعتراض کیجئے انکی غلطیوں کی نشاندہی کیجئے۔۔۔!

میرے محترم پڑھنے والو۔۔۔!

۱؎ صواعق محرقہ ص۱۸۵، مستدرک حاکم ج ۳ ص۱۴۹ ۔ ۲؎ مستدرک حاکم ج ۳ ص۱۴۹، صواعق محرقہ ص۲۳۴

حضرت ابوبکر نے جو حضرت عمر کو اپنا جانشین بنایا ہے انھوں نے آخر کون سا جملہ استعمال کیا ہے؟ کیا اس کے علاوہ کچھ اور کہا ہے کہ مسلمانوں کی خلافت و زعامت جو میرے پاس تھی وہ عمر کے لئے ہے؟ پس اسی طرح مختلف طرح کی عبارتیں، گفتگو، یا حدیثیں جو رسولؐ خدا نے حضرت علیؑ کیلئے بیان کی ہیں کیا اس سے علیؑ کی قیادت و رہبری ثابت نہیں ہوتی؟ حالانکہ پیغمبرؐ اسلام کی حدیث خلیفۂ اول کی گفتگو سے کہیں زیادہ صاف اور واضح ہے ــــ اچھا یہ تمام روایات، تعبیرات، رسولؐ کے جملے کیا حضرت علیؑ کی دینی قیادت بھی ثابت نہیں کرتے؟ صاحبان انصاف سے قضاوت کا طالب ہوں ــــ!

●

جب تمام بزرگان و دانشمندان اہلسنت چاروں مذہب کے پیشواؤں کے فتاوی کو قبول کرنا ضروری جانتے ہیں حالانکہ رسولؐ خدا سے کوئی ایسی حدیث مروی نہیں ہے کہ فقہی مسئلوں میں انھیں چاروں کی طرف رجوع کیا کرو۔ تو پھر میری نظر میں کوئی ایسی معقول وجہ نہیں ہے کہ علمائے اہلسنت اہلبیتؑ کی تعلیمات سے انحراف کریں جبکہ آنحضرتؐ کی تصریح موجود ہے: قرآن و عترت ہرگز جدا نہیں ہوں گے جب تک قیامت میں حوض کوثر پر میرے پاس نہ آجائیں۔ [1]

سب سے زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ مذاہب اربعہ

---

[1] مسند احمد حنبل ج ۵ ص ۱۸۱

کے بعض بانی حضرات نے اہلبیت سے استفادہ کیا ہے اور ان سے کسب فیض کیا ہے ایک بزرگ عالم اہلسنت فرماتے ہیں :

"مروجہ اور مذہبی اختلاف کے باوجود تمام دانشمندان اسلامی امام جعفر صادقؑ کی فضیلت و دانش پر عجیب اجماع و اتفاق رکھتے ہیں کیونکہ حضرات اہلسنت کے وہ آئمہ جو امام جعفر صادقؑ کے ہمزمان تھے انھوں نے ان سے علوم و معارف سیکھے ہیں اور قبول کئے ہیں۔ مالک نے اور دیگر معاصرین نے امام صادقؑ سے اخذ معارف کیا ہے۔ مثلاً سفیان بن عُیَینہ، سفیان ثوری ان کے علاوہ اور بہت سے افراد۔ ابوحنیفہ جو امام صادقؑ کے ہم عمر تھے انھوں نے معارف انھیں حضرتؑ سے سیکھا ہے اور حضرت صادقؑ کو دانشمند ترین عالم سمجھتے تھے۔"[1]

ابن حجر نے اور لوگوں کے حوالہ سے کہا ہے کہ امام شافعی فرماتے تھے : "اہلبیتؑ پیغمبر میری نجات کیلئے وسیلہ ہیں اور یہی حضرات رسولخدا کے پاس بھی میرے لئے وسیلہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ انھیں حضرات کے واسطے سے قیامت میں میرا نامۂ اعمال میرے داہنے ہاتھ میں دیا جائے۔"[2]

نیز امام شافعی ہی کا قول ہے :

"اے اہلبیت رسولخدا کی طرف سے تمہاری محبت

---

[1] الامام الصادقؑ شیخ محمد ابو زہرہ ص۶۶

[2] صواعق محرقہ ص۱۷۸، فضائل الخمسہ فیروز آبادی ج ۲ ص۱۰۱

قرآن میں واجب قرار دی گئی ہے اور آپ کے عظیم المرتبت ہونے کیلئے یہی بات کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے اسکی نماز نماز نہیں ہے۔ [1]

مجتہدین کے نظریات کے برخلاف اہلبیت کی تعلیمات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ اہلبیت احکام شرعیہ میں اجتہاد نہیں کرتے بلکہ انکی تعلیمات وہی پیغمبر اسلام کی تعلیمات ہیں جن سے ائمہ معصومین بطور یقین آگاہ ہیں۔ مذاہب اربعہ کے ائمہ اجتہاد کرتے تھے۔ ان اسباب کی بنا پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل بیت سے روگردانی کی کیا توجیہ کی جائے؟

---

[1] نور الابصار شبلنجی ص ۱۰۱

قرآن و اہلبیتؑ کا رابطہ

حدیث ثقلین ان مستند ترین و معتبر ترین حدیثوں میں ہے جس کو علمائے اسلام نے پیغمبر اسلامؐ سے نقل کر کے اہلسنت کے اصلی منابع میں ثبت و درج کیا ہے اور اس کے لئے کہا جا سکتا ہے تواتر و اعتبار کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہے۔ حدیث اس طرح ہے:

میں دو نفیس و گراں بہا امانت تمہارے درمیان میں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک خدا کی کتاب دوسرے میرے اہلبیتؑ میری یہ دونوں یادگاریں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگی اور اگر ان دونوں سے تم لوگ وابستہ رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے۔[1] انتہیٰ۔

بلکہ بہت سے علماء اہلسنت نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے حدیث کے آخر میں یہ جملہ بھی فرمایا ہے:

ہمیشہ سے قرآن کے ساتھ علیؑ ہیں اور قرآن بھی علیؑ کے ساتھ

---

[1] صحیح مسلم ج ۷ ص۱۲۲، صحیح ترمذی ج ۲ ص۳۰۸، مستدرک حاکم ج ۳ ص۱۰۹، مسند احمد حنبل ج ۳ ص۱۴، ص۱۷، فصول المہمہ ص۲۲، کفایۃ الطالب ص۱۳۰، ینابیع المودۃ باب ۴ ص۱۸ و ۱۹، تاریخ یعقوبی ج ۲ ص۹۲، تفسیر رازی ج ۳ ص۱۸، تفسیر نیشاپوری ج ۱ ص۳۴۹۔

رہا ہے یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے۔ [1]

اسلام کے محدث و دانشمند حضرات تیس صحابہ کے ذریعہ سے اس حدیث کے نقل کی نسبت رسول اسلام سے دیتے ہیں۔ [2]

شیعہ و سنی مورخین و محدثین کی تحریر کے مطابق مختلف اوقات میں بلکہ عمر کے آخری حصہ میں بھی آنحضرت نے لوگوں کی توجہ ان دو اسلامی اہم مرجع — یعنی قرآن و عترت — کی طرف مبذول کرائی ہے۔ اور مسلمانوں کے آئندہ پروگرام کو ایک بہت ہی پرمعنی جملہ کے اندر بیان کر دیا ہے اسی لئے حسب اختلاف مواقع الفاظ حدیث میں اجمال و تفصیل کے اعتبار سے تبدیلی ملتی ہے لیکن معنی کے اعتبار سے ان سب کا مفہوم و مقصود ایک ہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و عترت میں جدائی ناممکن سی بات ہے۔

اہلسنت کے بہت بڑے عالم ابن حجر تحریر کرتے ہیں:

: گیارہویں شبہہ میں اس حدیث کے مبسوط طریقے گزر چکے ہیں انہیں سے بعض طریقوں میں اس طرح آیا ہے کہ رسول خدا نے اس حدیث کو حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ میں فرمایا ہے اور بعض دیگر سندوں میں ہے کہ مدینہ میں بیماری کی حالت میں جب آپ کا حجرہ اصحاب سے چھلک رہا تھا اس وقت فرمایا ہے۔ بعض اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ غدیر خم میں یہ

---

[1] ینابیع المودۃ ص۳۲ و ۳۷۰، صواعق محرقہ باب ۹ ص۷۵، کشف الغمہ ص۴۳، انتہی

[2] سیرۃ حلبی ج ۳ ص ۳۰۸

حدیث ارشاد فرمائی تھی اور بعض دیگر طریقوں میں ہے کہ طائف سے پلٹتے وقت فرمایا تھا۔

اتنا لکھنے کے بعد ابن حجر تحریر کرتے ہیں:

"اس سے کوئی منافات لازم نہیں آتی کیونکہ ہوسکتا ہے ان تمام مواقع پر اور اس کے علاوہ دیگر مواقع پر بھی تکرار فرمایا ہو اور یہ تکرار صرف قرآن و عترت کی اہمیت کے پیش نظر کی گئی ہو۔" [1]

دوسری روایت میں ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: علیؑ حق کے ساتھ اور حق علیؑ کے ساتھ رہتا ہے۔ اور حق جس طرف بھی ہوتا ہے علیؑ اسی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ [2]

●

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قرآن آسمانی اسلام کے دستورات وقوانین کا مجموعہ ہے اور اسکی تعلیمات نجات انسانی کی ذمہ دار ہیں ——— لیکن قرآن کی تاویل و تفسیر کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے بلکہ یہ ایسے لوگوں کا کام ہے جو وحی کی زبان سمجھتے ہوں اور انکی علمی وعملی صلاحیت ہر اعتبار سے یقینی ہو ——— اسی لئے شیعہ کہتے ہیں جو لوگ کتاب آسمانی کی تفسیر کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کی نشاندہی پیغمبر اسلام کی طرف سے ہونی چاہیئے

---

[1] صواعق محرقہ فصل اول باب ۱۱، ص ۸۹

[2] الامامۃ والسیاسۃ، ابن قتیبہ، ج ۱ ص ۶۸، فرائد السمطین حموینی باب ۳۷، خطیب بغدادی ج ۱۴ ص ۳۲۱، تفسیر رازی ج ۱ ص ۱۱۱، اسی طرح مسند احمد حنبل اور فصول المہمہ ابن صباغ مالکی میں بھی ہے۔

اور مخلوق کی ارشاد و ہدایت کے لیے بانی اسلام کی طرف سے تائید ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہی لوگ وحی کی زبان کو سمجھتے ہیں اور آیات الٰہی کی تفسیر و توجیہ سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، اسی لئے قرآن کے ساتھ عترت کو رکھا گیا ہے تاکہ کتاب آسمانی کے مقاصد و مقررات کی تفسیر کریں۔

اگر اس حدیث کے مفہوم کو دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آجاتا ہے کہ قرآن و عترت میں جدائی اور ایک کے قول پر عمل کرنا دوسرے کے قول کو چھوڑ دینا قرآن کے رموز و حقائق سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور ایسا کرنا گمراہی کو دعوت دینا ہے ذرا سوچیے اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ اگر قرآن اور میری عترت سے تمسک کرو گے تو گمراہ نہیں ہو گے؟ قرآن جو قانون الٰہی ہے کون شخص ہے جو اس کے متشابہات کو محکمات میں تبدیل کر سکتا ہے؟

پیغمبر اسلام کا دو چیزوں کو بطور امانت چھوڑ کے جانے کا مطلب اسی ہی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں اور دونوں کا ایک ہی مقصد ہے۔ ایک آسمانی قانون اور خدا کا کلام ہے اور دوسرا اس کا مفسر و حامی ہے اسی لئے عترت سے جدا ہونا اور عترت سے منحرف ہونا ہلاکت کا سبب ہے۔

مسلمانوں کا دور انحطاط اسی وقت سے شروع ہوا جب سے انھوں نے قرآن و عترت میں جدائی ڈال دی اور دونوں سے تمسک کو چھوڑ دیا صرف "ہمارے لئے قرآن کافی ہے" کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کے افکار اور بینش دینی پر تسلط حاصل کر لیا اور اشعری، معتزلی جیسے مکاتب

فکر پیدا ہو گئے گویا یہ لوگ کتاب خدا کی اہمیت کو رسولِ خدا سے زیادہ جانتے تھے۔ اور اسکی اہمیت کو زیادہ سمجھتے تھے۔

قرآن فہمی اور اس کے حقائق کی توضیح ان لوگوں کے بیان پر موقوف ہے جو علم وحی رکھتے ہوں یا کم از کم انکی دانش مخصوص تعلیمات کے ذریعہ حاصل ہوئی ہو اور یہ بات صرف آئمہ معصومین کے اندر ہی پائی جاتی ہے۔

ایک دانشمند سنی اپنی کتاب میں پیغمبر اسلام کے واسطے سے ایک جملہ نقل کرتا ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا:

ان دونوں امانتوں ——— قرآن و عترت ——— سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان کی پیروی میں کوتاہی نہ کرنا ورنہ پھر بھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ میری عترت کو جاہل نہ خیال کرنا یہ بدرجہا تم سے داناتر ہیں اور زبان وحی کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ [1]

حضرت علیؑ نے فرمایا:

تم لوگ قرآن سے کئے ہوئے عہد و پیمان سے اسوقت تک وفا نہیں کر سکوگے جب تک پیمان شکن کو پہچان نہ لو۔ قرآن پر ہرگز عمل نہ کر پاؤ گے جبتک ان لوگوں کو پہچان نہ لو جنھوں نے قرآن کو ایک کنارے کر دیا ہے لہٰذا سیدھے راستے، وفا بر عہد، قرآن سے وابستگی کا طریقہ اسکے اہل سے حاصل کرو۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے علم و دانش کو زندہ رکھا ہے، جہل و نادانی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے یہی وہ

---

[1] صواعق محرقہ ابن حجر باب وصیۃ النبی ص ۱۵۳

موجودہ صفحہ خالی ہے

اگلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں

Presented By:

www.zad-e-rah.com

موجودہ صفحہ خالی ہے

اگلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں

Presented By:

www.zad-e-rah.com

موجودہ صفحہ خالی ہے

اگلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں

Presented By:

www.zad-e-rah.com

موجودہ صفحہ خالی ہے

اگلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں

Presented By:

www.zad-e-rah.com

اصحابِ رسولؐ کا نامعقول رویہ

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف سے حضرت علیؑ کی جانشینی اور وصی ہونے کے اعلان کے بعد اور ان کی قیادت کا اعلان غدیر اور دیگر مناسب مواقع پر مکرر کرنے کے باوجود آخر کیا بات ہے کہ رسولؐ کی رحلت کے بعد ہی ان کے اصحاب و انصار نے فرمانِ الٰہی کی مخالفت کی اور علیؑ جیسی شخصیت سے دست بردار ہو گئے؟ ان کی اطاعت سے منکر ہو گئے یہی نہیں بلکہ انکی جگہ پر دوسرے کو بعنوان سرپرست امت اسلامی منتخب کر لیا اور مسلمانوں کے تمام امور ان کے ہاتھوں میں سپرد کر دئے گئے اور تمام مسلمانوں نے ان کے احکام کے سامنے سر ڈال دئے؟

کیا رسولؐ خدا کی تمام حدیثیں مبہم تھیں؟ یا مختلف قسم کی تعبیرات سے حضرت رسولؐ جناب علیؑ ابن ابیطالب کی فضیلت ثابت کرنا چاہتے تھے کیا یہ سب چیزیں رہبری کے لئے کافی نہیں تھیں؟

اس سوال کا جواب نبی اکرمؐ کے زمانہ کے واقعات و حوادث میں اگر بہ نظر دقت ملاحظہ کیا جائے تو بہت واضح طریقہ سے مل جائے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرتؐ کے زمانہ میں ایسے عناصر موجود تھے یعنی خود اصحاب کے اندر موجود تھے کہ آنحضرتؐ کے احکام اگر ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتے تھے تو وہ بھرپور کوشش کرتے تھے کہ پیغمبرؐ اپنے اس ارادے سے باز آجائیں اور ہر طریقہ سے رسولؐ خدا کے ان احکام کو عملی نہیں ہونے دینا چاہتے

تھے اور جب اس میں ناکامیاب ہو جاتے تھے تو خود رسولؐ دوسرا پر اعتراض کرنے لگتے تھے۔

قرآن مجید نے ایسے افراد کو لتاڑا ہے کہ خبردار رسولؐ اسلام کے احکام کی مخالفت نہ کیا کرو چنانچہ ارشاد ہے "جو لوگ رسولؐ اسلام کی مخالفت کرتے ہیں ان کو گرفتار بلا یا دردناک عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔" [1]

●

پیغمبرؐ اسلام نے اپنی پُر برکت زندگی کے آخری دنوں میں روم سے مقابلہ کے لئے لشکر تیار کر کے اس کی قیادت اسامہ بن زید کے سپرد فرمائی بوڑھے اور تجربہ کار لوگوں کی سوجھ بوجھ کی میں اسامہ جیسے جوان آدمی کے سپرد سرداری کر دینا کچھ لوگوں کو بہت ناگوار ہوا اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اصحاب میں تو تو میں میں ہو گئی۔ جو لوگ اس کے شدید مخالف تھے انھوں نے آنحضرتؐ سے کھل کر کہہ دیا کہ اسامہ کو بدل دیا جائے لیکن رسولؐ نے سنی ان سنی کر دی اور لشکر کے کوچ کرنے کا جو آرڈر دیا تھا ابو بکر، عمر، عثمان کو بھی حکم دیا کہ لشکر کے ساتھ تم لوگ بھی جاؤ لیکن ان حضرات نے صرف فوجی قانون ہی کی مخالفت نہیں کی بلکہ حکم رسولؐ کی بھی خلاف ورزی کی اور لشکر سے مدینہ واپس آ گئے، جنگ کرنے نہیں گئے۔ [2]

اصحاب کی مخالفت اور اس کے ساتھ رسولؐ اسلام پر نازیبا تبصروں

---

[1] سورہ نور آیت ۶۳

[2] سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۳۲۸ ؛ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۱۹ ؛ کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۲۰ — ۱۲۱

نے آنحضرت کو بہت آزردہ بنا دیا اور آپ اسی رنج و غم کی حالت میں کسی نہ کسی طرح گھر سے باہر آئے منبر پر جا کر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

لوگو! یہ کیا بات ہے کہ اسامہ کی سرداری کے بارے میں تمہاری جو گفتگو مجھ تک پہونچی ہے۔ اگر آج تم لوگ اسامہ پر اعتراض کر رہے ہو تو کل تم نے اس کے باپ زید بن حارثہ کی سرداری پر بھی اعتراض کیا تھا خدا کی قسم جس طرح زید سرداری کے لائق تھے اسی طرح ان کے بعد ان کا بیٹا بھی سرداری کے لائق ہے۔ [1]

آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد عمر ابوبکر کے پاس آئے اور کہا اسامہ کو سرداری سے برطرف کر دو ابوبکر نے کہا رسولؐ خدا اس کو معین کر کے گئے ہیں اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میں برطرف کر دوں ؟ [2]

عمر کے آخری حصہ میں پیغمبر اسلام کی بڑی کوشش تھی کہ مہاجرین وانصار کے سربر آوردہ لوگوں سے مدینہ خالی ہو جائے اسی لئے آپ نے اسامہ کا لشکر تیار کر کے جہاد کا حکم دیا تھا کہ تم لوگ سرحد شام کی طرف حرکت کرو سربراہان صحابہ کے لئے رسولؐ نے بڑی کوشش کی کہ اسامہ کی زیر سرکردگی مرکز اسلام سے خارج ہو جائیں اور مجاہدوں کی صفوں میں شامل ہو جائیں صرف حضرت علیؑ کو اپنے پاس مدینہ میں رکھا تھا پیغمبرؐ کا یہ اقدام بہت ہی پر معنی تھا مگر صحابہ نے پیغمبرؐ کی ایک نہ سنی اور اپنے کو لشکر سے الگ کر لیا۔

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۴۹ ، سیرت حلبی قضیۂ اسامہ

[2] سیرت حلبی ج ۳ ص ۳۳۶

رسول خدا نے اپنی زندگی میں علیؑ کو کسی کے زیر سرکردگی قرار نہیں دیا۔[1]
بلکہ جس لشکر میں رہے اس کے سردار و سپہ سالار حضرت ہی رہے حالانکہ ابوبکر
و عمر و غیرہ کو اسامہ کا ماتحت قرار دیا تھا۔ اسی طرح جب جنگ موتہ میں اسامہ کو
سرداری کی پوسٹ دی تھی تو خود آنحضرت نے ابوبکر و عمر کو ان کے لشکر میں
بھیجا تھا۔ اور مورخین کے درمیان یہ مسئلہ غیر اختلافی ہے۔ اسی طرح جنگ
ذات السلاسل میں ابن عاص کو سردار بنایا تب بھی ابوبکر و عمر کو ماتحت قرار
دیا تھا لیکن حضرت علیؑ کو ابتدائے بعثت سے رحلت تک کسی کی قیادت
میں نہیں رکھا۔ صرف اپنی قیادت میں رکھا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

●

تاریخ یہ واقعہ کبھی نہیں بھلا سکتی جب رسولؐ بستر بیماری پر تھے اور آپ
کی حالت گرتی جا رہی تھی اور آپ کو احساس ہو رہا تھا کہ زندگی کے آخری تار
بھی ٹوٹنے ہی والے ہیں تو آپ نے اپنا آخری پروگرام پیش کرنا طے کر لیا۔
کہ کہیں ایسا نہ ہو وقت نکل جائے چنانچہ آپ نے فرمایا:
میرے لیے کاغذ لاؤ تاکہ تمہارے لئے ایک ایسی تحریر لکھ جاؤں
جس کے بعد گمراہ نہ ہو سکو۔[2]
جس طرح آپ پہلے کئی مرتبہ قیادت کے مسئلہ کو زبانی واضح کر

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۵۱، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱
[2] مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۳۴۷، صحیح مسلم ج ۵ ص ۷۶، تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۳۶،
طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۴۴

سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ آخری بار تحریری طور سے امامت و خلافت کا مسئلہ حل کر کے مسلمانوں کے حوالے کر دوں تاکہ بعد میں اختلافات نہ ہوں۔ لیکن جن لوگوں نے آپ کے حکم کی مخالفت کر کے لشکر اسامہ میں شرکت سے انکار کر دیا تھا وہ حالات کا اندازہ لگا رہے تھے کہ جیسے ہی فرصت ملے مقصد کو حل کر لینا چاہیئے اس لیئے انھوں نے پیغمبرؐ کو تحریر لکھنے نہ دی۔ [1]

جابر بن عبد اللہ کا بیان ہے: جب پیغمبرؐ اسلام مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آپ نے ایک کاغذ مانگا کر ایک تحریر لکھ دیں جس سے امت بعد میں گمراہ نہ ہو۔ اور نہ ایک دوسرے کو گمراہی کی طرف نسبت نہ دے اس وقت رسولؐ خدا کے گھر میں موجود حضرات کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوئی اور جھگڑے کی نوبت آگئی۔ عمر نے ایسے کلمات کہے کہ رسولؐ خدا نے ان کو گھر سے نکال دیا۔ [2]

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ سے روایت ہے کہ ابن عباس نے کہا: جب رسولؐ خدا اپنی زندگی کے آخری لمحات گزار رہے تھے آپ کے گھر میں لوگوں میں عمر بن خطاب بھی تھے پیغمبرؐ نے فرمایا:

لاؤ میں تم لوگوں کے لئے ایک نوشتہ لکھ دوں تاکہ اس کے بعد گمراہ نہ ہو۔ عمر نے کہا رسولؐ خدا پر بیماری کا غلبہ ہے تمھارے پاس قرآن ہے اور وہی ہمارے لیئے کافی ہے۔ اتنا کہنے پر حاضرین میں اختلاف

---

[1] ۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲، تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۳۶، صحیح مسلم ج ۵ ص ۷۶، مسند احمد حنبل ج ۳ ص ۳۴۶ [2] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۴۳

ہو گیا اور ایک دوسرے سے دشمنی پر اتر آئے کچھ لوگ کہتے تھے جلدی کرو تاکہ رسولِ خدا ہمارے لئے تحریر لکھ دیں جس کے بعد گمراہی کا امکان ختم ہو جائے اور کچھ لوگ عمر والی بات کر رہے تھے۔ جب اختلاف اور بیہودہ باتیں پیغمبرؐ کے پاس زیادہ ہو گئیں تو آپ نے فرمایا: یہاں سے نکل جاؤ!

اسی بات کو ابن عباس کہا کرتے تھے۔ واقعی سب سے بڑی مصیبت اس وقت درپیش ہوئی کہ جب لوگوں کے شور و غل و اختلاف نے رسولِ خدا کو وہ تحریر لکھنے نہ دی۔ [1]

ابن عباس بڑے افسوس کے ساتھ کہتے تھے: مسلمانوں پر مصیبت کا آغاز اسی دن سے ہوا ہے۔ [2]

خلیفہ دوم اور ابن عباس کے درمیان خلافت حضرت علیؑ کے بارے میں جو مباحثہ ہوا ہے اس میں عمر نے کہا: رسولِ خدا چاہتے تھے کہ اپنے آخری عمر میں علیؑ کے نام کی تصریح کر دیں مگر میں نے ایسا کرنے نہیں دیا۔ [3]

اہل سنت کے محدثین و مورخین کی ایک جماعت نے لکھا ہے جب رسولِ خدا نے عزم محکم کر لیا کہ ایک ایسی تحریر لکھ جاؤں جس کے بعد امت گمراہ نہ ہو تو عمر نے کہا: رسولِ خدا ہذیان بک رہے ہیں لیکن بعض

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۴۲، صحیح مسلم ج ۱ ص ۹۵، مسند احمد حنبل ج ۱ ص ۳۳۶

[2] تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۲۷ ۔ ۲۲۸ تاریخ ذہبی ج ۱ ص ۳۱۱ تاریخ خمیس ج ۱ ص ۱۸۲، البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۹۵ و تیسیر الوصول ج ۴ ص ۱۹۴،   [3] شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۹۷

لوگوں نے عمر کی بات کی تاویل کرنی چاہی ہے تاکہ ان کی بزرگی، عظمت مجروح نہ ہوجائے کہ عمر کا مطلب یہ تھا: پیغمبرؐ پر درد کا غلبہ ہے تمہارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے بس وہی ہمارے لئے کافی ہے۔ [1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسولِ خداؐ کو کتاب اللہ کی اہمیت کا علم نہیں تھا بلکہ امت والے زیادہ بہتر سمجھتے تھے اگر پیغمبرؐ اپنے بعد کے لئے جانشین و رہبر معین کرنا چاہیں اور تحریری بیان دینا چاہیں تو کیا مسلمانوں کا یہی فریضہ تھا کہ ان کو پاگل ثابت کردیں؟ اور اگر پیغمبرؐ کے ارادہ کے لئے یہ کہا جائے کہ وہ تو بیماری کی شدت کی وجہ سے تھا اس لئے عمر نے روکا تھا تو ابوبکر نے مرتے وقت جو عہد نامہ عمر کے لئے لکھا تھا عمر نے اس سے ابوبکر کو کیوں نہیں روکا۔ وہاں بھی تو شدت بیماری تھی؟ اور ابوبکر کو کیوں نہیں کہا کہ پاگل ہوگئے ہیں؟ ان کی تحریر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر پیغمبرؐ نے معاذ اللہ ہذیان کی صورت میں تحریر لکھنے کے لئے کہا تھا جس کو عمر نے نہیں مانا تو پھر جھگڑا بڑھتے ہی رسولؐ نے جب سب کو کہا یہاں سے نکل جاؤ تو اس کو کیوں مان لیا اور سب کے سب چلے گئے یہ بھی تو ہذیان تھا آخر یہ بات کہ تحریر والی لا تحریر بات کیوں؟

درحقیقت تحریر نہ لکھنے دینے میں کامیابی کے بعد وہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لئے پیغمبرؐ کے نکالتے ہی سب کے سب

---

[1] صحیح مسلم ج ۳ کتاب الوصیۃ ص ۱۲۵۹، صحیح بخاری ج ۳ ص ۵، تقریباً یہی الفاظ مسند احمد حنبل میں ہے جس کی تحقیق شاکر نے کی ہے ملاحظہ ہو حدیث ۲۹۹۲

بھر باہر سے نکل آئے۔ مترجم"

ابو بکر جب تحریر لکھ رہے تھے تو عمر موجود تھے اور جانتے تھے کہ انکی قیادت کے لئے تحریر لکھی جارہی ہے اور ان کی سند خلافت پر ابو بکر امضا کرنے والے ہیں مگر یہاں نہیں روکا کیوں؟

اگر عمر کے نزدیک ہر مشکل کا حل کتاب خدا ہی سے کرنا تھا تو رسول کی رحلت کے بعد فوراً ابو بکر کو ساتھ لے کر سقیفہ کی طرف کیوں بھاگے تاکہ خلافت کی مشکل وہاں حل کی جائے۔ آخر کتاب خدا سے حل کیوں نہیں تلاش کیا؟ وہاں تو کسی نے بھولے سے بھی قرآن کا نام نہیں لیا آخر یہ کیوں، حالانکہ قرآن نے اس مسئلہ کو حل کر دیا ہے مسلمانوں کی تکلیف معین کر دی ہے۔ [1]

طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

جب ابو بکر کے آزاد کئے ہوئے غلام شدید نے عمر کی جانشینی کا فرمان جس کو ابو بکر نے لکھا تھا اپنے ہاتھ میں لیا تو عمر نے فوراً لوگوں سے کہا: اے لوگو سنو اور خلیفہ کے فرمان کی اطاعت کرو خلیفہ کہتے ہیں:

میں نے تمہاری خیر خواہی میں کوئی کمی نہیں کی ہے [2]

●

---

[1] آیۂ تبلیغ و آیۂ ولایت وغیرہ

[2] تاریخ طبری ج ۳ ص ۵۱

انتہا یہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے مرنے کے بعد انکے نظریات کی مسلسل شخصی مخالفت کی جاتی رہی ہے جس کے نتیجہ میں خلیفۂ دوم کے زمانہ میں خود ان کے حکم سے بہت سے احکام الٰہی بدل دیئے گئے کتبِ اہل سنت میں ان مقالات کی تفصیل بھی موجود ہے۔ ۱؎

خلیفۂ دوم کہتے ہیں: جس مرد نے کسی عورت سے متعہ کیا ہوگا اگر اس کو میرے پاس لایا گیا تو میں اسکو ضرور سنگسار کروں گا۔ ۲؎

حضرت عمر کا متعہ سے روکنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر اصحاب و مسلمانوں میں متعہ کا رواج نہ ہوتا تو حضرت عمر اس کی ممانعت کیونکر کرتے؟ اور اگر پیغمبرؐ نے اس کو جائز نہ قرار دیا ہوتا تو اصحاب کسی بھی قیمت پر اس کا ارتکاب نہ کرتے اور نہ اس کی ضرورت ہوتی کہ عمر اپنے دور میں اسکو حرام کریں۔ اور ارتکاب متعہ کرنیوالے کو سنگسار کریں۔

عمر نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ رسولِ خدا کے زمانہ میں تین چیزیں حلال تھیں مگر میں ان کو حرام کرتا ہوں اور جو ارتکاب کرے گا اسکو سزا دوں گا۔ ۱۔ متعۃ النساء۔ ۲۔ متعۃ الحج ۳۔ حی علی خیر العمل۔ ۳؎

اسی طرح عمر نے حکم دیا کہ نماز صبح میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" "نماز سونے سے بہتر ہے" کہا کریں۔ ۴؎

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۲۷۳، صحیح مسلم ج ۴ ص ۳۲۷، ۳۰۸، ۲۹، تاریخ طبری ج ۴ ص ۲۰۸، مسند احمد حنبل ج ۳ ص ۳۲۵، ۳۰۸، ۲؎ صحیح مسلم ج ۸ ص ۱۶۹، ۳؎ الغدیر ج ۶ ص ۲۲۳، ۴؎ مسند احمد حنبل ج ۳ ص ۲۰۸ صحیح مسلم ج ۳ ص ۱۸۳ سیرۃ حلبی ج ۲ ص ۱۰۵ البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۳

صحیح ترمذی میں ہے :

ایک شخص شامی نے عبداللہ بن عمر سے متعۃ الحج کے بارے میں پوچھا عبداللہ نے کہا حلال ہے اس نے کہا تمھارے باپ عمر تو حرام کہتے تھے عبداللہ نے کہا : اگر میرے باپ نے کسی چیز سے روکا ہو لیکن پیغمبرؐ نے اجازت دی ہو تو کیا ہم پیغمبرؐ کی سنت کو چھوڑ کر اپنے باپ کی بات پر عمل کریں گے۔ ۱

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے :

لوگوں نے عبداللہ بن عمر سے کہا تمھارے باپ نے متعہ سے ممانعت کر دی تھی عبداللہ نے کہا : مجھے ڈر ہے تمھارے اوپر آسمان سے پتھر نہ برسنے لگے کیا ہم سنت رسولؐ کی پیروی کریں یا سنت عمر بن خطاب کی ؟ ۲

رسولخدا اور ابوبکر کے پورے زمانہ میں اور عمر کی خلافت کے ابتدائی تین سالوں تک اگر کوئی اپنی بیوی کو ایک نشست میں تین طلاق دیتا تھا۔ تو وہ صرف ایک طلاق شمار ہوتی تھی لیکن عمر نے کہا اب اگر ایسی کوئی طلاق ہوئی تو میں اس کو تین طلاق شمار کروں گا۔ ۳

لیکن شیعہ اب تک اس کو ایک ہی طلاق مانتے ہیں استاد علامہ

۱۔ صحیح ترمذی ج ۳ ص ۳۸ کتاب حج

۲۔ تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۱۴۱

۳۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۸۳ ـــــ ص ۱۸۳

شیخ شلتوت اپنے زمانے کے جامعہ ازہر مصر کے رئیس نے اس مسئلہ میں اور اس کے علاوہ دیگر بہت سے مسائل میں شیعہ فقہ کی برتری کی تصریح کی ہے۔ [1]

چونکہ احکام الٰہی تغیر پذیر نہیں ہیں اسی لئے احکام وحی میں کسی دوسرے کو تو کیا خود پیغمبر اسلام کو بھی حق تصرف حاصل نہیں ہے قرآن کا ارشاد ہے: اگر رسول ہماری نسبت کوئی جھوٹی بات بنالائے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم ضرور انکی شہ رگ کاٹ دیتے۔ [2]

لیکن افسوس اسی کا ہے کہ بعض اصحاب نے کچھ احکام میں اپنی رای کو مقدم کیا اور اپنے نظریہ کے مطابق احکام الٰہی میں تغیر و تبدل کر دیا۔ حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانہ میں طبقاتی اختلاف پیدا کر دیا۔ عجم و عرب، آقا و غلام کے درمیان نسلی کشمکش کو بڑھاوا دیا۔ [3]

مسلمانوں کے حصہ میں اس طرح تفاوت کیا کہ سابقین اسلام کو غیر سابقین اسلام پر فوقیت دی، قریش کے مہاجرین کو دوسرے قبیلوں کے مہاجرین پر فوقیت دی، خود مہاجرین کو انصار پر، عرب کو عجم پر، آقا کو غلام پر ترجیح دی۔ [4]

خود حضرت عمر کو آخری عمر میں اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اور

---

[1] مجلہ رسالۃ الاسلام چاپ مصر سال ۱۱ شمارہ ۱ [2] پ ۲۹ سورۃ الحاقۃ آیت ۴۴ تا ۴۶

[3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰۶ [4] شرح ابن ابی الحدید ج ۸ ص ۱۱۱، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۲۹۷ اور ص ۲۹۸

انھوں نے اس بات کا اظہار کیا تھا :

اگر میں اس سال زندہ رہ گیا تو اسلامی معاشرہ میں مساوات قائم کروں گا اور تفریق کو ختم کر دوں گا۔ اور رسولخدا اور ابوبکر کی سیرت پر عمل کروں گا۔

یہ تمام باتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ اصحاب کا ایک مخصوص طبقہ آنحضرتؐ کے احکام کی پیروی سے بے اعتنائی برتتا تھا۔ اور رسولخدا کے جو احکام ان کے مذاق و سلیقہ کے مطابق نہیں ہوتے تھے یا تو انکو ختم کر دیتے تھے یا انہیں تبدیل کر دیتے تھے۔

اسی لئے نص غدیر کو خود آنحضرتؐ کی زندگی میں سناتنا یا انتقال کے بعد دوسرے مواقع پر احکام رسولؐ کی طرح ہی مخالفت کرنا نہ جائے تعجب ہے نہ کوئی نئی بات ہے۔

●

ہر معاشرے میں اکثریت ہمیشہ مسائل، امور سیاسی، امور اجتماعی میں ایسے لوگوں کی طرف رجوع کرتی ہے جو انہیں ماہر ہوں اور یہ بات ایسی ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

ان حالات میں ایسی بھی اہم شخصیتیں تھیں جو رسولؐ کے انتقال کے بعد اپنے موقف سے ٹس سے مس نہیں ہوئیں ان شخصیتوں نے سقیفہ کی تائید نہیں کی۔ بلکہ مخالفت کی، اور اکثریت کے بہاؤ میں نہیں بہ گئیں مثلاً حکومت اسلامی میں شوریٰ کی بنیاد ڈالنے کی مخالف رہیں۔

۱۔ تاریخ یعقوبی اور تقریباً یہی مضمون ڈاکٹر طہٰ حسین کی الفتنۃ الکبریٰ کے ج ۱ ص ۱۰۸ پر ہے۔

اسی بنا پر ان لوگوں سے جدا ہو گئیں۔ اگرچہ اس ناساز گار فضا میں حق گوئی علی الاعلان نہیں کر سکیں لیکن حضرت علیؑ کی امامت کے قائل و وفادار رہیں ان شخصیتوں میں سر فہرست جناب سلمان فارسی، ابوذر غفاری، ابو ایوب انصاری، خزیمہ بن ثابت، مقداد بن اسود، عمار یاسر، ابی بن کعب، خالد بن سعید، بلال، قیس بن عبادہ، ابان، بریدہ اسلمی، ابو ہیثم بن التیہان، وغیرہ سر فہرست ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جنکا نام تاریخ میں درج ہے بعض محققین نے ۲۵۰ نام تک تحریر کئے ہیں اور ان کے خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ؎۱

یعقوبی نے اپنی تاریخ میں ابوذر، سلمان، مقداد، خالد بن سعید، زبیر، عباس، براء بن عازب، ابی بن کعب، فضل بن عباس، کا نام لیا ہے ؎۲ خلافت کے سلسلہ میں قیس بن سعد بن عبادہ نے اپنے باپ سے ناراضگی اختیار کر لی، اور قسم کھائی کہ ان سے بات نہیں کریں گے۔ ؎۳

یہ سب صدر اسلام کے وہ شیعہ ہیں جنھوں نے کتاب و سنت کی نص کی بنا پر حضرت علیؑ کی امامت کے آخر تک قائل رہے تینوں خلافتوں کے دوران شیعوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جنکا تاریخ میں بڑے احترام سے نام لیا جاتا ہے۔ ان میں سے محمد بن ابی بکر، صعصعہ بن صوحان، ہشام بن عتبہ

؎۱ فصول المہمہ شرف الدین ص ۱۷۷ تا ۱۹۲۔

؎۲ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰۳

؎۳ ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۸

عبداللہ بن بدیل، میثم تمار، عدی بن حاتم، حجر بن عدی، اصبغ بن نباتہ، حارث اعور، عمرو بن الحمق، مالک اشتر، عبداللہ بن ہاشم، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کیا سارے اصحاب جنتی ہیں؟

اصحاب رسولؐ کے گذشتہ اعمال کی بنا پر قرآن نے جو انکی مدح و ثنا کی ہے اس مدح و ثنا کو اس بات کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا کہ وہ عمر بھر ہر قسم کے فساد، انحراف سے پاک و صاف رہے ہیں اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تمام اعمال خواہ کسی زمانہ میں ہوں وہ حق و عدالت پر مبنی رہے ہیں کیونکہ خوشنودی پروردگار عالم اور انسان کی ابدی سعادت، دائمی ایمان اور زندگی بھر عمل صالح کے استمرار پر موقوف ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں — دائمی ایمان، زندگی بھر استمرار عمل صالح — انسان میں نہ ہوں اور عقیدہ و عمل کے لحاظ سے انحراف و فساد کی طرف مائل ہو تو پھر عمل کا روشن و تابناک ماضی اسکے مستقبل کی نیک بختی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

رسولؐ اکرمؐ جو معلم انسانیت و تقویٰ تھے اور نمونہ فضائل و اخلاق تھے گناہوں سے معصوم تھے انکو قرآن مخاطب کر کے کہتا ہے۔

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ [1]

اگر کہیں شرک کیا تو یقیناً تمہارے سارے اعمال اکارت ہوجائنگے حالانکہ معلوم ہے کہ رسولؐ چونکہ صاحب عصمت ہیں اس لئے

---

[1] پ ۲۴ س ۳۹، الزمر، آیت ۶۵

ایک سکنڈ کے لئے بھی گناہ نہیں کر سکتے لیکن قرآن کا اس طرح خطاب کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپکے اصحاب میں غرور نہ پیدا ہو جائے اور مسلمانوں میں ریاکاری کا عنصر نہ شامل ہو جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان صحابی اپنی پوری طاقت و حیاتی استعداد کو آخری لمحہ تک خدا کی مرضی حاصل کرنے میں صرف کرے اور ہمیشہ صراط مستقیم پر گامزن رہے۔

اسی طرح قرآن شیخ الانبیاء جناب ابراہیم اور ان کے لڑکوں کے بارے میں کہتا ہے :

وَلَوْ اَشْرَکُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ [1]

اگر ان لوگوں نے شرک کیا ہوتا تو انکا کیا دھرا سب اکارت ہو جاتا

دوسری جگہ قرآن اعلان کرتا ہے : وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ ۔ [2]

خدا ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ تیسری جگہ ارشاد ہے :

فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِيْنَ ۔ [3]

اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو خدا بدکاروں سے کبھی بھی راضی نہیں ہوگا۔

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ صحابہ سب کے سب نیک اور پارسا نہیں تھے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے بلکہ اس مطلب کو صحیح بخاری

---

[1] پ۷ س (انعام) آیت ۸۸

[2] پ۳ س (آل عمران) آیت ۵۷

[3] پ۱۰ س (توبہ) آیت ۹۶

سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ بخاری میں ہے:۔ [1]

قیامت میں میں لب کوثر کھڑا ہوں گا اور کچھ لوگوں کا انتظار کر رہا ہونگا جو میرے پاس آنے والے ہونگے۔ اتنے میں ایک گروہ میرے پاس سے جدا ہو جانے گا اور میں لے جانے والوں سے پوچھوں گا کیا بات ہے، یہ تو میرے اصحاب ہیں؟ جواب آئے گا ہاں لیکن تم کو معلوم نہیں ہے کہ یہ لوگ تمھارے بعد پچھلے پاؤں پلٹ گئے تھے۔

مسلم نے بھی اپنی صحیح میں لکھا ہے: حوض کے کنارے میرے کچھ صحابی اس طرح آئیں گے کہ میں ان کو پہچان رہا ہوں گا۔ جب وہ میرے پاس لانے جائیں گے تو شرمندہ ہوں گے میں کہوں گا: خداوندا یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب ملے گا تم نہیں جانتے انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا کیا؟ [2]

اہلسنت کے مشہور محقق تفتازانی شافعی تحریر کرتے ہیں:

اصحاب کے درمیان جنگ و جدال و اختلافات بہرحال ہوئے ہیں: جیسا کہ تاریخوں میں موجود ہے اور قابل اطمینان و ثقہ افراد کی زبان سے نقل کیا گیا ہے ان تمام باتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اصحاب کی ایک جماعت حق سے منحرف ہو چکی تھی۔ اور وہ جماعت فاسق و ظالم ہو گئی تھی اور اس انحراف، فسق و ظلم کی علت کینہ پروری، دشمنی، حسد، سلطنت خواہی، ریاست طلبی، لذت پرستی تھی۔ کیونکہ تمام صحابہ گناہ و

---

[1] بخاری کتاب فتن۔ [2] صحیح مسلم ج ۵ ص ۶۳

فساد سے معصوم نہیں تھے۔ ؎

●

اس لئے اگر مسلمانوں کا کوئی فرقہ بعض اصحاب یا تابعین سے عقیدت نہیں رکھتا یا ان پر اعتراض کرتا ہے تو محض اعتراض کرنے کی وجہ سے اس فرقہ کو قابل لعنت یا اس پر نفرین کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ان باتوں سے آپس میں نزاع، جنگ وجدال کی نوبت آنی چاہیئے۔ اور کوئی وجہ جواز بھی نہیں ہے کہ پیروان رسول خدا کو محض بعض اصحاب پر اعتراض کرنے کی وجہ سے فاسق و کافر کہا جانے لگے۔ ایک دوسرے پر اعتراض تو خود صحابہ رسول کے زمانے میں بھی کرتے تھے۔ بلکہ سقیفہ کے ہی حالات دیکھئے۔ ایک گروہ سعد بن عبادہ کے قتل کے لئے چڑھ دوڑا قیس ابن عبادہ نے عمر کا گریبان پکڑ کر کھینچا، زبیر نے چلا کر کہا جب تک تم لوگ علی کی بیعت نہیں کروگے میں اپنی تلوار نیام میں نہیں رکھوں گا، عمر چلائے زبیر کو پکڑ لو جانے نہ دو اور انجام کار زبیر کی پٹائی ہوئی۔

سقیفہ میں مقداد کے ساتھ عمر کا برتاؤ اور اپنے دور خلافت میں عثمان کا ابن مسعود، عمار یاسر، ابوذر کے ساتھ برتاؤ اور دیگر بہت سے واقعات اس قسم کے جدال و قتال کے شاہد عین ہیں۔ اس لئے بعض صحابہ کا دوسرے صحابہ کے بارے میں غلط نظریہ رکھنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگیں یا ان پر لعنت کریں

؎ شرح المقاصد ص ۳۰۶

اور ان باتوں سے وحدت اسلامی بھی متاثر نہ ہونا چاہیئے۔

ویسے صحیح بات تو یہ ہے کہ حضرات اہلسنت بھی عملی طور سے تمام صحابہ وتابعین کو قابل احترام نہیں سمجھتے مثلاً جن لوگوں نے حضرت عثمان کو قتل کیا وہ صحابہ وتابعین ہی تو تھے۔ خالد بن ولید صحابی تھے انھوں نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا وہ بھی صحابی ہی تھے۔

ہاں یہ درست ہے قربانی، تقویٰ، پرہیزگاری اور ایمان کے اعتبار سے بھی صحابہ میں عظیم شخصیتیں موجود تھیں بلکہ ایسے حضرات بھی تھے جو عظمت وکمال کی چوٹی پر تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جنکی روح کے گوشوں میں جاہلی افکار وآداب ابھی تک کھوسلے بنا رکھے تھے۔ اور یہ لوگ رسوم جاہلیت سے بڑی دلبستگی رکھتے تھے، انتہا یہ ہے کہ بہت سے عناصر فتح مکہ کے بعد بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، انھوں نے اسلام کو اپنی ذاتی مصلحت کا آلہ بنایا تھا، صرف رسول اسلام کی شخصیت تھی جس نے ان کے خبث باطن کو ظاہر نہیں ہونے دیا، آپ کی ہیبت وعظمت کی بنا پر یہ لوگ اپنی اصلی شخصیت ظاہر نہیں کر سکے تھے، انکو صرف رسول کی موت کا انتظار تھا، رسول کے انتقال کے بعد یہ لوگ کھل کر سامنے آگئے اور اپنا چولا ہی بدل دیا لہٰذا سنت صحابہ پر عمل کرنا انکو معصوم ماننا ان کی عدالت کا عقیدہ رکھنا یہ سب باتیں سنت رسول کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔

لہٰذا نجات ورستگاری صرف صحابہ وانصار میں منحصر نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ نجات کا انحصار مہاجرین یا انصار ہی

کی اتباع میں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط ہیں کہ انسان مرتے دم تک اگر ان شرائط کا پابند رہا تو نجات پائے گا۔

●

لیکن علمائے اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ تمام اصحاب رسولؐ مجتہد تھے اور معذور تھے بلکہ غلطی پر بھی ماجور تھے اسی لئے اصحاب کو ہر غلط کام سے پاک مانتے ہیں اور یا پھر انکو معذور تسلیم کرتے ہیں اسی نظریے نے مسلمانوں سے صحابی پر حق اعتراض چھین لیا ہے اور طالبان دنیا کی جرأتوں کو بڑھا دیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ معاویہ، عمرو بن عاص، خالد بن ولید، مغیرہ، سعید بن عاص، بسر بن ارطاة جیسے لوگوں نے جو چاہا کیا لیکن کسی میں اعتراض کرنے کی جرأت نہیں تھی انتہا یہ ہو گئی تھی کہ معاویہ بے دھڑک کہا کرتا تھا:

مال خدا کا مال ہے میں اس کا جانشین ہوں لہٰذا جس طرح چاہوں خرچ کروں، ! اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس کا جواب دیتا صرف صعصعہ بن صوحان جو حضرت علیؑ کے صحابی تھے وہ بول اٹھے اور معاویہ کی تردید کی۔ ؎

اگر صرف پہلوئے رسولؐ میں اصحاب کا بیٹھ جانا سبب عصمت و سعادت ہے تو خود پیغمبرؐ اسلام کے زمانہ میں صحابہ کی ایک جماعت نے اپنے عقائد کیوں چھوڑ دئے؟ اور گمراہوں سے جا ملے اور رسولؐ کی طرف

؎ مروج الذہب مسعودی

سے ان کا خون حلال کر دیا گیا۔

خوارج کا لیڈر حرقوص بن زہیر، رسولؐ کا صحابی تھا اس وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آخر عمر میں یہ گمراہوں کا سربراہ ہو جائے گا حالانکہ آنحضرتؐ نے اس کے بارے میں پیشگوئی فرمادی تھی: یہ دین سے اسی طرح نکل جائے گا جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ اور آخر کار وہ خوارج سے جا ملا اور جنگ نہروان میں حضرت علیؑ کی مخالف جماعت کا علمبردار یہی تھا۔

عبداللہ بن جحش، مجبور ہو کر مسلمانوں سے ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا اور لوگوں کو امید تھی کہ دیگر مسلمانوں کی طرح زحمتوں کو برداشت کر کے اپنے عقیدہ پر باقی رہے گا اور دین اسلام کا دفاع کرے گا لیکن وہاں جا کر عیسائی ہو گیا۔

لہٰذا خدا کی رضامندی اصحاب رسولؐ سے اس بات پر موقوف ہے کہ آخری عمر تک سرحد ایمان و تقویٰ سے دور نہ ہوں اور دامن اسلام سے وابستہ رہیں لیکن اگر کسی نے ایسا نہ کیا اور گمراہ ہو گیا تو سارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور خدا کی خوشنودی غیظ و غضب سے بدل جائے گی۔

اس لئے مومنین ہوں یا اصحاب رسولؐ کسی کو کھلی چھوٹ نہیں دی گئی ہے کہ جو جی چاہے کرے جنت کی ضمانت ہے۔ ایسی ضمانت تو انبیاؑ و اولیاء کو نہیں دی گئی بلکہ سرکار رسالتؐ کو بھی نہیں بخشی گئی حالانکہ آپ انسانوں میں سراسر خیر و برکت و رحمت تھے۔

سقیفہ کی خلافت!

رسولِ اکرم، اسلام کے بانی، روحِ جہاں، نجات دہندۂ عالم، کے انتقال کے ساتھ ہی رشتۂ وحی ٹوٹ گیا وجودِ مقدس ملکوتی کے جلوے اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے صلوات اللہ وسلامہ علیہ۔

ابھی آنحضرتؐ کا جسمِ مطہر زمین ہی پر تھا اور حضرت علیؑ و آلِ ہاشم و چند اصحاب غسل و کفن دینے میں مشغول تھے کہ ان سے فارغ ہو کر نمازِ جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے، یہ حضرات اس عظیم مصیبت میں مبتلا تھے اور واجب فوری کو ادا کرنے میں مشغول تھے ان کے علاوہ آنحضرتؐ کے جنازے پر کوئی نہیں تھا۔ [1]

البتہ انصار کا ایک گروہ اسی جگہ سے تھوڑی ہی دور پر "سقیفہ بنی ساعدہ" میں جمع تھا تا کہ رسولِ خدا کی جانشینی کا مسئلہ اپنی مرضی کے مطابق حل کرے اسی وقت عمر نے ابوبکر کو پیغام بھیجا فوراً میرے پاس آؤ ابوبکر نے سمجھ لیا کہ کوئی خاص بات ہے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور دونوں انصار کی طرف باہم چلے راستے میں ابوعبیدہ جراح سے ملاقات ہو گئی تینوں سقیفہ کی طرف چل کھڑے ہوئے [2]

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۶۰، تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۹۳، مسند احمد حنبل ج ۳ ص ۱۰۳، تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۵۱، اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۴، العقد الفرید ج ۳ ص ۶۰،

[2] طبری ج ۲ ص ۴۵۶

اہلسنت کے مشہور رائٹر اور شیعوں سے زبردست تعصب رکھنے والے احمد امین مصری تحریر کرتے ہیں :

اصحاب میں رسولخدا کی جانشینی کے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہوگیا یہ ان لوگوں کی بے لیاقتی و بدتمیزی تھی کہ دفن رسولؐ سے پہلے جانشینی کے مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھے صرف حضرت علیؑ تنہا وہ آدمی تھے جنھوں نے بڑی سوجھ بوجھ سے کام لیا اور تمام امور کو چھوڑ کر غسل و کفن و دفن رسولؐ میں مشغول رہے۔ بڑے بڑے صحابہ خلافت و جانشینی کے معاملے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھے۔ اور رسولؐ کے جنازہ کو چھوڑ رکھا تھا۔ سوائے علیؑ اور انکے خاندان کے جنازہ رسولؐ پر کوئی نہیں تھا جس رسولؐ نے انکو جہالت و نادانی سے نجات دی تھی صراط مستقیم کی ہدایت کی تھی اس کا کوئی احترام نہیں تھا اسکے دفن کا بھی کوئی انتظار نہیں کیا دفن سے پہلے ہی میراث کے لئے سر و سینہ پیٹنے لگے۔ [1]

سقیفہ میں بحث چھڑی تھی۔ حاکم کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کئے جا رہے تھے، انصار استدلال کر رہے تھے کہ ہم نے رسولؐ کو پناہ دی تھی، رسولؐ ہمارا کتنا احترام کرتے تھے، ہم نے اسلام کے لئے بہت سے جہاد کئے حکومت ہمارا حق ہے۔ اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ زمام سلطنت، سعد بن عبادہ کو ملنی چاہیئے اس لئے بیماری کے

---

[1] ترجمہ اعیان الشیعہ ج ۱ ص ۲۲۳ منقول از "یوم الاسلام"۔

باوجود انکو سقیفہ میں اکٹھا کرلیا گیا۔

مہاجرین استدلال کررہے تھے رسولؐ ہمارے وطن ہمارے شہر کے تھے، ہم نے اسلام وایمان کی ترقی کیلئے ہر چیز سے دست برداری اختیار کرکے رسولؐ کی مدد کی اس لئے ہم لوگ سب سے زیادہ مستحق حکومت ہیں۔

ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں ہو اور سب یہ سمجھتے تھے کہ دوسروں کے بہ نسبت ہم ہی مستحق ہیں[1] جھگڑے کو طول ہوا اور ہاتھا پائی کی نوبت آگئی عمر کی سرکردگی میں ایک گروہ ابوبکر کی جانبداری کررہا تھا اور یہ لوگ باقی حضرات کو ابوبکر کی بیعت پر آمادہ کررہے تھے اور مخالفین کو ڈرا دھمکا رہے تھے۔ اسی درمیان میں ابوبکر نے کھڑے ہوکر تقریر شروع کردی۔ اور مہاجرین کے خدمات وافتخارات کو بیان کرنے لگے اور کہا:

جن لوگوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ مہاجرین تھے سخت ترین حالات میں مقابلہ کیا اور مشرکین کے تمام دباؤ کے باوجود اسلام سے دست برداری اختیار نہیں کی۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ حضرات "یعنی انصار" نے بھی اسلام کی زبردست خدمت انجام دی ہے مہاجرین کے بعد آپ حضرات سب پر مقدم ہیں پھر اتنا اور اضافہ کیا ہم لوگ امیر ہوں اور آپ لوگ وزیر ہوں۔

---

[1] طبری ج ۵ ص ۳۱، کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۳

حباب بن منذر نے الشکر کہا :

اے گروہ انصار تمام چیزوں کو اپنے ہاتھوں میں ، مضبوطی سے لے لو تاکہ کوئی تمہاری مخالفت نہ کر سکے ایسا نہ ہو کہ تم میں اختلاف پیدا ہو جائے اور تم کو شکست نصیب ہو ہم اپنے لئے ایک امیر معین کر لیتے ہیں یہ لوگ اپنا ایک امیر معین کر لیں۔ عمر نے کہا ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں ہوتے خدا کی قسم عرب تمہاری حکومت کبھی تسلیم نہیں کریں گے جبکہ پیغمبرؐ تم میں سے نہیں ہیں ہمارے پاس مضبوط دلیل ہے جب ہم لوگ رسولخداؐ کے دوستوں اور رشتہ داروں میں ہیں تو ہم سے کون مقابلہ کر سکتا ہے ؟ ہاں اگر کوئی باطل پرست ہو تو بات ہی اور ہے یا کوئی اپنے کو ہلاک ہی کرنا چاہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

حباب بن منذر نے دوبارہ کھڑے ہو کر کہا :

اے گروہ انصار اس شخص کی باتوں کو نہ سنو یہ لوگ تمہارا حق غصب کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے فوائد اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں تم لوگ حکومت پر قبضہ کر لو اور مخالفین کو اپنی زمین سے نکال دو کیونکہ تم سے زیادہ حکومت کا مستحق کوئی نہیں ہے۔ اگر کسی نے میری پیشکش کی مخالفت کی تو اسکی ناک اپنی تلوار سے رگڑ دونگا۔ عمر نے اسکا گریبان پکڑ لیا اور پیٹ پر ایک لات ماری ۔ [1]

اس وقت بشیر بن سعد ، سعد بن عبادہ ، کے چچا زاد بھائی جو سعد

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۶ ص ۳۹

کے مخالفین میں سے تھے کھڑے ہو کر عمر کی تائید کی اور انصار کو مخاطب کرتے ہوئے بولے :

اگرچہ ہم لوگوں نے جہاد راہ خدا میں اور نشر اسلام میں بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس اعتبار سے صاحب فضیلت ہیں لیکن ہمارا مقصد سوائے رضائے الہی اور خوشنودی رسالت پناہی کچھ اور نہیں تھا اس لئے دوسروں پر فخر و مباہات کرنا ہمارے لئے زیبا نہیں ہے ہمارا مقصد دنیاوی فائدہ نہ کبھی تھا نہ ہے۔ رسول قریش سے تھے لہذا بہتر یہی ہے کہ ان کی قوم والے ہی ان کے وارث ہوں آپ لوگ خدا سے ڈریئے ان لوگوں سے مخالفت مول نہ لیجئے۔

اس قسم کے مناقشات۔ اور لفظی بحثا بحثی کے بعد ابوبکر نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :

اختلاف و تفرقہ پردازی سے پرہیز کیجئے میں آپ کی صلاح و فلاح کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتا مصلحت اس میں ہے کہ آپ لوگ عمر کی بیعت کرلیں ، یا ابوعبیدہ کی ـــــ یہ سنکر عمر نے کہا ـــــ آپ ہم سے زیادہ لائق و سزاوار ہیں پیغمبر کے یار غار ہونے کی وجہ سے ہم سب پر مقدم ہیں آپ ہم سب سے زیادہ مالدار بھی ہیں۔ رسول کی جگہ آپ نے نماز پڑھائی ہے ان حالات میں کون شخص ایسا ہے جو آپ سے بہتر ہو اور حکومت کے لائق ہو ؟

عبدالرحمن بن عوف نے اٹھکر کہا : اے گروہ انصار آپ حضرات کے لئے واقعی بہت فضیلت ہے۔ اور اس حقیقت کا

انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے کہنے دیجئے کہ آپ
میں ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؑ کا کوئی ہم پلہ نہیں ہے!

منذر بن ارقم نے عبدالرحمن کو جواب دیا:

جن لوگوں کا تم نے نام لیا ہے انکی فضیلتوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا خصوصاً انہیں سے ایک ایسا ہے کہ اگر وہ امت اسلامی کا رہبر ہوجائے تو ایک آدمی بھی اسکی مخالفت نہیں کرسکتا۔!

اس سے مراد حضرت علی علیہ السلام کی ذات گرامی ہے،، ؎۱

اتنے میں انصار کے گروہ نے زور سے کہا: ہم علیؑ کے علاوہ کسی کی بیعت نہیں کریں گے۔ ؎۲

عمر کا کہنا ہے کہ فضا میں اتنی آوازیں گونجنے لگیں کہ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا لہٰذا میں نے ابوبکر سے کہا: ہاتھ بڑھاؤ تاکہ میں تمہاری بیعت کرلوں۔ ؎۳ ابوبکر نے فوراً ہاتھ بڑھادیا بشیر بن سعد آگے بڑھے اور ابوبکر کے ہاتھ کو پکڑ کر بعنوان بیعت دبایا اس کے بعد عمر نے بیعت کی پھر دوسرے لوگوں نے بیعت کی ؎۴

اسی ہنگامہ میں عمر و سعد سے کچھ بات بڑھ گئی اور جب چیخنے

۱؎ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰۳

۲؎ تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۸

۳؎ سیرۃ ابن ہشام ج ۴ ص ۳۳۶، تاریخ ابن کثیر ج ۵ ص ۲۴۶

۴؎ الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص ۹

چلانے کی نوبت آگئی تو ابو بکر نے عمر سے خاموش رہنے کیلئے کہا اور
بولے: ایسے حساس موقع پہ آرام و سکون کو ملحوظ رکھو اس وقت
سعد نے اپنے دوستوں سے کہا: مجھے یہاں سے لے چلو ان کے
دوستوں نے انھیں کندھے پر لاد کر ان کے گھر پہونچا دیا۔ [1]

ابو بکر کے ساتھی ان کو مسجد میں لائے تاکہ دوسرے لوگ بھی انکی
بیعت کریں لیکن حضرت علیؑ اور عباس ابھی رسولؐ اکرم کے غسل سے بھی
فارغ نہیں ہو پائے تھے کہ مسجد رسولؐ سے نعرۂ تکبیر کی بلند ہونے والی
آواز نے ان حضرات کی توجہ ادھر موڑ دی حضرت علیؑ نے پوچھا:
یہ بانگ ہو کیسا ہے؟ عباس نے کہا معاملہ غیر معمولی ہے پھر علیؑ کی
طرف متوجہ ہو کر بولے: میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔؟ [2]

ابو بکر مسجد میں داخل ہو کر منبر پہ گئے اور رات ہوتے تک
لوگ انکی بیعت کرتے رہے کسی کو دفن رسولؐ کی فکر نہیں تھی دوسرے
دن بھی مسجد میں یہی ہنگامہ برپا رہا سہ شنبہ یعنی مرنے کے ایک دن کے
بعد اور ابو بکر کی بیعت ختم کرنے کے بعد لوگ رسولؐ خدا کے گھر
میں داخل ہوتے تھے اور نماز پڑھتے تھے۔ [3]

رسولؐ خدا کے دفن میں ابو بکر و عمر شریک نہیں ہوئے۔ [4]

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ ص ۴۵۵ – ص ۴۵۹، [2] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۳۳، عقد الفرید
ج ۳ ص ۶۳، [3] سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۳۴۳، ریاض النضرۃ ج ۱ ص ۱۶۳
[4] کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۰

زبیر بن بکار لکھتے ہیں :

ابوبکر کی بیعت ختم ہونے کے بعد انصار کے بہت سے لوگ نادم و پشیمان ہوئے ایک دوسرے پر اعتراض اور ملامت کرتے تھے اور حضرت علیؑ کو یاد کرتے تھے۔[1]

مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے :

سقیفہ کا قصہ تمام ہونے کے بعد حضرت علیؑ نے ایک خطاب میں ابوبکر سے کہا : مجھ سے مربوط امور کو آخر کار برباد کر ہی دیا، مشورہ بھی نہیں کیا، بغیر سوچے جو چاہا کر لیا، ابوبکر نے کہا : ہاں ہوا تو ایسا ہی : میں فتنہ و فساد سے ڈر گیا تھا۔[2]

●

سقیفہ میں جو اجتماع ہوا وہ اہم ترین شخصیتوں سے خالی تھا مثلاً حضرت علیؑ ابوذر، مقداد، سلمان، طلحہ، زبیر، ابی بن کعب، حذیفہ وغیرہ ! مہاجرین میں سے صرف تین آدمی شریک تھے۔ کیا اتنے اہم مسئلہ میں دوسرے بزرگانِ اسلام کو شرکت کی دعوت نہیں دینی چاہیئے تھی ؟ اور ان کا نظریہ نہیں معلوم کرنا چاہیئے تھا ؟ کیا ایک مختصر سا جلسہ جو شور و غل کا مجموعہ ہو جس میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہو جو صرف انصار کے ایک گروہ اور تین مہاجرین پر مشتمل ہو وہ اتنے بڑے مسئلہ کے فیصلہ کا حق رکھتا ہے ؟ کیا موضوع

---

[1] الموفقیات ابن بکار ص ۵۸۳

[2] مروج الذہب ج ۲ ص ۴۲ الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۱۴ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ

کی اہمیت کا تقاضا نہیں تھا کہ بزرگ اسلامی شخصیتوں کے سامنے اس کو پیش کیا جاتا؟ اور انکے نظریات سے استفادہ کیا جاتا؟ اور اس وقت آخری فیصلہ کیا جاتا؟

جو لوگ اپنے کو اس فیصلہ کا حقدار سمجھتے تھے آخر انھوں نے کس دلیل سے دوسروں کا یہ حق سلب کیا ہے؟ اور انکو کسی شمار میں نہیں لائے! آخر کیوں؟ اگر چند لوگ عوامی ووٹنگ کے سہارے اپنے معاشرے کے لئے رہبر کا انتخاب کرنا چاہیں اور صاحبان نظر سے قطع نظر کرکے محترم شخصیتوں سے تبادلۂ رائے کے بغیر کسی کو منتخب کرلیں تو کیا واقعی یہ انتخاب عوامی انتخاب ہوگا؟ اور کیا جس وقت "سعد بن عبادہ" نے بیعت سے احتراز کیا تو ان کے قتل کا حکم دینا درست تھا؟

مورخین کا بیان ہے :

بنی ہاشم اور مہاجرین و انصار کے کچھ لوگ ابوبکر کی بیعت نہ کرکے حضرت فاطمہؑ کے گھر میں پناہ گزین ہوگئے کہ ہم صرف علیؑ کی بیعت کریں گے۔ [۱] اور بیت فاطمہؑ میں پناہ گزین حضرات کو متفرق کرنے کیلئے اور ان سے بیعت لینے کیلئے ایک جماعت نے جناب سیدہؑ کے گھر پر دھاوا بول دیا اور انکے گھر میں داخل ہوگئے۔ [۲]

۱؎ تاریخ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۵۶ ، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۱۸۸ ، العقد الفرید ج ۳ ص ۶۳ ، ریاض النضرۃ ج ۱ ص ۱۶۷ ، شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۳۰ تا ص ۱۳۴ ۔

۲؎ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۰۵ اس واقعہ کی تفصیل کیلئے رجوع ... ص ۱۲۶ ، ریاض النضرۃ ص ۱۶۷ ، تاریخ الخمیس ج ۱ ص ۱۸۸ ، کنز العمال ج ۳ ص ۱۴۰ ، ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۳۲ تا ص ۱۳۴

ابوبکر کا انتخاب اتنا اتفاقی اور جلد بازی میں ہوا تھا کہ وقت و فکر کا وہاں سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لئے حضرت عمر کہا کرتے تھے:

: ابوبکر کا انتخاب بالکل اتفاقی تھا اس میں تبادلہ آراء یا مشورہ کی کوئی صورت نہیں ہوسکی اس لئے اب اگر اسکے بعد تم کو کوئی ایسے کام کیلئے دعوت دے تو اسکو قتل کر دو۔ [1]

●

تمام باتوں کو چھوڑ یئے خلیفہ اول کی طرف سے جانشین کا تقرر خود اس بات کا شاہد ہے کہ رسولخدا کے بعد شورائی حکومت کا قیام بے بنیاد بات ہے کیونکہ پیغمبر اکرم کی طرف سے اس سلسلہ میں کوئی حکم نہیں آیا تھا۔ یعنی رسول نے نہیں فرمایا تھا کہ شوریٰ سے خلیفہ بنایا کرو۔ ورنہ مختلف لوگوں کا گروہ خلیفہ کے سامنے یہ بات نہ رکھتا کہ اپنی زندگی میں اپنا جانشین معین کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زعیم و لیڈر کے نہ ہونے کی وجہ سے پورے معاشرے میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے۔ [2]

اس وقت خلیفہ کا یہ کہنا کہ اگر ابوعبیدہ زندہ ہوتے تو میں ان کو جانشین معین کر دیتا کیونکہ رسولخدا نے انکے بارے میں فرمایا تھا: : یہ میری امت کے امین ہیں۔ یا اگر سالم (ابوحذیفہ کا غلام) زندہ ہوتے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۴ ص ۳۰۸، تاریخ طبری، ابن کثیر، ابن اثیر سب نے سقیفہ کے واقعہ میں لکھا ہے۔

[2] الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ ص ۱۹

تو میں ان کو جانشین معین کر دیتا کیونکہ رسولخدا کو میں نے فرماتے ہوئے سنا ہے : یہ خدا کا دوست ہے۔ [1]

ابوبکر سے خلیفہ کی نامزدگی کے لئے اصرار کرنا خود بتاتا ہے کہ رسول بھی خلیفہ نامزد کر گئے تھے۔ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ رسول اپنا خلیفہ نامزد کئے بغیر دنیا سے رحلت فرما گئے؟

دوسری طرف خلیفہ دوم کی طرف سے شورای خلیفہ کا منتخب کرنا نہ تو نص کی پیروی ہے نہ رائے عامہ کی پیروی ہے۔ اگر پہلا خلیفہ اپنے بعد کیلئے خلیفہ معین کرتا ہے تو دوسرا خلیفہ اس امر کو چھ آدمیوں کے سپرد کیوں کر دیتا ہے؟

اگر خلیفہ کا انتخاب لوگوں کا حق ہے تو دوسرے خلیفہ نے لوگوں کے حق کو ان سے کس دلیل کے پیش نظر سلب کر لیا اور اس کو ایسے شوریٰ کے سپرد کر دیا جس کو انھوں نے خود منتخب کیا تھا؟ جبکہ خود خلیفہ نے بعضوں کے لئے ایسے الفاظ کہے تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں خلافت کی کوئی استعداد ہی نہیں تھی۔ پھر بھی ان کو شوریٰ میں رکھا؟

قرآن مجید نے جہاں شوریٰ کا مسئلہ پیش کیا ہے وہاں رسولِ خدا کو حکم دیا ہے کہ لوگوں کے معاملات میں آپ خود لوگوں سے مشورہ کر لیا کیجئے۔ : وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ [2]

---

[1] تاریخ طبری و کامل ابن اثیر [2] پ ۴ س ۳ آل عمران، آیت ۱۵۹

یا دوسری جگہ پر ارشاد فرماتا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اور انکے کل کام آپس کے مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔ [1]

یہاں پر جن مسائل میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے وہ صرف اجتماعی مسائل اور وہ مسائل ہیں جو لوگوں سے مربوط ہوں نہ کہ مسئلہ امامت و خلافت میں مشورہ کا حکم دیا گیا ہے یعنی عہد الٰہی اور وہ مسائل جو مربوط بہ ہدایت خلق ہوں انکو شوریٰ سے نہیں حل کیا جا سکتا۔

بے قیمت اسناد

سقیفہ بنی ساعدہ کی فضا کچھ اس قسم کی تھی کہ اگر وہاں کچھ نیک و مخلص لوگ ہوتے بھی تو وہ حقیقت شکست خوردہ کی مدد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ سقیفہ میں جمع ہونے والے حضرات اپنے لئے جن امتیازات کے قائل تھے اور انھیں امتیازات کی بنا پر اپنے کو خلافت کا سب سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے وہ امتیازات کتاب و سنت سے تو با خود نہیں تھے اور اس مجمع میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں تھا جس نے تقویٰ، فرزانگی، شائستگی معنوی، مبانی و احکام اسلامی سے بخوبی آگاہی، اور عصمت کو خلافت و حکومت کیلئے بطور شرط پیش کیا ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے تمام ان حقیقی اولویتوں سے چشم پوشی کر رکھی تھی جو قرآن یا اسلام سے

---

[1] سورہ شوریٰ آیت ۳۸

متعلق ہو۔

جس چیز پر سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دعویداران خلافت و حکومت نے انسانی کمالات و روحانی کمالات سے بالکل ہی بے پروائی برتی۔ مثلاً جب انصار سعد بن عبادہ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے سعد نے انصار کو مخاطب کر کے کہا:

اے گروہ انصار دین کے اندر جو اولیت اور اسلام کے اندر جو فضیلت تمکو حاصل ہے کسی بھی قبیلہ کو حاصل نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اسلام نے اپنی قوم میں سالہا سال تبلیغ کی لیکن چند لوگوں کے علاوہ کوئی ان پر ایمان نہیں لایا اور جو ایمان لائے بھی وہ آنحضرتؐ کے دفاع پر قادر نہیں تھے یہانتک کہ خدا نے اپنا فضل و کرم شامل کیا اور تم لوگ اسلام لائے تب تم نے حریم اسلام کا بھرپور دفاع کیا اور میدان کارزار میں مخالفین کے دانت کھٹے کر دئے اور تمہاری نصرت و مدد کی بنا پر رسولؐ اسلام طاقتور ہوئے اور دشمن زیر ہوئے۔ پھر جب آنحضرتؐ دنیا سے گئے تو تم سے راضی و خوشنود تھے انکی آنکھیں تمہاری وجہ سے روشن تھیں لہٰذا حکومت کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لو کیونکہ تم سے زیادہ اس کا سزاوار کوئی نہیں ہے۔ [1]

اگر یہ لوگ اسلام و مسلمانوں کے مصالح کو پیش نظر رکھتے اور یہ سوچتے کہ رسولؐ کی رسالت مستمر رہے تو اس قسم کے فخر و مباہات

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۵

پیش کرنے کے بجائے یہ دیکھتے کہ اصل مبانی شریعت اور ملاک شریعت پر کون سب سے زیادہ مسلط ہے۔ دین سے سب سے زیادہ آگاہی کس کو ہے، اسلامی معاشرے کی تمام ذمہ داریوں کو کون سنبھال سکتا ہے۔ گناہ اور اخلاقی آلودگیوں سے کون مبرا و منزہ ہے، جس کے اندر یہ تمام خصوصیات پائے جاتے اس کو منتخب کرتے، انکی اطاعت و فرمانبرداری کرتے ـــــ لیکن انکی گفتگو اور استدلال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حکومت چاہتے تھے۔ اسی لئے انصار اپنی دولت اور کثرت تعداد کو دوسروں کے مقابلے میں پیش کرتے تھے۔

انکی نظر میں سب سے بڑا طرۂ امتیاز مالداری اور عددی کثرت تھی اور چونکہ یہ لوگ خود معصوم نہیں تھے اس لئے حکومت بھی کسی معصوم کے سپرد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ ابوبکر نے خود اعتراف کیا کہ مجھے بہت سے لوگوں پر علمی و معنوی برتری حاصل نہیں ہے۔ اور نہ میں معصوم ہوں، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

اے لوگو! اس کا امکان ہے کہ مجھ سے غلطی ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اشتباہ نہ ہو لہٰذا اگر دیکھو کہ میں صراط مستقیم سے بھٹک گیا ہوں تو مجھے سیدھے راستہ تک پہونچا دو کیونکہ رسول تو معصوم تھے مگر میں معصوم نہیں ہوں۔ مجھے ایک شیطان بہکاتا رہتا ہے۔ [1]

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۳۱۱، نہایہ ج ۲ ص ۲۶۳، کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۲۴، تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۰۶

حضرت عمر نے بھی ابن عباس کے سامنے خلافت کے لئے حضرت علیؑ کی برتری کو تسلیم کیا ہے اور ابن عباس سے اسطرح کہا :

: خدا کی قسم اگر تمھارے دوست علیؑ کے ہاتھ میں زمام خلافت آجائے تو وہ لوگوں کو کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کرنے کیلئے مجبور کر دیں گے اور لوگوں کو صراط مستقیم اور راہ روشن پر چلائیں گے ۔ [1]

ابو عبیدہ جراح کو جب معلوم ہوا کہ حضرت علیؑ نے ابوبکر کی بیعت سے انکار کر دیا ہے تو انھوں نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے کہا : اسلامی معاشرہ کی سرپرستی و پیشوائی کو ابوبکر کیلئے چھوڑ دیجئے اگر آپ زندہ رہے تو اس کیلئے آپ سب سے زیادہ لائق ہیں کیونکہ انسانی فضائل، قوی ایمان وسیع عقل، صحیح فکر، سابق الاسلام ہونے اور رسولؐ خدا کی آپ سے قربت سب ہی پر روشن ہے ۔ [2]

حضرت علیؑ نے مہاجرین سے خطاب کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ امت اسلامی کے ادارہ کیلئے جو خصوصیات بہت ضروری ہیں وہ مجھ میں ہیں چنانچہ آپ اصل عبارت کا ترجمہ پڑھئے :

: اے گروہ مہاجرین جس حکومت کی بنیاد پیغمبر اسلام نے رکھی ہے اسکو انکے خاندان سے نہ نکالو اور اپنے گھروں میں نہ لے جاؤ خدا کی قسم ہم اہلبیت پیغمبرؐ اس کیلئے سب سے زیادہ مستحق ہیں ۔ ہمارے درمیان

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۱۱

[2] احتجاج طبرسی ج ۱ ص ۹۶

میں ایسے لوگ ہیں جو مفاہیم قرآن پر احاطۂ کامل رکھتے ہیں دین کے اصول وفروع سے بخوبی واقف ہیں رسولِ خدا کی سنت سے مکمل اطلاع رکھتے ہیں اور اسلامی معاشرے کی سربراہی سے بہت عمدہ طریقے سے عہدہ برآری کر سکتے ہیں یہی حضرات مفاسد کو پھیلنے سے روک سکتے ہیں اور عدل و انصاف کے ساتھ مالِ غنیمت کو مسلمانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اور جب تک اسلامی معاشرہ میں ایسا شخص ہے دوسرے کا نمبر نہیں آسکتا اور ایسا شخص صرف خاندانِ رسولؐ ہی میں ہے خبردار اپنے خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ تباہی وگمراہی کے گڑھے میں گر جاؤ گے اور حق وحقیقت سے دور ہو جاؤ گے۔ [1]

حضرت علیؑ نے خود ابوبکر سے ایک مرتبہ گفتگو کے دوران پوچھا :لوگوں کے پیشوا میں کون کون سی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے؟ ابوبکر نے کہا : لوگوں کا خیر خواہ ہو، معاہدوں کا پابند ہو، انصاف ور ہو، خوش رفتاری سے پیش آنے والا ہو، قرآن وسنت کا عالم ہو، اصول تفاوت سے واقف ہو، فریب کار نہ ہو، دنیا کا لالچی نہ ہو، مظلوموں کا فریاد رس ہو، سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہو، اتنا کہہ کر ابوبکر چپ ہو گئے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا : دیگر خصوصیات یہ ہیں : سب سے پہلے ایمان لایا ہو، رسولِ خدا کا قریبی رشتہ دار ہو، ابوبکر نے کہا ہاں رسولِ خدا کی قرابت اور سابق الاسلام ہونا بھی شرائط میں ہے حضرت علیؑ نے

---

[1] احتجاج طبرسی ج ۱ ص ۹۰

کہا : تم کو خدا کی قسم یہ شرائط تم اپنے میں پاتے ہو یا مجھ میں ؟ ابوبکر نے
کہا : یہ سب تو آپ میں جمع ہیں ۔ ۱

رسولخدا کے انتقال کے وقت ابوذرؓ مدینہ میں تشریف نہیں رکھتے تھے جب واپس مدینہ آئے تو ابوبکر کی حکومت ہو چکی تھی ابوذر نے کہا : تم لوگوں نے بہت تھوڑی سی چیز پر اکتفا کر لی اور خاندان رسول سے ہاتھ دھو بیٹھے اگر حکومت اہلبیت رسول کے سپرد کی ہوتی تو دو آدمیوں میں بھی اختلاف نہ ہوتا ۔ ۲

مقداد بن عمرو کے بارے میں راوی کہتا ہے : ایک دن میں مسجد رسولؐ گیا دیکھا ایک شخص زمین پر دو زانو بیٹھا اس طرح آہ و فغاں کر رہا ہے جیسے پوری دنیا اس کے ہاتھ سے چلی گئی ہو وہ اسی حال میں کہہ رہا تھا :
تعجب ہے قریش خلافت کو خاندان رسالت سے اچک لے گئے ۳

سلمان فارسی ابوبکر کے مسئلہ میں صحابہ سے کہا کرتے تھے :
تم لوگوں نے ایک بوڑھے کو تو تخت خلافت پر بٹھا دیا مگر خاندان رسولؐ سے ہاتھ دھو بیٹھے اگر خلافت خاندان رسولؐ میں ہوتی تو دو آدمی بھی اختلاف نہ کرتے ۔ اور عمدہ و خوشگوار پھل درخت سے حاصل کرتے ۔ ۴

---

۱ تاریخ طبری ج ۱ ص ۱۵۹

۲ ابن ابی الحدید ج ۶ ص ۵

۳ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۴

۴ ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۳۱ ، اور ج ۶ ص ۱۷

سیاست علیؑ کو ملنی چاہیے تھی دوسروں کے حوالے کردی گئی ۔۔افسوس

! ! !

●

یہ عجیب بات ہے کہ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے قریش کا رابطہ بنی ہاشم سے بنیادی طور پر مودت و محبت والا نہیں تھا انتہا یہ ہے کہ خود رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں بھی اس مخالفت کا اظہار ہو جاتا تھا، قریش والے کبھی کبھی بنی ہاشم کی عیب جوئی و بدگوئی اس طرح کرتے تھے کہ رسولِ اکرمؐ کبیدہ خاطر ہو جاتے تھے۔ [1]

اور چونکہ قریش بنی ہاشم کی خلافت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح خلافت بنی ہاشم میں جانے نہ پائے۔ [2]

یعقوبی اپنی تاریخ میں لکھتا ہے: عمر نے ابن عباس سے کہا: خدا کی قسم تمہارے چچازاد بھائی علیؑ ہر شخص سے زیادہ خلافت کا استحقاق رکھتے ہیں لیکن قریش علیؑ کو اس مقام پر دیکھنا نہیں چاہتے اور نہ ان کو برداشت کرنا چاہتے ہیں۔ [3]

ابن اثیر نے بھی اس بات کو اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ [4]

---

[1] ینابیع المودة ص ۱۵۶، ص ۱۵۷، ص ۲۴۳

[2] ینابیع المودة ص ۲۷۳، ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۲۷۳

[3] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۳۷ [4] کامل ج ۳ ص ۲۴ و ص ۲۵

بیان کیا جاتا ہے کہ ابن مسطح ایک دن گھر سے باہر آئے اور قبرِ رسولؐ کے پاس جاکر چند اشعار پڑھے ۔

قَدْ كَانَ بَعْدَكَ أَنْبَاءٌ وَهَنْبَثَةٌ ❊ لَوْ كُنْتَ شَاهِدَهَا لَمْ تَكْثُرِ الْخُطَبُ
إِنَّا فَقَدْنَاكَ فَقْدَ الْأَرْضِ وَابِلَهَا ❊ فَاخْتَلَّ قَوْمُكَ فَاشْهَدْهُمْ فَقَدْ نَكَبُوا

اے رسولؐ آپ کے بعد بڑی بحثیں ہوئیں بڑے اہم حادثات ہو گئے اگر آپ ہمارے درمیان موجود ہوتے تو یہ مشکلات پیش نہ آتیں آپ کا ہمارے درمیان سے جانا ایسا ہی ہے جیسے زمین پر بارش نہ ہونے کی وجہ سے اسکی تراوٹ ختم ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارے امور مختل ہو گئے ہیں ۔ اے رسولؐ انکو دیکھئے اور گواہ رہئے ۔ [1]

•

جی ہاں وہ علیؑ جو عظیم شخصیت کے مالک تھے، عظیم تقویٰ پر فائز تھے، جو واقعی اسلامی حکومت کے بہترین حاکم بن سکتے تھے خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں ۔ : پروردگارا تو گواہ ہے کہ میں خلافت کو دولتمند بننے یا حکومت کرنے کی غرض سے نہیں چاہتا بلکہ میرا مقصد صرف شعائر دینی کا قیام اور امور مسلمین کی اصلاح ہے تاکہ مظلوم آرام کی نیند سو سکے اور بھولے ہوئے حدود و احکام الٰہی کا اجرا ہو سکے ۔ [2]

۱ـ ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۳۱ اور ج ۶ ص ۴۳

۲ـ احتجاج طبرسی ج ۱ ص ۲۵۳

دیکھئے اصولی بات تو یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرہ میں ایک معصوم اور معارف باطنی میں بے مثال شخص موجود ہو اور رسول نے اسکو اپنا وصی و جانشین بنایا ہو تو اسکے ہوتے ہوئے حاکم کے انتخاب کیلئے شوریٰ تشکیل دینا بے معنی سی بات ہے۔ جس طرح رسولخدا کے زمانہ میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رسالت کی ذمہ داری کسی اور کے سپرد کی جا سکتی ہے، یا شوریٰ اور انتخاب کے ذریعہ کسی کو رسول بنایا جا سکتا ہے یا کسی دوسرے کے سپرد حکومت کی جا سکتی ہے۔ بلکہ رسول کے ہوتے ہوئے اور کسی کے قیادت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

رسول کے بعد صورت حال بالکل ایسی ہی تھی کیونکہ جب رسول کا ایسا وصی موجود ہے جو احکام الٰہی کا اتنا بڑا جاننے والا ہے کہ تمام اصحاب میں کوئی اسکے ہم پلہ ہے ہی نہیں اور وہ معصوم بھی ہے تو پھر کسی اور کے تلاش کی کیا ضرورت ہے؟ چونکہ حکومت منجملہ امور امامت ہے اسلئے امام معصوم کے ہوتے ہوئے دوسرے میں حکومت کی صلاحیت کا تلاش کرنا کار عبث ہے۔ جس طرح آنحضرت کی زندگی میں امت مسلمہ کے امور کا ادارہ صرف آنحضرت ہی سے مربوط تھا اسی طرح حضرت علیؑ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا امامت کا دعویدار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

مشہور سنی عالم ابن ابی الحدید تحریر کرتے ہیں:

: ہم حضرت رسول و حضرت علیؑ کے درمیان سوائے مرتبۂ نبوت و حصول وحی کسی اور فرق کے قائل نہیں ہیں کیونکہ نبوت و وحی حضرت رسول کے ساتھ مخصوص ہے اسکے علاوہ تمام فضائل میں

رسولؐ و علیؑ مشترک تھے۔ [1]

ایک دوسرے بڑے سنی عالم جناب شیخ سلیمان حنفی عبداللہ بن عمر بن خطاب سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ کہتے تھے :

: ہملوگ جب صحابہ رسولؐ کا ذکر کرتے تھے تو سب سے پہلے بلند مرتبہ ابوبکر پھر عمر اسکے بعد عثمان کا ذکر کرتے تھے ایک شخص نے ان سے پوچھا پھر علیؑ کس منزل پر تھے؟ عبداللہ نے کہا : علیؑ کا قیاس اصحاب پر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اصحاب کی فہرست میں نہیں آتے انکا شمار خاندان نبوت میں ہے۔ وہ رسولؐ کے برادر اور برابر شمار کئے جاتے ہیں۔ [2]

اگر مہاجرین کی دلیل تسلیم کر لی جائے جب بھی اولویت حضرت علیؑ کو تھی کیونکہ ایسی ناساز گار فضا میں جب خود رسولؐ کے قریب ترین لوگ انکی رسالت کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے حضرت علیؑ سب سے پہلے ایمان لائے۔ اور کوئی انکے برابر نہیں پہونچ سکا۔ اسی طرح رسولؐ خدا سے سب سے زیادہ مضبوط رشتہ داری حضرت علیؑ کی تھی۔ حضرت علیؑ نے تو رسولؐ ہی کے گھر آنکھ کھولی اور براہ راست آنحضرتؐ کے زیر تربیت رہے۔ اور اسلام ان کی گھٹی میں پلایا گیا تھا آپ رسولؐ کے چچا زاد بھائی ہونے کے ساتھ داماد بھی تھے اور ہمیشہ دشمنان اسلام سے برسرپیکار رہے تھے ایسی صورت میں حضرت علیؑ سے زیادہ حکومت کا کون لائق و سزاوار تھا؟ جو

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۴ صفحہ ۵۲۰

[2] ینابیع المودۃ صفحہ ۲۵۳

رسولخدا قریش کی رفتار سے اندازہ لگاکر اپنے خاندان کیلئے پیشگوئی فرما گئے تھے:

میرے بعد میرے اہلبیتؑ امت کے ہاتھوں سے قتل کئے جائینگے اور بہت مصائب برداشت کرینگے۔ [1]

ایک مرتبہ بڑے تاسف کے عالم میں حضرت علیؑ سے آنحضرتؐ نے فرمایا:
لوگوں کے دلوں میں تمھارے لئے کینہ ہے جسکو وہ لوگ میرے مرنے کے بعد ظاہر کریں گے۔ [2]

انھیں چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ رسولخدا کے بعد قریش "مہاجرین" نے اصحاب رسولؐ کے ساتھ مل کر اپنے پرانے کینوں کا انتقام لیا ہے۔

اور قریش کے اس منفی پہلو کا ڈانڈا آغاز دعوت اسلام سے ملتا ہے کیونکہ آنحضرتؐ نے ابتدا میں جب اعلان فرمایا تو آنحضرتؐ کی امانت وصداقت کو جانتے ہوئے بھی قریش نے ایمان لانے سے احتراز کیا۔ قریش یہ سوچتے تھے کہ اگر ہم نے محمدؐ کی رسالت کا اقرار کر لیا تو خاندان بنی ہاشم کو قریش کے تمام خانوادوں پر برتری حاصل ہو جائے گی اور یہی حسد تھا جو ان کو اسلام لانے سے روکتا رہا۔ اور انھوں نے رسولخدا کے مقابلہ میں سخت موقف اختیار کر لیا تھا۔ انتہا یہ کر دی کہ پورے خاندان کو شعب ابوطالب

---

[1] ینابیع المودۃ ص۱۳۰
[2] کنز العمال ج۶ ص۴۰۸ کتاب الفضائل

میں محصور کر دیا۔ ہر قسم کی تکلیف و مصیبت ان کے حق میں روا رکھی۔ اور پھر رسولؐ کے قتل کا پروگرام بنا ڈالا اور اتنا پریشان کیا کہ آنحضرتؐ کو شہر و دیار و خاندان چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔

اس پر بھی سکون نہیں لیا فوجی چڑھائی شروع کر دی اور اپنا پورا زور رسولؐ خدا اور ان کے پیروکاروں کے نابود کرنے پر لگا دیا۔

ان تمام شدائد و مقابلوں میں حضرت علیؑ رسولؐ خدا کے دست راست بنے رہے اور میدان کارزار اور جنگ میں قریش کے بڑے بڑے سرداروں، بہادروں، کینہ توزوں کو تہ تیغ کیا۔ اسلئے قریش اپنے بزرگوں جوانوں، بھائیوں، کے خون کا ذمہ دار علیؑ کو سمجھتے تھے۔ اگرچہ فتح مکہ کے بعد رسولؐ پر کامیاب ہونے کی امید سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے اور فوجی مقابلوں کی طاقت کھو بیٹھے تھے ــــــ مگر عمومی طور سے خاندانِ بنی ہاشم سے انتقامی جذبہ اور کینہ پروری کا جذبہ اور خصوصاً حضرت علیؑ سے یہ تو ان کے دلوں میں بہر حال موجزن تھا۔ بلکہ دل کی چنگاریاں کبھی خاموش ہی نہیں ہوئی تھیں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

کینہ اور مکر میں جو قریش کے دلوں میں رسولؐ کی طرف سے پوشیدہ طور پر پڑی ہوئی تھیں میرے سلسلہ میں ظاہر ہو گئیں بلکہ یہ کینہ پروری میرے بعد میرے بچوں کے ساتھ بھی کی جائے گی۔ مجھے قریش سے کوئی واسطہ نہیں ہے اگر میں نے ان سے جنگیں لڑی ہیں تو حکم خدا و حکم رسولؐ کے مطابق لڑی ہیں۔ (ینابیع المودۃ ص ۱۲۶، ص ۲۵۳)

موجودہ صفحہ خالی ہے

اگلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں

Presented By:

www.zad-e-rah.com

مقداد بن اسود جو خلافت صرف حضرت علیؑ کا حق سمجھتے تھے جب انھوں نے دیکھا کہ قریش ایسی چیز کے مدعی ہیں جو ان کا حق نہیں ہے تو ان کو غصہ آگیا اور اسی غصہ کی حالت میں فرماتے ہیں :

قریش پر سخت تعجب ہے خلافت کو خاندان رسالت سے چھین لیا۔ خدا کی قسم یہ کام خدا کی مرضی حاصل کرنے کیلئے ہرگز نہیں ہوا ہے بلکہ یہ تو دنیا طلبی کے لئے اور آخرت کو بھول جانے کی وجہ سے ہے۔ [1]

انھیں مقداد نے عبدالرحمٰن بن عوف، جنھوں نے عثمان کی بیعت کی طرف لوگوں کو ابھارا، سے کہا : خدا کی قسم جو شخص امر بمعروف کرنے والوں میں اور حق و عدالت کے مطابق کام کرنیوالوں میں تھا تم نے اس کو کنارے کر دیا۔ خدا کی قسم اگر قریش کے مقابلے کے لئے میرے پاس لوگ ہوتے تو بدر و احد کی طرح جنگ کرتا۔ عبدالرحمٰن نے کہا : یہ گفتگو تفرقہ اندازی ہے۔ مقداد نے کہا جو شخص حق اور اہل حق اور والیان امر کی طرف دعوت دے وہ فتنہ انگیز نہیں ہوتا۔ فتنہ انگیز اور تفرقہ اندازی کرنیوالا وہ شخص ہوتا ہے جو لوگوں کو باطل کی طرف لے جائے اور خواہشات نفس کو حق و حقیقت پر مقدم کرتا ہو۔ [2]

یہ مقداد وہی خالص مسلمان ہیں جنکا زہد، تقویٰ، اسلام سے دلچسپی

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۷

[2] ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۳ ۔ ص ۱۲ م

بہت ہی مشہور ہے۔

ترمذی نے اپنی سنن میں لکھا ہے کہ رسولِ اسلام نے فرمایا:

: ہر پیغمبر کو سات مخلص و خلاصہ ترین مردم اشخاص دئیے گئے ہیں اور مجھے چودہ ایسے ملے جن میں سے مقداد و عمار کو شمار کرایا۔ [1]

ان تمام حالات کے باوجود حکومت اسلامی آخر کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو کسی بھی طرح معصوم نہ تھے اور پھر رفتہ رفتہ خلافت آزاد فضا سے نکل کر ایک ایسے محیط میں پہنچ گئی جہاں نہ تقویٰ تھا نہ روح برادری نہ مساوات تھی بلکہ پورے کا پورا ماحول فاسد تھا اور بنی امیہ و بنی عباس کے زمانہ میں اسلامی دنیا اپنا معنوی و دینی سرمایہ بھی کھو بیٹھی۔

جب خلافت عثمان تک پہونچی تو سارے بنی امیہ عثمان کے گھر جمع ہوئے اور ابوسفیان نے مجمع کی طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا:

: تم میں کوئی بیگانہ تو نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا نہیں! تب اس نے کہا اے امیہ کی اولاد خلافت کو گیند کی طرح بنی ہاشم کے ہاتھ سے اچک لو کیونکہ نہ حساب ہے نہ عذاب نہ جہنم ہے نہ بہشت نہ روز جزا ہے نہ روز قیامت۔ [2]

عثمان نے ابوسفیان کو ایسی گفتگو کرنے سے روکا۔ اس وقت ابوسفیان نابینا ہو چکا تھا ابوسفیان ایک شخص کے ساتھ جناب حمزہؓ کی قبر کی طرف چلا

---

[1] سنن ترمذی ج ۵ ص ۳۲۹

[2] شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۱۳۶

تاکہ اپنے دل کی بھڑاس نکالے جب قبر حمزہؑ کے پاس پہونچا تو حمزہؑ سے خطاب کرکے بولا: اے ابو عمارہ جس حکومت کو ہم نے بزور شمشیر حاصل کیا ہے آج وہ ہمارے غلاموں کے ہاتھ کا کھلونا ہے یہ کہہ کر ایک لات جناب حمزہؑ کی قبر پر ماری۔ [1]

ایک شخص حضرت علیؑ سے سقیفہ کا ماجرا اور مہاجرین و انصار کی گفتگو نقل کر رہا تھا تو حضرت علیؑ نے اس سے پوچھا: قریش نے اپنی کس خصوصیت کی بنا پر اپنے کو خلافت کے لائق بتایا تھا؟ اس شخص نے کہا: ان لوگوں نے رسولؐ کی رشتہ داری سے استدلال کیا تھا اور کہا تھا ہم شجرہ رسولؐ ہیں! حضرت علیؑ نے فرمایا: ان لوگوں نے درخت سے تو استدلال کیا مگر پھلوں کو ضائع و برباد کر دیا اگر وہ لوگ ایک درخت کی شاخ ہونے کے اعتبار سے سزاوار خلافت ہیں تو میں اسی درخت کا میوہ رسولؐ کا چچازاد بھائی ہوں اس میں ان لوگوں نے مجھ سے کیوں جنگ کی؟ آخر خلافت میرا حق کیوں نہیں ہے؟ [2]

ایک جگہ پر حضرت علیؑ فرماتے ہیں: یقیناً تم لوگ میری قرابت، رشتہ داری اور رسولؐ خدا کے نزدیک میری منزلت سے بخوبی واقف ہو جب میں بچہ تھا تو اپنے گھر میں میری پرورش فرماتے تھے مجھے اپنی آغوش تربیت میں لیتے تھے میں نے جسم رسولؐ کو لمس کیا ہے، انکے جسم کی

---

[1] "امام علیؑ" عبد الفتاح عبد المقصود ج ۱ ص ۲۸۷

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۶۳

خوشبو کو سونگھتا ہے۔ آنحضرتؐ اپنے ہاتھ سے مجھے کھانا کھلاتے تھے۔ نہ کبھی مجھ سے جھوٹ بات سنی نہ مجھ سے کبھی مکاری و نفاق کو دیکھا میں اس طرح انکی پیروی کرتا تھا کہ ہر معاملہ میں انکے قدم بہ قدم رہتا تھا۔ ہر روز اپنے اخلاق و فضائل کا کوئی نہ کوئی نمونہ میرے سامنے پیش فرماتے تھے اور مجھے بلند مرتبہ عطا کرتے تھے۔ ہر سال مجھے اپنے ساتھ کوہ حرا میں لے جاتے تھے اور بہت سے حقائق مجھ پر روشن فرماتے تھے اس وقت رسولؐ کے گھر کے علاوہ کوئی گھر مسلمان نہیں تھا اور رسولؐ و جناب خدیجہ کے بعد میں تیسرا مسلمان تھا۔ وحی الٰہی کے نور کا مشاہدہ کرتا تھا، بوئے نبوت کا استشمام کرتا تھا۔[1]

●

رسولؐ اسلام حکومت و امامت کو ارادہ الٰہی سے مربوط سمجھتے تھے اور اس سلسلہ میں اپنے کو بھی صاحب اختیار نہیں سمجھتے تھے کچھ لوگ حکمرانی کو مستحکم کرنے کیلئے اپنی طرف سے فرضی اولویت تلاش کرتے ہیں اور اس کو اپنے ذہن میں نقش کر لیتے ہیں اور اس بے قیمت اسناد پر بھروسہ کر لیتے ہیں اور خلافت و جانشینی رسولؐ کو قومی کر دیتے ہیں بے بنیاد منزلتوں کے سہارے طے کرتے ہیں۔

محمد بن مسلم زہری کہتے تھے: جس وقت رسولؐ اسلام نے "بنی عامر" کا سہارا لیکر لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو ایک

---

[1] ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۲۳۳

شخص جس کا نام "بیجرہ" تھا اس نے کہا :
: خدا کی قسم اگر یہ جوان میرے ساتھ ہو تو اسکے زیر سایہ میں پوری عرب قوم پر غلبہ حاصل کر لوں اس کے بعد محمدؐ سے کہا : اگر میں آپ کے تمام قوانین کو مان لوں اور میری مدد سے آپ اپنے تمام دشمنوں پر غالب آجائیں اور حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں آجائے تو کیا آپ مجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ اپنے بعد حکومت و سلطنت میرے حوالہ کر دیں گے رسولخدا نے فرمایا :

: حکومت کا معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے
جس کو وہ چاہے گا یہ منصب عطا کرے گا

اس نے کہا : کیا ہم اپنے سینوں کو آپ کے لیے اس لیے سپر بنائیں کہ جب آپ کامیاب ہو جائیں تو حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں چلی جائے ؟

ایک سوال کا جواب

سوال : بعض حضرات کا خیال ہے کہ اگر حکومت عوامی ہو یعنی معاشرے کے افراد خود ہی اچھے لوگوں میں سے اپنا ایک قائد و رہبر منتخب کر لیں اور اپنی عقلوں، معلومات، ارادوں کو استعمال کر کے اجتماعی شخصیتوں میں سے کسی ایک کو چن لیں تو یہ بات اصول جمہوریت کے بھی مطابق ہے اور اس طرح وہ اپنی آزادی کی تمناؤں سے ہمکنار بھی ہو سکتے ہیں اور اپنی امیدوں، ماحول ثقافت کے اعتبار سے اصول و قوانین بھی معاشرے کیلئے وضع کر سکتے ہیں اور اس طرح حکومت کی ریڑھ کی ہڈی بھی ثابت ہو سکتے ہیں ــــ لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے اور قائد و رہبر کے انتخاب میں ان سے کوئی رائے و مشورہ تک نہ لیا جائے اور رسولؐ کا خلیفہ انکے اوپر حاکم کے عنوان سے معین کر دیا جائے تو عوام اسکی طرف ایسے ہی دیکھیں گے جیسے کسی ظالم و مستبد حاکم کی طرف دیکھا کرتے ہیں وہ جو چاہے من مانی کرے عوام چوں بھی نہیں کر سکتی ۔

جواب : درحقیقت یہ تصور اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ امام بطور حاکم مطلق اور مطلق العنان کی حیثیت سے ہوتا ہے حالانکہ دنیا

کے اندر مطلق العنان حاکم فوجی انقلاب، یا داخلی انقلاب یا کسی دوسری اجنبی حکومت کے اشارہ پر ہوا کرتا ہے اور ڈکٹیٹر شپ میں صرف ڈکٹیٹر کی رائے آخری و حتمی ہوتی ہے۔

لیکن جو لوگ نظام امامت کے قائل ہیں، انکے یہاں پہلے ہی سے کچھ اصول و قواعد و شرائط معین و مسلم ہیں جس شخص کے اندر وہ شرائط ہوں گے اسی کو امام بنایا جاسکتا ہے اور اگر کسی کے اندر وہ شرائط نہیں ہیں تو وہ قیامت تک اسلامی حکومت کا امام نہیں بنایا جاسکتا۔ امام کے معین و منصوب ہونیکا مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان کی علی الاطلاق معرفت رکھتا ہے اسکے ماحول و معاشرے کو جانتا ہے وہ مسلمانوں کی قیادت کے لئے کسی اچھے ہی شخص کو معین و منصوب کرے گا۔ اس کے اندر معرفت تامہ ہوگی وہ معصوم ہوگا۔ تاکہ اسکی زندگی خواہشات اور دنیاوی شہوات سے متاثر نہ ہوسکے اور ساتھ ہی ساتھ اسکو اصلی شرعی احکام و قوانین کے وضع کرنے کا بھی حق نہ ہوگا۔ بلکہ چونکہ اسلامی نظریہ ہے کہ واضع قانون درحقیقت خدا ہے لہٰذا امام انھیں اوامر و نواہی کی پابندی کرے گا جو خدا کی طرف سے رسولِ خدا پر نازل ہوئے ہیں وہ مدرسۂ وحی الٰہی سے ہٹ کر اپنا کوئی پروگرام بھی نہیں بنا سکتا۔ بلکہ اسکا کام صرف اتنا ہے کہ اپنی تکلیف شرعی کے مطابق احکام اسلامی کا نفاذ کرے۔

اور جب خدا قانون بنانے والا ہے تو ظاہر ہے وہ شرعی قوانین انسان کے حقیقی مصالح پر مشتمل ہوں گے یعنی ایک طرف تو وہ فطرت انسانی کے مطابق ہو سکے اور دوسری طرف انسانی زندگی میں بطور عموم

مشتمل بر عدالت ہونگے اور تیسری طرف سے انسانی تربیت کیلئے صالح زمین تیار کرنے والے ہوں گے تاکہ وہ مدارج کمال پر آسانی سے پہونچ سکے۔

اور جب حاکم خدا کی طرف سے مختار ہوگا اور حاکم مطلق ہوگا ـــــ ۔تو قطعی طور سے معصوم بھی ہوگا ـــ تو سوائے لوگوں کی ہدایت و مصلحت و نیک بختی کے کچھ اور ان کے بارے میں سوچے ہی گا نہیں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں کوشش کرے گا جو مبنی بر عدالت ہوگا۔ اسکی حکومت میں کسی پر بھی کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائیگا۔

لوگوں کے خود انتخاب کرنے میں جو شرائط و حد بندی دین الٰہی کی طرف سے عائد ہوتی ہے وہ لوگوں کی حاکمیت کے مخالف نہیں ہے کیونکہ معاشرے نے خود ہی اس دینی انظام کو اپنی مکمل آزادی رای سے قبول کیا ہے۔ اور اسکو دل سے پسند کر لیا ہے۔ اور محدودیت و حد بندی بہر حال ضروری ہے کیونکہ قومی حکومت بھی تو جن چیزوں کو ضروری سمجھے گی نافذ کرے گی۔ قوم اصل دین کو قبول کرنے کے بعد اپنی حاکمیت اسی دین کے دائرہ ہی میں رکھے گی۔

ان سب باتوں کے علاوہ جمہوریت جو اکثریت کی رای سے وجود میں آتی ہے اس میں بھی رئیس جمہور انھیں باتوں کے اجراء کی کوشش کرتا ہے۔ جو پبلک کی عمومی رای ہو اور پبلک کا مطالبہ ہو۔ رئیس جمہور کو اسکی فکر نہیں ہوتی کہ عوامی مطالبہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ لوگوں کی خواہشات اپنے ماحول، زمان، و مکان و آس پاس کے نظریات سے متاثر ہوتی ہیں۔

اور ان چیزوں کا حتمی طور سے اثر فرد، معاشرہ و تاریخ پر ہوتا ہے بلکہ رئیس جمہور جس بہترین نظام کو نافذ کرنا چاہے وہ بھی ان چیزوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

جمہوری نظام میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ حاکم اپنے ووٹروں کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ یعنی وہی کام کرے جو عوام چاہتی ہے خواہ عدل و انصاف کے موافق ہو یا مخالف۔ حاکم کی بھرپور کوشش یہ ہوتی ہے کہ پبلک کی نظر میں اس کا مقام باقی رہے اور اس سلسلہ میں اسکو اپنا ذاتی نظریہ بھی کبھی پامال کر دینا پڑتا ہے بلکہ حقائق سے چشم پوشی بھی کرنی پڑجاتی ہے تاکہ اسکی کرسی محفوظ رہے اور ایسے لوگ تو بہت ہی کم ہیں جو رای عامہ کی کوئی پروا نہ کریں بلکہ جو چیز امت مسلمہ کے لئے مفید ہو وہی کریں چاہے اس میں ان کا پورا سیاسی کیریر ہی برباد ہو جائے اور پوری رای عامہ انکے مخالف ہو جائے۔

ایک مشہور سیاسی رائٹر فرانک کینٹ۔

لکھتا ہے: کثرت رای کا حاصل کرنا بہت ہی اہم موضوع ہے اس مقصد کے حصول کیلئے بے معنی و خود ساختہ چیزوں سے مثلاً "اخلاق" یا "حق و باطل" جیسی چیزوں سے کو اپنی راہ کا روڑا نہیں بننے دینا چاہئے۔ ۱؎

آج کی آزاد دنیا کا یہی طریقۂ انتخاب ہے جہاں حق و حقیقت کو تماشہ

۱؎ سیمائے شجاعان ص۳۵

بنادیا جاتا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ اسی طرح کی بدعنوانیوں کے ساتھ رسُولِ اسلام کا بھی جانشین چنا جائے؟ اور ایسے منتخب شدہ خلیفہ کے ہاتھ میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ دیدیا جائے؟ مثلاً مسلمانوں کا ایک گروہ مجمع میں آکر اپنے معیار سے ایک شخص کو منتخب کر کے مسلمانوں کی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے۔

بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص جو اسلامی ثقافت سے ناآشنا ہو دین کے اصول ومبانی سے بیگانہ ہو احکام شرعی کے فروع سے ناواقف ہو وہ منتخب ہوتے ہی ایک ایسے معاشرے کی سرپرستی کرنے لگے جو صدر صد اسلامی ہو اور کیا ایسا شخص دقت وامانت کے ساتھ احکام الٰہی کو بیان کرسکتا ہے؟ اگر کوئی نیا واقعہ درپیش ہو جائے تو وہ کس علمی سرمایہ اور معارف الٰہی کی بنیاد پر اصول اسلام کے مطابق اس کا مناسب حل پیش کر پائیگا؟ جس کا وجود پہلے سے تھا ہی نہیں کہ اسکو اسکا حکم معلوم ہوتا۔ وہ شریعت کے احکام کلی سے کس طرح استفادہ کر کے حکم دے سکتا ہے؟ اسکے بھی علاوہ جہاں حکومتوں کا دارومدار عوامی ووٹ پر ہے وہاں اقلیت کے افکار کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ مثلاً سو میں اکیاون فیصد ووٹ ایک کو اور انچاس فیصد دوسرے کو ملے تو ۴۹ فیصد لوگوں کی رای قابل اعتنا نہیں ہے حالانکہ وہ صرف دو فیصد اکثریت سے کم ہیں۔ لیکن ان کو اکثریت کی رای بہر حال ماننی پڑے گی۔

انسانوں کے ایک عظیم گروہ کے افکار سے یہ روگردانی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ ایسی حکومت اصول عدالت کے منافی ہے۔ آخر اس پر

کیا دلیل ہے کہ جو دو فیصد اکثریت والی جماعت جو برسر حکومت آئی ہے وہ آدھے کے قریب لوگوں پر اپنے نظریات لاد دے اور اس کی آزادی کو سلب کردے اور جو قانون چاہے پاس کردے۔ آپ لاکھ کہیے اکثریت میں اجتماعی منافع ہے اور انکا اصول ایک اصلاحی اصول ہے پھر بھی نہ اسکا نفاذ صحیح ہے اور نہ شرعاً اسکی بات التزامی ہے۔

آخر اتنی بڑی اقلیت کیوں اکثریت کے سامنے سر تسلیم خم کردے! اور انکی اطاعت و پیروی پر کیوں مجبور ہو؟ اکثریت جو بھی قانون بناتی ہے تمام لوگوں پر اسکی تعمیل ضروری ہوتی ہے حالانکہ صد در صد ممکن ہے کہ اکثریت جو قانون بنائے اسمیں کوئی ایسا جذبہ کارفرما ہو جو معاشرے کے لئے نقصان دہ ہو اور معاشرے کو برباد کرنے کا سبب بن جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق اگر حق ہے تو چاہے اسکے طرفدار کم ہوں وہ باطل نہیں ہو سکتا اور باطل اگر باطل ہے تو اسکے طرفدار چاہے جتنے زیادہ ہوں وہ حق نہیں بن سکتا۔ لوگوں کی اکثریت اگر کسی چیز کی طرف مائل ہے تو اس میلان کی وجہ سے وہ حق نہیں ہو سکتی بلکہ اکثریت کی بات صرف اس لئے مانی جاتی ہے کہ اس میں عیب کم ہے لیکن اکثریت ہر جگہ دلیل حقانیت نہیں ہے۔ اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اکثریت جو بات کہہ رہی ہے وہ اقلیت والوں کی بات سے بہتر ہے۔ اور نہ اکثریت کی وجہ سے وہ چیز ایسی مشروعیت حاصل کر سکتی ہے جس کے سہارے قانون وضع کر کے حیات انسانی کو اس کا تابع بنا دیا جائے۔

کمیونسٹ ممالک جو اس بات کے مدعی ہیں کہ ڈیموکراسی اور کمیونزم کے چاروں چولوں میں فرق ہے جب اسکی تحلیل نہائی کی جائے تو وہ بھی حاکم پارٹی کی حاکمیت مطلقہ کی قائل ہے ———— لیکن جہاں پر انتخاب خدائی ہوتا ہے وہاں حکومت کا مطلب خدا کی حاکمیت مطلقہ ہے جسکو پورا معاشرہ دل و جان سے قبول کرتا ہے اور عقل بھی خدا کی اطاعت کی تائید کرتی ہے۔ اس بات کے علاوہ کہ خدائی قانون پر عمل کو انسان دنیا و آخرت کی سعادت و خوشبختی سمجھتا ہے۔ خدائی حکومت میں اقلیت واکثریت کا کوئی سوال نہیں اٹھتا کیونکہ حکومت خدا کی حکومت ہے اور خدا مبداء کل ہے۔ اور وجود بشر کی علت ہے۔ اس نے انسانوں پر غیر محدود نعمتیں نازل کی ہیں اس لیئے اس کا حق ہے کہ دنیا اسکی اطاعت کرے۔ اور اسی حق کی بنیاد پر اسکے دستور و فرمان کی اطاعت بھی ضروری ہے کیونکہ خدا نے عوامل و سنن طبعی و اجتماعی اور روابط عمومی کی ماہیت سے آگاہی اور انکی کیفیت تنظیم کے ساتھ تمام باتوں کا لحاظ کرکے عادلانہ قوانین بنائے ہیں۔ اور ان قوانین کا مقصد انسان کی خیر و صلاح کے علاوہ کچھ نہیں ہے وہاں اس کا تصور بھی محال ہے کہ خدا نے ذاتی و شخصی مصالح اور منفعت طلبی کے لحاظ سے قانون بنایا ہوگا۔

ایک ایسا معاشرہ جو خدا پر ایمان رکھتا ہو وہ اکثریت کی رای کا محتاج نہیں ہے کیونکہ اکثریت کے یہاں یہ امکان بہر حال پایا جاتا ہے کہ اس کا قانون غلط ہو اور مبنی بر اشتباہ ہو۔ کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے وہ افراد جو معاشرے کیلئے مایۂ ناز ہوتے ہیں اور ساری خیر و برکت

کی امیدیں انھیں سے وابستہ ہوتی ہیں لیکن جب قطعی اکثریت کے یہ وہ لوگ کرسی حکومت پر جلوہ افگن ہوتے ہیں تو تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں کی امیدیں ناامیدی سے اور مہر و محبت عداوت و غصہ سے بدل جاتی ہے۔

اسلئے بڑے اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اکثریت کے وہ نظریات جو اجتماعی تجربوں سے حاصل ہوتے ہیں خطا پذیر ہوتے ہیں۔ اور یہ نظریات انسانی مشکلوں کو حل کرنے اور انسان کے انفرادی اجتماعی عادلانہ زندگی کو منظم کرنے سے عاجز ہیں اور یہ قوانین انسان کی سعادت و صلاح و عدالت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔ بقول علامہ اقبال لاہوری کے

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جسمیں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

۔ مترجم ۔

شیعیت از نظر تاریخ

محققین و علماء مذہب شیعہ کی پیدائش کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں بعض حضرات نے اپنے مسلکی نظریہ و فکری و ذاتی و خصوصی میلان کے اعتبار سے اظہار خیال کیا ہے۔

چنانچہ بعض حضرات کا عقیدہ ہے کہ شیعہ کا وجود رحلت رسول کے بعد سے ہوا ہے اور اس کی بنیاد اس وقت پڑی جب اصحاب رسول جانشین پیغمبرؐ کو معین کرنے کے چکر میں تھے۔ یعقوبی اپنی تاریخ میں تحریر کرتے ہیں مہاجرین و انصار کے ایک گروہ نے ابوبکر کی بیعت سے انکار کیا کہ ان کا رجحان حضرت علیؑ کی طرف تھا۔ جناب عباس بن عبد المطلب، فضل بن عباس، زبیر، خالد بن سعید، مقداد، سلمان فارسی، ابوذر، عمار، براء، ابی بن کعب وغیرہ اسی گروہ کے آدمی تھے۔ [1]

مسعودی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں: سلمان ابتدا ہی سے شیعہ تھے، عمار یاسر پوری زندگی شیعہ مشہور رہے چنانچہ عثمان کے منتخب ہو جانے کے بعد عمار نے کہا:

یہ کتنی مرتبہ ہو چکا ہے کہ لوگوں نے خلافت کو اس کے اہل سے

---

[1] تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۱۲۴

سے لیا ہے۔ اور ابوذر تو تشیع کے بارز نمونہ تھے۔ [1]

دانشمندوں کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ کے زمانہ خلافت میں شیعہ (فرقہ) کا ظہور ہوا ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ عثمان بن عفان کے آخری ایام خلافت میں شیعوں کو مضبوطی حاصل ہوئی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے جو کہتی ہے شیعیت کے بانی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایرانیوں کے سیاسی انتقام کی بنیاد پر تشیع کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ اور ان کا تشیع سیاسی اغراض کی بنا پر ہوا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک خود رو قسم کا عارضی مذہب ہے۔ جس کا کبھی نمود خاص اور ممتاز وجود نہیں تھا بلکہ معاشرتی تحولات اور تاریخ اسلام کے بہت بعد سیاسی اسباب کی بنا پر مرور یہ زمانہ کے ساتھ اسلامی معاشرے میں یہ مذہب پھیلا ہے۔ اور کچھ حضرات کا خیال ہے کہ "عبداللہ بن سبا" نامی ایک موہوم شخصیت نے اس مذہب کی بنیاد رکھی ہے اور یہ گروہ شیعوں کے خیالات کو اسی خیالی شخص عبداللہ بن سبا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ [2]

یہ اور اس قسم کی دوسری تہمتیں جو لگائی جاتی ہیں ان کا مقصد یا تو یہ ہوتا ہے کہ حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈال دیا جائے اور یا پھر یہ بار شیعی

---

[1] مروج الذہب مسعودی

[2] مزید اطلاع کیلئے "عبداللہ بن سبا" نامی کتاب سید مرتضیٰ عسکری کی طرف مراجعہ فرمائیے۔

میراث سے عدم واقفیت کی بنا پر ایسے الزامات لگائے جاتے ہیں ورنہ حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین مصری مشہور سنی دانشمند تحریر کرتے ہیں :

: مورخین کا ابن السوداء عبداللہ بن سبا، اور اسکے پیروکاروں کا جنگ صفین میں ذکر کرنے سے گریز کرنا کم از کم اس بات پر تو بہر حال دلالت کرتا ہے کہ ابن سبا، اور اسکے پیروؤں کا قصہ در اصل بالکل ہی بے بنیاد و جعلی تھا اور یہ ان جعلی چیزوں میں سے ہے کہ جب شیعوں اور دیگر اسلامی فرقوں میں خوب جنگ وجدال و مار پیٹ کی نوبت آگئی تو اسکا وجود فرضی طور پر جعل کر لیا گیا۔ شیعوں کے دشمنوں نے صرف اسی لئے کہ شیعوں کی ہر طرف سے مخالفت ہونے لگے کوشش کر کے انکے اصول مذہب میں ایک یہودی کو داخل کر دیا۔ اگر عبداللہ بن سبا، کا کوئی تاریخی وجود ہوتا یا واقعی اسکی کوئی حقیقت ہوتی تو فطری بات ہے کہ اسکی مکاریوں اور چالاکیوں کا ذکر جنگ صفین میں کہیں تو آتا۔ میں اسکی صرف ایک وجہ جانتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ شیعوں کے دشمنوں نے شیعوں کو نیچا دکھلانے اور ذلیل کرنے کیلئے ایک وہمی شخصیت عبداللہ بن سبا کو ایجاد کیا ہے۔ [1]

بغداد یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر علی الوردی تحریر کرتے ہیں :

: جو شخص اجتماعی اسلام کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے اور اسکے واقعات سے نتیجہ اخذ کرنا چاہتا ہے اسکے نزدیک یہ بات بڑی

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ، علی و بنوہ، ج ۲ ص ۹۰

اہمیت کی حامل ہے کیا واقعی ابن سبا کا کوئی خارجی وجود تھا؟ یا یہ صرف ایک فرضی شخصیت ہے؟ ابن سبا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ شورش کا محرک اصلی یہی تھا وہ ایک فرضی شخصیت ہے اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکو جان بوجھ کر بنایا گیا ہے۔ قریش نے بھی ابتدائے دعوت اسلام میں حضرت رسولؐ پر یہ الزام لگایا تھا کہ محمدؐ کی تمام کی تمام تعلیمات "جبر" نامی ایک مسیحی غلام سے حاصل کردہ ہیں۔ محمدؐ جو بھی کہتے ہیں اسی کی تعلیم کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ ؎۱

ایک دوسرا سنی محقق محمد کرد علی لکھتا ہے :

: صدر اسلام میں صحابہ کی ایک مشہور جماعت جو حضرت علیؑ کی پیرو تھی اس کا نام شیعہ ہوگیا۔ تاریخوں سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض کوتاہ فکر حضرات مذہب شیعہ کو عبداللہ بن سبا معروف با بن السوداء کا ایجاد کردہ مذہب کہتے ہیں۔ لیکن بغیر کسی شک و تردید کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ بات خرافات میں سے ہے۔ کیونکہ عبداللہ ابن سبا نامی یہودی کا وجود صرف عالم وہم وخیال میں ہے۔ مذہب شیعہ کی طرف اس قسم کی بیہودہ بات کی نسبت اصول مذہب شیعہ کی عدم واقفیت کی بنا پر ہے۔ ؎۲

ان مختلف نظریات کے مقابلہ میں محققین کی ایک جماعت کا نظریہ

؎۱ حیات محمدؐ از ڈاکٹر ہیکل ص ۱۳۶

؎۲ خطط شام ج ۶ ص ۲۴۶ چاپ بیروت

ہے کہ مسئلہ تشیع کا ذکر زبان رسولؐ پر آیا ہے اور وہ لوگ کہتے ہیں رسولخداؐ کے اشارے پر تشیع کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

حسن بن موسیٰ نوبختی اور سعد بن عبداللہ تحریر کرتے ہیں:

حضرت علیؑ کا فرقہ وہ پہلا فرقہ ہے جو زمانہ رسولؐ میں ظاہر ہوا ہے اور جس کا نام شیعہ رکھا گیا ہے اور وہ فرقہ اس بات میں مشہور ہے کہ وہ حضرت علیؑ کی امامت کا قائل ہے اور حضرت علیؑ کے دوستوں میں اسکا شمار ہوتا ہے مقداد، سلمان، ابوذر، عمار حضرت علیؑ کے شیعوں میں سے تھے جو لوگ سب سے پہلے شیعہ کے نام سے جانے پہچانے گئے وہ یہی حضرات تھے۔ شیعہ کوئی نیا نام نہیں ہے۔ زمانہ سابق میں بہت سے انبیائے الٰہی کے ماننے والوں کو اسی نام سے پکارا گیا ہے مثلاً شیعہ نوحؑ، شیعہ ابراہیمؑ، شیعہ موسیٰؑ، شیعہ عیسیٰؑ وغیرہ۔ [1]

شیعہ محققین کا بھی یہی نظریہ ہے اور متعدد روایات بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بانی اسلام نے حضرت علیؑ کے دوستوں اور پیروکاروں پر لفظ شیعہ کا اطلاق کیا ہے۔

اس آیۃ: إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ [2] "بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے رہے یہی لوگ بہترین خلائق ہیں۔" کے شان نزول کے بارے میں اہلسنت

---

[1] المقالات والفرق ص۱۵

[2] پ ۳۰ س ۹۸، البینۃ، آیت ۷

کے مفسرین و محدثین لکھتے ہیں :

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں : ایک دن میں رسولخدا کی خدمت میں موجود تھا کہ حضرت علیؑ آئے رسولؐ نے انکو دیکھتے ہی فرمایا : میرا بھائی آگیا پھر اضافہ فرمایا : خدا کی قسم یہ شخص اور اسکے شیعہ قیامت میں رستگار ہونگے ۔ ۱؎

سنی مورخ و مفسر طبری اسی آیت کے ذیل میں لکھتا ہے :

رسولخدا نے لفظ شیعہ کو استعمال فرمایا ہے پس ثابت ہوا کہ وہ مخصوص گروہ جو حضرت علیؑ کا عقیدت مند تھا اور انکو اپنا مقتدا مانتا تھا اسکو رسولؐ نے لفظ "شیعہ" سے پہچنوایا ۔

●

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مدرسہ اسلامیہ کی اصل تشیع ہے بلکہ درحقیقت تشیع ہی اصل اسلام ہے ۔ کہ جسکا ذکر پیغمبرؐ کی زبان پر بھی آیا ۔ اور اگر شیعہ کے ساتھ جعفری کا اضافہ کیا جاتا ہے تو اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں بنی امیہ اور بنی عباس کی آپسی کشمکش و اختلافات کے سبب جو فضا پیدا ہوگئی تھی امام ششم نے اس سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا چنانچہ ثقافت اسلام و تشیع کے نشر و اشاعت میں آپ نے جان توڑ کوشش کی اور امام ششم نے جب دیکھا کہ اس دور میں مختلف افکار کا ظہور ہو رہا ہے ۔

۱؎ صواعق ابن حجر فصل اول باب ۱۱، مناقب خوارزمی ص ۶۲، فرائد السمطین ج ۱ باب ۳۱، ینابیع المودۃ باب ۵۶، فصول المہمہ ص ۱۲۲، کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص ۱۱۹

اور ہیگانہ تشریعی مصادر کو دین میں داخل کیا جارہا ہے۔ جیسے قیاس، استحسان وغیرہ تو آپ نے بھی دینی حقائق کا اظہار اور صالح شاگردوں کی تربیت شروع کردی۔ ان مساعی جمیلہ کی وجہ سے لفظ جعفری کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔

مشہور سنی رائٹر محمد فکری ابوالنصر مصری شیعوں کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں: شیعہ نہ تو اصول میں ابوالحسن اشعری سے کوئی ربط رکھتے ہیں اور نہ فروع میں مذاہب اربعہ (حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی) سے کیونکہ آئمہ شیعہ کے مذہب کی بنیاد سب سے سابق ہے اور نتیجۃً سب سے زیادہ قابل وثوق اور اطمینان بخش بھی ہے اور دیگر مذاہب کے مقابلہ میں سب سے زیادہ اتباع و پیروی کے لائق وسزاوار بھی ہے کیونکہ تمام مسلمان تین صدیوں تک اسی مذہب کے پابند رہے ہیں اس کے علاوہ مذہب شیعہ اس اعتبار سے بھی سب سے زیادہ پیروی کے لائق ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ نیز یہ مذہب کبھی حکومتوں کے تحت تاثیر نہیں رہا اسلئے بھی سب سے زیادہ پیروی کے قابل ہے۔ [1]

استاد ابوالوفا غنیمی تفتازانی سنی دانشمند تحریر فرماتے ہیں:

بہت سے محقق حضرات خواہ مشرقی ہوں یا مغربی اور خواہ ماضی کے ہوں یا حال کے شیعوں کے بارے میں بڑے غلط نظریات رکھتے ہیں اور یہ نظریات کسی قابلِ اعتماد مدرک و دلیل پر مبنی بھی نہیں ہیں۔ اور یہ لوگ بغیر اسکی صحت

---

[1] المراجعات چاپ قاہرہ مقدمہ ۱۰

وسلم کو پرکھے ہوئے عوام کے سامنے بیان بھی کرتے ہیں اور یہی عدم تحقیق سبب ہوئی ہے کہ شیعہ مذہب ان نام نہاد محققین کے ہاتھوں پامال ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان محققین نے کبھی شیعہ کتابوں کو پڑھنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں فرمائی۔ اور ہمیشہ دشمنانِ شیعہ کی تحریروں پر اکتفا کرتے رہے یہ مذہب شیعہ کے بدنام ہونے کا سبب ہوا ہے۔

دوسرا اہم سبب شیعوں کے حقوق کے برباد ہونے کا مغربی استعمار ہے جو ہمیشہ شیعہ سنی میں اختلاف کے بیج بوتا رہا اور اسکی پوری کوشش یہ رہی کہ "آزاد علمی بحث" کے نام پر دور از انصاف، اختلاف انگیز ناآگاہ نظریات مسلمانوں میں پھیلاتا رہے۔ [1]

یہاں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حقیقت کو کتنا مسخ کر دیا گیا ہے اور کتنا حق سے انحراف کیا گیا ہے اور اس بات کو بھی بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ کتنی عصبیت و گروپ بندی سے کام لیا گیا ہے یا یہ کہ سیاسی فضا کے تحت تاثر اس قسم کے اقدامات کئے گئے ہیں۔ یہ لوگ بجائے اسکے کہ قرآن و اسلام و قبلہ کی مصلحتوں کو ہر چیز پر مقدم کرتے تفرقہ اندازی، فرقہ پروری کو ہر چیز پر مقدم کرتے رہے ہیں اور جس چیز کو اپنی ہوا و ہوس کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں وہ اسلام ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو دشمنانِ اسلام کے لئے اسلحہ فراہم کرتے ہیں۔

●

---

[1] مع رجال الفکر فی القاہرہ ص ۳۰ - ص ۳۱

ایک نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ شیعہ نام کسی ایک ایسے فرقہ کا نام نہیں ہے جو زمانہ رسولؐ میں تمام مسلمانوں سے الگ رہا ہو۔ بلکہ عصر رسولؐ میں بھی مسلمانوں کا ایک گروہ حضرت علیؑ کو حقائق اسلام و اہداف رسالت کا سب سے بڑا عالم جانتا تھا۔ اسلئے وہ لوگ حضرت علیؑ کی اعلیٰ بصیرت، مبدء کمال سے رابطہ میں سب سے بہتر و برتر بلکہ تمام چیزوں میں سب سے عالم ہونے کی وجہ سے حضرت علیؑ سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور حضرت علیؑ کے نقش قدم پر چل کر معنوی درجات حاصل کرنے کا حضرت علیؑ کو ایک کامل انسانی نمونہ اور ایسی ممتاز شخصیت جانتے تھے جو حضرت رسولؐ کی خصوصی توجہ کے مرکز تھے اسلئے انھیں سے عقیدت رکھتے تھے اور دل و جان سے ان پر فدا تھے

ہاں یہ ضرور ہے کہ شیعہ بعنوان ایک فرقہ رسول اسلام کی رحلت کے بعد ہی ظہور پذیر ہوا ہے۔ کیونکہ حضرت علیؑ کے ماننے والے کسی بھی قیمت پر ابوبکر کی بیعت کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ [1] بلکہ ان نصوص قطعی و صریحی کی بنا پر جن میں مسلمانوں کی ولایت حضرت علیؑ کے سپرد کی گئی تھی کھلم کھلا مسلمانوں کے درمیان اپنے عقائد کا اظہار کرتے تھے اور اپنی موجودگی ثابت کرتے تھے۔ اور "مصلحت مسلمین" کے نام پر سقیفہ میں جو حضرت علیؑ کا حق چھینا گیا اس پر اعتراض کر کے اکثریت سے جدا ہو گئے تھے کیونکہ ان لوگوں کا نظریہ تھا رسولؐ کے بعد رہبریت کے فکری و سیاسی مسند پر صرف حضرت علیؑ جلوہ افروز ہو اس اعتبار سے حضرت علیؑ کی اتباع و پیروی کی بنیاد

---

[1] طبری ج ۲ ص ۴۴۶

دراصل اسی زمانہ سے پڑی ہے۔

●

حضرت علیؑ کے ماننے والے گروہ میں اصحاب کی بڑی عظیم شخصیتیں تھیں جیسے مقداد، عمار، ابوذر، سلمان، ابن عباس وغیرہ جنکے اخلاص و صداقت کی تعریف خود رسولِ اسلام کیا کرتے تھے چنانچہ جناب عمار اور انکے والدین کیلئے آنحضرت نے فرمایا : اے خاندانِ یاسر صبر و بردباری سے کام لو کیونکہ بہشت تمہاری ہی وعدہ گاہ ہے۔ [1]

اسی طرح فرمایا : اے عمار تمھیں مبارک ہو کہ باغی گروہ تم کو شہید کریگا [2]

اسی طرح لوگوں کو بتایا کہ چار آدمی ایسے ہیں جن پر خدا کا فضل و کرم ہے۔ اور وہ یہ ہیں :

خدا نے مجھے چار آدمیوں سے دوستی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور مجھے اطلاع دی ہے کہ خود خدا بھی ان چاروں کو دوست رکھتا ہے لوگوں نے پوچھا : اے خدا کے رسول وہ کون حضرات ہیں ؟ تین مرتبہ فرمایا : انہیں سے ایک علیؑ ہیں اور ابوذر، سلمان، مقداد ہیں۔ [3]

ابوذر کے تقویٰ اور صداقت کا اظہار اس طرح فرمایا : نیلگوں آسمان نے نہ کسی ایسے شخص پر سایہ کیا ہے اور نہ زمین نے اسکو اٹھایا ہے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۸۳

[2] سنن ترمذی ج ۵ ص ۳۳۳

[3] سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۵۳

جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو ۔ ابوذر وہ ہیں جو زہد میں عیسیٰ ابن مریم کے برابر ہیں [1]

تین شخصوں کی اخروی منزلت کا اظہار اسطرح فرمایا ہے : بہشت تین آدمیوں کی مشتاق ہے علیؑ، عمار، سلمان ۔ [2] ________ ابن عباس کے بارے میں رسولخدا نے اس طرح دعا فرمائی ہے : پروردگار تاویل قرآن کا علم اس کو عطا کر اور دین کے امر میں اسکو فقیہ قرار دے اور اہل ایمان سے قرار دے ۔ [3]

یہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے مخلص تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؑ رسولؐ کے بلا فصل خلیفہ ہیں اور خلافت انکا مسلم حق ہے ۔

رسولخدا کے بعد جس چیز میں اختلاف ہوا ہے اور بحث وجدال کی نوبت آئی ہے وہ مادی قیادت کا مسئلہ تھا نہ کہ امامت اور رسولؐ کی معنوی وراثت کا مسئلہ تھا اسی لئے سقیفہ میں کسی نے انتخاب امام کا مسئلہ نہیں اٹھایا ۔

اب رہی یہ بات کہ مسئلہ امامت پر بحث جو نہیں ہوئی اسکی وجہ یہ تھی کہ حضرت علیؑ کی معنوی رہبریت محل شک و تردید ہی نہیں تھی اور نہ کسی کو اس میں اختلاف تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ دعویداران جانشینی و خلافت چونکہ امامت کی ضروری و لازمی شرط سے عاری تھے اسلئے انھوں نے اس مقام کا دعویٰ

---

[1] ترمذی ج ۵ ص ۳۳۴

[2] ترمذی ج ۵ ص ۳۳۳

[3] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۶

نہیں کیا؟ یہ بات ابھی تک واضح و روشن نہیں ہوسکی ــــ ہاں مسئلہ امامت مدتوں تک محل بحث رہا بھی نہیں۔ لیکن خلفاء میں سے چند حضرات کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ یہ مسئلہ اٹھایا گیا اور کچھ غیر ذمہ دار قسم کے لوگوں نے مثلاً معاویہ نے اپنے کو امام کہلایا!!!

●

علم کلام میں جس چیز سے بحث کی جاتی ہے وہ امام و امامت کا مسئلہ ہے۔ حالانکہ تاریخی کتابوں میں علماء اہلسنت کے بیانات میں، تحریروں میں جس بات کا ذکر کیا جاتا ہے وہ خلفاء اور خلیفہ کی بات ہے ــــ البتہ حضرت علیؑ اور انکے فرزندوں کا ــــ جو شیعوں کے رہبر کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں ــــ ذکر امام ہی سے کیا جاتا ہے اور اپنے عقائد کی بنیاد پر اور دقیق دینی معیار پر، اور تقوائے مطلق کی بنا پر اور دوسرے اور امتیازات کو امام اور جانشین پیغمبر میں ضروری جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ امام صادقؑ کے مشہور شاگرد ہشام بن حکم نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے اور اس مسئلہ (امامت) کو مورد بحث قرار دیا ہے۔ [1]

رسولؐ اسلام مقام نبوت ــــ یعنی خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کو قبول کرنا اور پھر اسکو امت تک پہونچانے کی ذمہ داری ــــ کے علاوہ مسلمانوں کے ایک صاحب اختیار فرمانروا بھی تھے۔ اور جس وقت سے مسلمانوں نے اپنا نظم و نسق قائم کیا ہے۔ اسی وقت سے

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۲۶۳

سے لوگوں کے تمام امور اجتماعی ـــــ مثلاً حکام کا عزل و نصب، تقرر قاضی، مال غنیمت کی تقسیم جنگی احکام ـــــ خود پیغمبرؐ کے ہاتھوں میں تھے اور اپنی اسی ذمہ داری کی بنیاد پر مقررات و قوانین الٰہی کو موقع بہ موقع اجرا فرمایا کرتے تھے اور لوگ بھی حضرتؐ کے اوامر و احکام کی اطاعت و پابندی کیا کرتے تھے ـــــ!

اس اعتبار سے حکومت، معاشرے کا ادارہ، نظم و نسق کی برقراری، امن عامہ کی بقا، یہ تمام چیزیں نبوت کا ایک حصّہ شمار ہوتی تھیں۔ رسولؐ کے اندر عملی طور سے یہ چیزیں بہر حال تھیں یعنی اس وقت بھی مقام نبوت، معنوی رہبری حاکمیت و فرمانروائی ایک ہی شخص کے اندر متمرکز تھی۔

رسولِ خدا کی رحلت کے بعد جو چیز محل نزاع بنی ہے وہ وہی حاکمیت و فرمانروائی تھی اسی لئے جو لوگ رسولؐ کے بعد حکومت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے نہ انھوں نے خدا سے ارتباط کا دعویٰ کیا نہ نزول وحی کے دعویدار ہوئے نہ لوگوں کے روحانی پیشوا ہونے کا دعویٰ کیا بلکہ انکا مقصد صرف حکومت اور مسلمانوں کے امور کا ادارہ کرنا اور ساری توجہ اس بات کیلئے رکھنا تھی کہ ایسی سیاست و حسن تدبیر سے کام لیا جائے جس سے کسی قسم کا خلل پیدا نہ ہو۔

رسولؐ کے انتقال کے بعد جب لوگوں نے ابوبکر کی بیعت کر لی تو ابو عبیدہ نے حضرت علیؑ سے پیشکش کی: آپ اس امر کو ابوبکر کیلئے چھوڑ دیجئے اگر آپ ابوبکر کے بعد زندہ رہے تو سب سے زیادہ اس کے سزاوار آپ ہی ہوں گے کیونکہ آپ کا ایمان، تقویٰ، عقلمندی قابل تردید

نہیں ہے اور آپ سابق الاسلام بھی ہیں اور رسولِ خدا سے قرابت قریبہ بھی رکھتے ہیں اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا:

اے مہاجرین خدا کی قسم حکومت کو رسولؐ کے گھر سے باہر نہ نکالو اور اپنے گھر میں نہ لے جاؤ محمدؐ کے اہل بیت کو ان کے منصب و مقام سے محروم نہ کرو! [1]

---

[1] الامامۃ والسیاست ج ۱ ص ۱۲

صاحبان امر کون؟

رسولِ خدا کے انتقال کے بعد آپکی خلافت و جانشینی کا مسئلہ موضوع بحث و نزاع رہا اس کے بعد اولوالامر کا مسئلہ ایک زمانہ تک مورد بحث و نظر رہا، اور اب بھی ہے، البتہ زمانہ گذشتہ میں بھی یہ کلمہ عام بول چال اور مسلمانوں کے لئے اجنبی نہیں رہا تھا۔ بلکہ آغاز اسلام ہی سے لوگ اس سے آشنا تھے اور اپنے محاورات میں استعمال کرتے تھے۔

انتہا یہ ہے کہ ابتدائے رسالت میں جب آنحضرتؐ اور کفار مکہ کے درمیان (نامہ و) پیام کا رد و بدل ہوا تو اس میں بھی کلمہ "امر" کا استعمال ہوا ہے اس وقت کفار و مشرکین آئین جدید کی وجہ سے چونکہ سخت برہم تھے لہٰذا انھوں نے رسولِ خدا کو یہ پیغام بھیجا:

۱۔ اے محمدؐ ہمارے بتوں پر حملے نہ کرو اور ہمارے خداؤں سے دست بردار ہو جاؤ ہم تمھارے ہر مطالبہ کو تسلیم کرنے کیلئے حاضر ہیں۔ جب جناب ابوطالبؑ نے قریش کا یہ پیغام رسولؐ کو پہونچایا تو آنحضرت نے کہا:

اگر میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے اور مجھ سے کہا جائے اس "امر" سے دست بردار ہو جاؤں تو ناممکن ہے یہاں تک کہ یا تو خدا اپنے اس دین کو کامیابی عطا کرے یا میں اپنی جان

سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔ [1]

۲۔ جب ابوبکر کی بیعت تمام ہو گئی تو ابو عبیدہ نے حضرت علیؑ سے کہا: ابھی آپ اس "امر" کو ابوبکر کے لئے چھوڑ دیں [2] یہاں پر "امر" کے معنی حکومت و اقتدار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہیں۔

۳۔ قرآن میں ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللّٰهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَیْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیلًا [3] ایمان دارو خدا کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور جو تم میں سے (رسولؐ ہی کی طرح) صاحبان امر ہوں انکی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو پس اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس امر میں خدا اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو یہی (تمہارے حق میں) بہتر ہے اور انجام کی راہ سے بہت اچھا ہے۔

یہ آیت مختلف دینی و اجتماعی مسائل میں مسلمانوں کے واقعی مراجع کو مشخص کرتی ہے۔

آیت پہلے تو ایمانداروں کو بغیر کسی قید و شرط کے اس خلاق کائنات کی اطاعت کا حکم دیتی ہے جو تمام موجودات کا مالک ہے کیونکہ تمام رہبریاں

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ صفحہ ۴۶

[2] الامامۃ والسیاسۃ ج ۱ ص ۱۳

[3] سورۂ نساء آیت ۵۹

کا سرچشمہ اسکی ذات مقدس ہے اور ساری اطاعتیں اسکی اطاعت پر ختم ہو جاتی ہیں یہ اطاعت پروردگار کی خالقیت وحاکمیت کا تقاضا ہے۔ اور چونکہ تشریع وقانون بنانے کا حق اور امر ونہی کرنے کا حق صرف خدا کو ہے اس لیے رسُول کا کام ہے کہ وحی الٰہی کے مطابق جس بات پر اسکو مامور کیا گیا ہے اسکو لوگوں تک پہونچا دے ۔

اس کے بعد آیت دوسرے نمبر پر اس رسُول کی اطاعت کو واجب کر رہی ہے جو بندوں میں خدا کا نمائندہ ہے اور جو معصوم ہے اور خواہشاتِ نفس کے مطابق کبھی بات بھی نہیں کرتا ۔

اور وہ رسُول علاوہ اسکے کہ پیغامات الٰہی اور احکام حق پہونچانے کے دین خدا کے احکام کے نفاذ کیلئے خود بھی مخصوص پروگرام رکھتا ہے اور معاشرے کے مسائل کا حل کرنا حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے۔ اور دین کا قائد اعظم مصلحت امت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسانی معاشرے کے توازن کو بھی برقرار رکھتے ہوئے شرائط و ظروف کا لحاظ کرتے ہوئے احکام جاری کرتا ہے۔ اس قسم کے قوانین کا حق اس رسُول کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔

سابق کے صفحات پڑھنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اطاعت رسُول (جو فرمان الٰہی کا نتیجہ ہے) یہ بھی ایک قسم کی خدا کی اطاعت ہے جیسے رسُول کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے اسی چیز کو قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے :۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ ۔ جس نے رسُول

کی اطاعت کی تو اس نے خدا کی اطاعت کی ۔ لہٰذا رسول کا ہر پیغام خدا کا پیغام ہے ۔

تیسرے نمبر پر قرآن جن کی اطاعت کا حکم دیتا ہے وہ صاحبان امر ہیں جنکی اطاعت کو خدا نے اپنی اور اپنے رسُول کی اطاعت کے ساتھ رکھا ہے یعنی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنکی طرف پیغمبر کی خصوصی حکومت منتقل ہوئی ہے اور خدا اور رسُول کی طرف سے پورے معاشرے کی تمام امور میں ذمہ داری ان کے سپرد کی گئی ہے ۔ اور یہ حضرات دین کی حفاظت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی دنیا کے بھی محافظ ہیں ۔

انکو حق ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی امور کو ادارہ کرنے کیلئے الٰہی قوانین کے پیش نظر احکام جاری کریں اور لوگوں کو اس پر عمل کرنے کیلئے مجبور کریں ۔ پس صاحبان امر کے احکام کی اطاعت ایک قطعی اور ناقابلِ تردید مسئلہ ہے ۔ البتہ اس کے مصادیق میں بحث وجدال کی گنجائش ہے ۔

صاحبان امر سے قرآن کی کیا مراد ہے ؟

آئیے دیکھیں قرآن کی نظر میں کون لوگ اولوا الامر ہو سکتے ہیں کیا جو شخص بھی حکومت اسلامی کا سربراہ ہو جائے اور حکومت پر قبضہ کرلے معاشرے پر حکمرانی کرنے لگے وہ قرآن کی نظر میں صاحب امر شمار ہو سکتا ہے ؟

لہ پ ۵ س (نساء) آیت ۸۰

قبول ہی نہیں کر سکتی ۔

آخر یہ کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ایک طرف تو خدا اپنے انبیاء احکام الٰہی نافذ کرنے کیلئے بھیجے اور اتنی تاکید کردے کہ چاہے تمہاری جان چلی جائے مگر دین کے اصلی تعلیمات اور عدالت کا اجرا کرو اور دوسری طرف وہی خدا یہ کہدے کہ حاکم ورئیس کا ہر حکم عوام کیلئے واجب الاطاعت ہے کیونکہ ایسا کرنے پر یہ حضرات نہ تو امت کے ایمان کی حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ ہی معاشرے کے ذہن کو دینی بنانے کیلئے کوئی قدم اٹھائیں گے بلکہ یہ تو انبیاء کی ساری محنتوں پر پانی پھیر دیں گے اور قانون الٰہی کو پامال کردیں گے اور معاشرے میں ظلم و بیدار کا دور دورہ کر دیں گے ۔

کیا اجتماعی سعادت و نجات انکی پیروی سے ہو سکتی ہے ؟ اور مسلمان ایسی حکومت کے زیر سایہ عزت و استغناء حاصل کر سکتے ہیں ؟ کیا ایسی حکومت اور ایسے حاکم کی نسبت خدا کیطرف دی جا سکتی ہے ؟

ہاں یہ ممکن ہے کہ ولی امر کی اطاعت کو وہاں پر واجب قرار دیا جائے جہاں وہ احکام الٰہی سے نہ ٹکراتا ہو لیکن اگر کبھی حاکم احکام الٰہی کے خلاف حکم دیدے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسکی مخالفت کرکے اس سے اسکو روک دیں ۔

٭ ایسی صورت میں حاکم محکوم ہو جائیگا حالانکہ ولی امر کی حکومت علی الاطلاق ہے لہٰذا ایسے لوگ اولی الامر ہو ہی نہیں سکتے ۔ مترجم ۔

آیت سے اس مفہوم کو مراد لینے پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان سے چشم پوشی ممکن ہی نہیں ہے ۔ کیونکہ بدیہی ہے کہ تمام لوگ ۔

باین معنی کہ جو شخص بھی حکومت پر قابض ہو جائے اسکی اطاعت تمام لوگوں پر واجب ہو جائے گی اور اسکی مخالفت حرام و ناجائز ہو گی؟ خواہ اسکی زندگی تباہی وجہالت و لاعلمی سے پُر اور وہ شخص فضائل و اخلاق سے بالکل ہی تہی دامن ہو اور وہ بالکل اجنبیوں کی طرح احکام و فرمان جاری کرتا ہو، یہانتک کہ وہ اپنی طاقت و حکومت کے گھمنڈ میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کے حقوق کو پامال کرتا ہو اور اسکے ہمنوا جو منبع قدرت سے نزدیک ہیں مفسدوں و ظالموں کو عزت کے چرخ ِ معظم پر بٹھلاتے ہوں تاکہ مفسد و ظالم لوگ مظلوموں کی فریاد بلند ہونے سے پہلے ہی ان کا گلا گھونٹ دیں اور امت مسلمہ کے افراد کو گروہ گروہ کرکے ذلت و رسوائی کی زنجیروں میں مقید کردیں۔

اگر قرآن کا مفہوم اولوالامر سے یہی ہے تو آیت کے صدر و ذیل میں تناقض پیدا ہو جائے گا کیونکہ اگر حاکم و رئیس حکم الٰہی کے خلاف کوئی دستور صادر کرے تو صدر آیت کا کہنا ہے کہ خدا کے احکام کی پابندی لازمی اور ضروری ہے اور اس کا حکم ہر حکم پر مقدم ہے لیکن ذیل آیت کا کہنا ہے کہ حاکم و رئیس جو بھی حکم دے اسکو بجالاؤ (خواہ وہ حکم خدا کے خلاف ہی ہو) مثلاً ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی امتیاز سے ایک ہی مورد پر (ولو عرفاً ہو) اجتماع امر و نہی لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔

آیت سے اس مفہوم کو مراد لینے کا مطلب یہ ہے کہ حاکم و رئیس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے چاہے اس سے احکام الٰہی کی مخالفت لازم آتی ہو اور فرمان خدا کا بطلان ہوتا ہو۔ ظاہر ہے کہ عقل اس احتمال کو

احکام الہی سے واقف نہیں ہیں کہ حاکم کا جو حکم دین کے خلاف ہو اسکی مخالفت کریں۔ اس کے علاوہ اگر مخالفت کریں بھی تو کیا معلوم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں کہ نہیں؟ پس جب لوگ معارف دینی سے واقف نہ ہوں گے تو حاکم کے ان احکام کی جو مخالف احکام الہی ہیں کیونکر اس کیلئے اپنی ذمہ داری کو مشخص کر سکتے ہیں؟ یعنی وہ لوگ یہ کیسے کر سکتے ہیں کہ جو حکم احکام الہی کے مطابق ہو اس پر عمل کریں اور جو مخالف ہو اسکی مخالفت کریں جب وہ جاہل ہیں تو اسکی تشخیص کیونکر کر سکتے ہیں؟ اور اگر مخالفت کرتے بھی ہیں تو کہاں تک کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے؟ اور اسکا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟

●

اور اگر بالفرض ہم اسکو تسلیم بھی کر لیں کہ حاکم کی اطاعت صرف ان مقامات پر لازمی ہے جو احکام الہی کے مطابق ہوں تو درحقیقت یہ حاکم کی نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہوئی تو پھر اولوالامر کی اطاعت کا حکم لغو و بیکار ہو جائیگا۔

اسکے علاوہ ایک اور خرابی یہ پیدا ہوگی کہ جو گروہ قانون کو اپنے مصالح کے خلاف دیکھے گا اس کیلئے قانون کے اندر جو تھا۔ دان ہر حال پیدا ہو جائے گا۔ اور وہ کسی نہ کسی عذر و بہانہ سے تمرد و سرکشی کرے گا اور حاکم کے حکم کو تسلیم نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں لوگوں کی حس اطاعت ضرورت سے زیادہ کمزور ہو جائے گی اور کوئی چیز ان کو کنٹرول نہیں کر سکے گی۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرے میں تزلزل پیدا ہو جائے گا اور آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ سارا نظم و ضبط برباد ہو کر رہ جائیگا۔ لہذا آیت کو اس معنی پر کسی بھی طرح حمل کرنا صحیح نہیں ہے۔

اچھا آئیے یہ فرض کرتے ہیں کہ "ولی امر" سے مراد وہ رئیس و حاکم ہے جو ووٹ کے ذریعہ مسند حکومت تک پہونچ جائے اور عوام اُسکو منتخب کریں پس جسکو بھی عوام منتخب کریں وہی ولی امر تو پہلی بات تو یہی ہے کہ آیت کی بررسی کرنے سے یہ مفہوم حاصل نہیں ہوتا کیونکہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اُس شخص کی اطاعت کرو جو ولی امر ہے اب رہی یہ بات کہ اُس ولی امر تک پہونچنے کا ذریعہ کیا ہے۔ لوگ منتخب کریں یا سابق خلیفہ معین کرے آیت اس سلسلے میں بالکل خاموش ہے کوئی ایسی بات نہیں کہتی جس پر ہم اعتماد کرسکیں۔ اور تفسیر اول پر ناقابل تردید جو اعتراضات ہوتے تھے اصولاً وہی اعتراضات اس تفسیر پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان اشکالات کو دیکھتے ہوئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان دونوں تفسیروں سے دست بردار ہو جائیں۔

یہاں ہمارے لئے صرف ایک صورت رہ جاتی ہے کہ اگر اسکو مان لیں تو اس بن بست سے نجات مل جائیگی صراط مستقیم روشن ہو جائیگی اور حق تک رسائی بھی ہو جائیگی اور وہ یہ ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ رئیس و حاکم کا تقرر و انتخاب خدا کا کام ہے۔ یہ کام خدا کا ہے کہ جس شخص میں خلافت اسلامی کا برحق عنصر پایا جائے اور رسولؐ ہی کی طرح کا فضائل والا ہو۔ جذبہ الٰہی اسکی ذات سے ہویدا ہو، اسکو خدا منتخب کردے تاکہ اسکی اطاعت و فرمانبرداری درحقیقت خدا و رسولؐ کی اطاعت ہو۔

میں یہ مانتا ہوں کہ رسولِ خدا اپنی مختصر سی زندگی میں دین کے اصول و فروع کو بیان کر گئے ہیں اور اس اعتبار سے دین کامل بھی ہو گیا ہے اور انھیں

کلیات کو احکام الٰہی کے استخراج کی بنیاد قیامت تک کے انسانوں کیلئے قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد کیا کیا جائے؟

کیا اسکے بعد لوگوں کو ایک ایسے دینی مرجع کی ضرورت نہیں ہوگی جو انکی ضرورتوں کو پورا کرے؟ اور وہ شخص قرآن و اصول سنت کے زیر سایہ مختلف واقع ہونے والے حوادث خصوصاً ایسے واقعات جو رسولؐ کی زندگی میں نہیں پیش آئے انکا حل تلاش کرے۔

رسولؐ خدا کی تیرہ سال زندگی تو ان کفار مکہ سے مبارزہ کرنے میں گزر گئی جو یہ نہیں چاہتے تھے کہ حیات بخش آواز اسلام انسانوں کے کانوں تک پہونچے۔ رسولؐ نے اپنے امکان بھر اثبات توحید و نفی بت پرستی کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور معاشرے کے ذہن کو ان حقائق کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کر دیا لیکن آپ کو اتنی فرصت نہ مل سکی کہ دیگر مسائل ضروریہ کو بھی بیان فرما دیتے اسی لئے یہ کام دوسرے زمانہ کے سپرد کر دیا گیا۔

●

مدینہ پہونچ کر بھی رسولؐ کو مکہ سے زیادہ آسودہ خاطری نصیب نہیں ہو سکی۔ مدینہ کے دس سالہ مختصر زندگی میں انبوہ مشکلات و صعوبات سے آنحضرتؐ مسلسل دوچار ہوتے رہے۔

ایک طرف تو منافقین کی نت نئی ریشہ دوانیاں دوسری طرف یہودیوں اور بت پرستوں سے نبرد آزمائیاں ان چیزوں نے آنحضرتؐ کو دم لینے کی مہلت نہیں دی ۲۷ جنگوں میں خود سرکار دو عالم شریک ہوئے یہی وجہ

تھی کہ آپکو اتنا وقت نہ مل سکا کہ دیگر جو افراد صالح تھے آنکو اسلامی معاشرہ میں داخل فرماتے ۔

ایسی صورت میں کیا یہ بات ضروری نہیں تھی کہ ایک ایسی ممتاز شخصیت کو جو احکام الٰہی کو تغییر و تبدیل سے محفوظ رکھ سکنے کے ساتھ حسب ضرورت زمان و مکان مختلف شعبوں میں فرہنگ اسلامی کو وسعت دے سکتی وہ رسولؐ کی قائم مقام ہو؟ یعنی کیا ایک ایسے شخص کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جو گناہ و عصیان سے پاک ہو نفحات ربوبیت نے اسکی جان و روح کو نورِ ربانی بخشا ہو؟

جن اولوالامر کی اطاعت کا حکم خدا حتم و جزم کے ساتھ دے رہا ہو اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری اپنے اور اپنے رسولؐ کے پہلو بہ پہلو قرار دے رہا ہو انکو ہر قسم کی لغزش و گناہ سے معصوم ہونا ضروری ہے کیونکہ جس طرح رسولؐ معصوم تھے اسی طرح اولوالامر کو بھی معصوم ہونا چاہئے ۔

یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جنکی اطاعت خدا و رسولؐ کی طرح واجب ہے انکو معصوم ہونا ضروری ہے ۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جنکی برتری و فضیلت کا ذکر اور انکی دوستی کے لئے رسولؐ نے امت کو ترغیب دی ہے ۔

مختلف حالات میں بے شمار پیش آنے والے واقعات کے احکام کو آیات الٰہی اور محدود احادیث رسالت پناہی سے استنباط کر لینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے اور نہ یہ بہت آسان کام ہے ۔ احکام کے سلسلہ میں آنے والی آیات اور حلال و حرام بیان کرنے والی روایات ـــــ جو رسولؐ مقبول سے منقول ہوں ـــــ کی کل تعداد سات سو سے

زیادہ نہیں ہے ۔ اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کون ایسا شخص ہے جو اسلامی معاشرے میں واقع ہونے والے روز افزوں واقعات و حادثات کو ان محدود مدارک سے استنباط کر سکتا ہے ؟ یہ کام سوائے اس شخص کے کہ جسکی تعلیم غیبی و الٰہی ہو دوسرا انجام نہیں دے سکتا ۔

اسی طرح وہ مسائل جو اوضاع زمانی و مکانی کے بدلنے سے یا مختلف حالات میں بدل جایا کرتے ہیں انکے لئے وضع قوانین کا حق اولی الامر کو ہے اس لئے کہ انکو یہ اختیار قدرت کی طرف سے دیا گیا ہے کہ حسب شرائط و صوابدید اپنے اسی اختیارات سے احکام ثانوی کو وضع کریں ۔ اور ایسے مقامات پر حکم صریح کا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ شریعت نے بیان حکم میں کوتاہی کی ہے یا اس کے قوانین ناقص ہیں بلکہ یہ تو قدرت تشریع کو بتانے والی چیز ہے کہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ زمانے کے ترقی کا ساتھ دے سکے ۔

●

اکمال دین والی آیت ـــ یعنی الیوم اکملت لکم دینکم الخ ـــ سے یہ استناد کرنا کہ جب دین کامل ہو گیا تو کسی ایسے شخص کے معین کرنے کی ضرورت نہیں ہے ،، بھی فائدہ مند نہیں ہے کیونکہ محدثین کے درمیان مشہور روایت یہ ہے کہ اکمال دین والی روایت غدیر کے دن حضرت علیؑ کو خلیفہ بنانے کے بعد نازل ہوئی ہے ۔ اور اس وقت جو صورتحال تھی اس کی بنا پر رسولؐ کی وفات کے بعد دین اسلام کے لئے بہت بڑا خطرہ تھا کہ چاروں طرف سے ہجوم و غارتگری کا حملہ ہو جائے گا اور انکی وجہ سے

پیکرِ حق و دینِ جدید پر تابڑ توڑ حملے ہوں گے۔

اور چونکہ ایک مرجعِ الٰہی اور نمائندہ رسولؐ کے بغیر نہ تو رسولِ اسلام کا پروگرام مکمل ہو سکتا تھا۔ اور نہ حسبِ منشاءِ رسولؐ اسکو دوام حاصل ہو سکتا تھا۔ اسلئے ایک مرجعِ الٰہی اور نمایندہ رسالت پناہی کا تقرر بہت ضروری تھا اسی لئے آنحضرتؐ نے علیؑ ابن ابیطالب کی خلافت کا اعلان کر کے تمام خطرات کو دور کر دیا۔

اسکے علاوہ آیت کا مقصد بھی یہ نہیں ہے۔ کہ وہ یہ بیان کرنے کیلئے آئی ہے کہ دین کے تمام فروعات اور خدائی قانون ہر محل و موقع کیلئے مکمل ہو گیا کیونکہ اس اعتبار سے کہ سلسلۂ وحی انتقالِ رسولؐ کے بعد ختم ہو گیا اور انسان کو جن چیزوں کی ہمیشہ کیلئے ضرورت تھی پیغمبرِ اسلام نے اسکو بیان کر دیا اور اب تشریع کا کوئی کام باقی نہیں رہا۔ یہ بات تو صد در صد درست ہے۔ لیکن دوسرے اعتبار سے تمام موضوعات کے احکام ہم تک نہ قرآن سے پہونچے نہ سنتِ رسولؐ سے! اور جو فقہی ادلہ ہمارے پاس موجود ہیں وہ تمام ان نئے حوادث کے لئے جو بعد میں پیش آنیوالے ہیں کافی نہیں ہیں۔ اور شاید اسکی وجہ زمانہ رسالت کا مختصر ہونا ہو۔ اور پے در پے مشکلوں و دشواریوں نے بھی رسولؐ کو بنیادی کاموں کے انجام دینے میں روڑے اٹکائے ہیں۔ اور رسولؐ کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ جتنی چیزیں خدا سے سیکھ کر آئے تھے وہ سب امت کو بتا دیتے۔

بہت سے اصحاب اور پیغمبرؐ کے معاصر نسل شخصیتِ رسولؐ پر بھروسہ کئے بیٹھی تھی۔ اسی لئے جب تک آنحضرتؐ کا سایہ انکے سروں پر رہا انھوں نے دینی احکام و مفاہیم سیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور رسولِ خدا کے انتقال

کے بعد ــــ جبکہ انکی اہمیت بڑھ گئی تھی ــــ بہت سے وہ مسائل جو عبادات و معاملات و قضاوت سے متعلق تھے لوگ انکے احکام بھی نہیں جانتے تھے بلکہ اور بہت سے دینی امور سے بھی ناواقف تھے نیز سیاسی حالات اور امامت و خلافت کے احکام اور اپنے زمانہ کی معرفت حاصل کرنے میں بھی بہت کمزور تھے۔ چنانچہ علمائے اہلسنت کی کتابوں میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے سامنے میراث، قضاوت، حدود، دیات، اور دیگر دینی امور کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔

اس لئے حکمت رسولؐ کا تقاضا تھا کہ امت کو دینی امور سے اس زمانہ میں آشنا کریں جو عہد رسالت سے کہیں زیادہ طولانی تھا۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے ذریعہ وحی جو چیزیں اپنے خدا سے سیکھی تھیں انہیں سے احکام اسلامی کے فروعات اور مجموعہ قوانین اپنے اس وصی و جانشین کو ودیعت کر دئے جس کا وجود ہی اسلام تھا۔ اور جسکو بلند مقاصد کی اطلاع تھی بلکہ جسکا پورا وجود ہی عین اسلام تھا۔ اور رسولؐ نے اسکے قلب و روح میں تصرف کر کے مختصر سی مدت میں تمام اسلامی تعلیمات و حقائق اسلام سے اس کو مطلع و آگاہ کر دیا تھا و قیادت اسکے سپرد کر دی تھی اور اسلام کے اصلی فرہنگ و معارف دین کو اسکے حوالہ کر دیا تھا تاکہ آنحضرتؐ کے بعد وہ زمان و مکان کے مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے انکو امت مسلمہ کے سپرد کر سکے۔ اور اپنے وسیع علوم کے سہارے معاشرے کو اسکی تکلیف سے آگاہ کر سکے۔

رسولِ اسلام کی زندگی میں ایسے بکثرت شواہد ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دن ہو یا رات رسولِ خدا صرف حضرت علیؑ کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے تھے یعنی اپنے پروگرام اور اسکے مشکلات کو بتایا کرتے تھے۔ اور اگر کبھی حضرت علیؑ نے کوئی سوال کر لیا تو آنکی فکری رہنمائی کرتے تھے اور حقائق کو بیان کرتے تھے۔

اسی لئے آنحضرتؐ کے بعد ظن و شک و قیاس و استحسان سے بچنے کا اور حقیقت تک پہونچنے کا سیدھا صرف یہی ایک ذریعہ تھا۔ اور اگر قیاس و استحسان کو اسلام کا معیار قرار دیدیں تو پھر دین کی پوری عمارت ہی ظن و تخمین پر کھڑی ہو جائیگی اور جس مذہب کے دستور کا منبع وحی سے ماخوذ ہو وہ مشکوک ہو جائیگا۔ اور وہ مذہب ہی بے اعتبار ہو جائیگا۔

پس ان تمام باتوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ خلیفہ کا تعین امت کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ یہ پیغمبرؐ کا فریضہ ہے کہ امانت الٰہی کو کسی ایسے شخص کے سپرد کریں جو انھیں کی طرح معصوم ہو اور ایک سیکنڈ کیلئے بھی دین خدا کی حفاظت سے غافل نہ ہو۔

لیکن اگر احکام الٰہی کی جگہ شخصی استنباط لے لیگا تو رسالت کا پروگرام مجروح ہو جائے گا اور اسلامی معاشرہ احکام الٰہی سے دور جا پڑے گا۔

مستند تاریخوں کا کہنا ہے کہ خلفاء کا علمی و ثقافتی معیار ایسا نہیں تھا جو مشکل مسائل کو حل کر سکتے اور وفات رسولؐ کے بعد پیش آنے والے واقعات نے ثابت بھی کر دیا کہ ذمہ داران حکومت ان مسائل کو حل نہیں کر سکے اور نہ اسکے مطابق حکم جاری کر سکے۔ اور ان لوگوں کی اسی

جہالت کی بنا پر قوانین الٰہی اپنے مسیر سے منحرف ہو گئے اور انکی جگہ ایسے احکام نے لے لی جن کا اسلام سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔

●

مورخین نے لکھا ہے:

ایک مرتبہ پانچ آدمیوں کو زنا کے جرم میں خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے فوراً حکم دیدیا کہ سب کو سَو سَو کوڑے مارے جائیں ،، اتفاق سے،، اس وقت امام معصوم بھی تشریف فرما تھے آپ نے اس حکم پر اعتراض کیا اور فرمایا: مجرموں کا حکم الگ الگ ہے۔ ایک کافر ذمی ہے اس نے شرائط ذمہ پر عمل نہیں کیا لہٰذا واجب القتل ہے۔ دوسرا شخص بیوی والا ہے لہٰذا اسکو سنگسار کیا جائے۔ تیسرا غیر شادی شدہ جوان ہے اسکو تازیانے لگائے جائیں۔ چوتھا غیر شادی شدہ غلام ہے اسلئے اسکی سزا آزاد کی سزا سے آدھی ہوگی۔ پانچواں دیوانہ ہے اس لئے اسپر کوئی حد جاری نہیں کی جا سکتی۔

ایک عورت ناجائز طریقہ سے حاملہ ہوگئی اسکو عمر کے پاس لایا گیا۔ انھوں نے سنگسار کرنیکا حکم دیدیا۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: عورت قانون کی نظر میں مجرم ہے لیکن بچہ کی کیا خطا ہے؟ اسکو اسکی ماں کے ساتھ کیسے سنگسار کیا جا سکتا ہے؟ یہاں امام کی وجہ سے غیر قانونی حکم جاری نہیں ہو سکا۔ [1]

---

[1] ینابیع المودۃ باب ۵۶ ص ۲۱۱

ایک پاگل عورت نے زنا کیا، خلیفہ نے اسکے قتل کا حکم دیدیا، حضرت علیؑ نے کہا اسکو سزا نہیں دی جا سکتی کیونکہ پاگل ہے اور رسولؐ کی حدیث ہے: تین شخصوں پر حد جاری نہیں کی جا سکتی انمیں سے ایک دیوانہ ہے۔ اسی طرح اسکی جان بچی۔ [1]

بزرگان اہلسنت نے لکھا ہے کہ جب عمر مسائل میں عاجز رہ جاتے تھے اور حضرت علیؑ حل فرما دیتے تھے تو عمر کہا کرتے تھے:

لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا"، یا یہ کہتے تھے: میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں اس مشکل سے جس کے لئے علیؑ نہ ہوں۔ [2]

یہ چند مثالیں ہیں کہ جن میں جو حکم دیا گیا ہے اس کا وحی الٰہی سے کوئی ربط نہیں ہے۔ [3]

●

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا واقعی پروردگار عالم نے اجازت دیدی ہے کہ وفات رسولؐ کے بعد پیش آنے والے نئے واقعات کے سلسلہ میں دین الٰہی کے قوانین کو کالعدم کر کے انکی جگہ باطل احکام دیدیئے جائیں؟ یا اس نے معارف دین کی حفاظت کیلئے امور امت کو ایسے ہاتھوں میں

---

[1] الغدیر ج ۶ صفحہ ۱۰۱ تا صفحہ ۱۱۱ پر اسکے مدارک ملاحظہ ہوں

[2] طبقات ابن سعد ج ۲ بخش ۲ صفحہ ۱۰۲

[3] تفصیل کے لئے الغدیر کی ج ۶، ۷، ۸، ملاحظہ ہو

دیدیا ہے جو اسلام کے متعلق تمام جزئیات کے عالم ہیں اور انکا فریضہ ہے کہ احکام اسلامی کو معاشرے میں نافذ کریں؟

اگر یہ بات طے ہو جائے کہ وجوب اطاعت صرف ان شخصیتوں کیلئے ہے جن میں رہبری کے تمام شرائط بہ درجہ اتم پائے جاتے ہوں تو پھر ان کی خواہشات اور خدا اور رسولؐ کے قوانین میں کسی قسم کا تعارض ہی نہ ہوگا۔ اور آیت کی یہی تفسیر وہ ہے جس سے تمام گذشتہ اعتراضات کا حل نکل آتا ہے۔ اور ہمکو بے تکی و نامعقول تفسیر دلیاسے بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے۔

بنیادی طور سے قرآن کسی بھی طرح اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ جو لوگ اپنی خواہشات کو احکام الہی پر مقدم کرتے ہوں انکی پیروی کی جائے قرآن تو علی الاعلان کہتا ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۔ [1] — اور جس کے دل کو ہم نے (گویا خود) اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش نفسانی کے پیچھے پڑا ہے اور اسکا کام سراسر زیادتی ہے اسکا کہنا ہرگز نہ ماننا!

ظاہر ہے ہر وہ حکم جو مرضی الہی کے خلاف ہو نہ اسکا کوئی اعتبار ہے اور نہ اسکی کوئی قدر و قیمت ہے۔ اور کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ احکام الہی کے خلاف اپنا موقف اختیار کرے یا خود ہی وضع قوانین کرنے لگے

---

[1] پ ۱۵ س ۱۸، کہف، آیت ۲۸

اسی لئے عقل و وجدان کا فیصلہ ہے اور بہت سی آیات و روایات کی دلالت بھی اس بات پر ہوتی ہے کہ لوگوں پر صرف احکام الٰہی کی پابندی ضروری ہے اسی کے احکام کے سامنے سر جھکانا چاہیئے اور بس۔

حضرت علیؑ صرف خدا و رسولؐ اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیتے تھے۔ اور اولوالامر کی اطاعت اسلئے واجب ہے کہ وہ حضرات معصوم ہیں احکام الٰہی کے خلاف کوئی حکم دے ہی نہیں سکتے۔ [1]

امام محمد باقرؑ نے فرمایا: صاحبان امر سے مراد وہ پیشوا ہیں جو نسلِ علیؑ و فاطمہؑ سے ہونگے اور قیامت تک دنیا میں انکا وجود رہے گا۔ [2]

امام صادقؑ کے ایک صحابی کا کہنا ہے: میں نے حضرت صادقؑ سے پوچھا خدا نے جن اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے وہ کون ہیں؟ فرمایا: حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور جعفر یعنی میں! اسلئے تم لوگ خدا کی سپاس گزاری کرو کہ اس نے تمہارے پیشواؤں کو پہچنوادیا حالانکہ بہت سے لوگ اسکے منکر ہیں۔ [3]

جناب جابر صحابی رسولؐ نے آنحضرتؐ سے قرآن کی آیت میں اولوالامر کی جو اطاعت واجب کی گئی ہے اسکے بارے میں پوچھا کہ وہ کون حضرات ہیں جنکی پیروی ہم پر واجب و لازم ہے؟ رسولؐ خدا نے فرمایا: میرے بعد جب

---

[1] بحار ج ۲۵ ص ۲۰۰

[2] اثبات الہداۃ ج ۳ ص ۱۳۱

[3] تفسیر عیاشی ج ۱ ص ۲۵۲

پہلے علیؑ اسکے بعد انکے بیٹے حسنؑ و حسینؑ اسکے بعد علیؑ ابن الحسینؑ ان کے بعد محمدؑ باقر! اے جابر تم محمدؑ باقر سے ملاقات کروگے جب ان سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہدینا۔ محمدؑ باقر کے بعد جعفرؑ صادق، انکے بعد موسیٰؑ کاظم پھر علی ابن علیؑ رضا، محمدؑ جواد، علیؑ ہادی، حسن عسکریؑ، انکے بعد قائم منتظر مہدیؑ سو یہ سب حضرات میرے بعد امام و رہبر ہونگے۔ ؎۱

امام ششم کے ایک صحابی نے ان سے پوچھا: مجھے ان ارکان اسلام کو بتائیے جنکی بنیاد پر میرے اعمال قبول ہو جائیں اور انکی بنا پر اگر میں بعض امور سے ناواقف ہوں تو مجھے نقصان نہ ہو؟ حضرتؑ نے فرمایا: خدائے واحد کی شہادت، محمدؐ کی نبوت و رسالت پر اور جو چیزیں علاوہ حق خدا کیطرف سے لائے ہیں ان پر ایمان اور حقوق مالی جیسے زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی اور جن حضرات کی ولایت کا خدا نے حکم دیا ہے انکی ولایت کا اقرار یعنی ولایت آلِ محمدؐ کا اقرار۔ کیونکہ خود رسولؐ نے فرمایا ہے: جو اپنے امام زمانہ کو پہچانے بغیر مر جائے اسکی موت جاہلیت کی موت ہوتی ہے۔ اور خدا نے بھی فرمایا ہے: خدا و رسولؐ و اولی الامر کی اطاعت کرو۔ ؎۲

اولوالامر کی سب سے پہلی شخصیت حضرت علیؑ کی ہے اسکے بعد امام حسنؑ پھر امام حسینؑ پھر علیؑ ابن الحسینؑ اسکے بعد محمدؑ باقر و ھکذا ـــــ جو معاشرہ وجود امام سے خالی ہو وہ قابل اصلاح نہیں ہے اپنے امام زمانہ کو پہچانے بغیر

؎۱ اثبات الہداۃ ج ۳ ص ۱۲۳

؎۲ پ ۵ س ۴ آیت ۵۹

مرنا جاہلیت کی موت ہے۔ مرنے سے پہلے عمر کے آخری حصہ میں امام کے پہچان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی ایسے موقعہ پر امام کو پہچانتا ہے تو یہ دلیل ہے کہ اسکی حالت ٹھیک ہے اور اس کا مقام بلند ہے۔ ¹

بنی امیہ و بنی عباس نے ولی امر ہونے کے ناطے مسلمانوں پر بلکہ اولیائے دین پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے ہیں جن سے انسانیت لرزہ بر اندام ہو اٹھی ہے ان لوگوں نے خلافت کو کمینگی اور رذالت میں تبدیل کر دیا تھا اور اپنی ناجائز حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے نہ معلوم کتنے بیگناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ آپ اپنے کو امیر المومنین کہلاتے تھے۔

اگر ایسے ہی ظالم و شریر و کمینہ لوگوں کی اطاعت کو خدا واجب قرار دیدے تو پھر عدل و انصاف مساوات، حقوق فردی و اجتماعی کا کیا حشر ہوگا؟ کیا ایسی صورت میں وہ خدائی احکام جو اپنے دامن میں انسان کے دونوں جہان کی نیک بختی لئے ہیں اور ہر اعتبار سے انسان کے حقیقی تکامل کے ذمہ دار ہیں۔ وہ انحراف و ابتذال کے شکار نہ ہو جائیں گے؟

اب میں چند ان روایات کو ذکر کروں گا جنھیں بزرگان اہلسنت نے اولی الامر کی تفسیر میں لکھا ہے اور ان سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اولوالامر سے مراد آئمہ اثنا عشر ہیں۔ ²

---

¹ ینابیع المودة ص۱۳۷

² ابوبکر مومن نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں احقاق الحق کے ج ۳ ص۴۲۵ کے حوالہ سے۔

قرآن مجید نے مسلمانوں کی سرپرستی کو خدا اور رسولؐ اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دینے والے مومنین میں منحصر کر دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ [1] (اے ایماندارو) تمہارے مالک و سرپرست صرف یہی ہیں خدا اسکا رسولؐ اور وہ مومنین جو پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

یہ آیت ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو صرف ایک مرتبہ خارج میں واقع ہوا ہے کیونکہ اسلام میں کوئی ایسا حکم کلی نہیں ہے کہ انسان حالت رکوع میں زکوٰۃ دے۔ نہ واجب حکم ہے نہ مستحب! اگر ایسا ہوتا تو ایک گنجائش نکالی جا سکتی تھی کہ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے پہلے اس پر عمل کیا ہو اور آیت میں انھیں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک ضرورتمند شخص مسجد رسولؐ میں آیا اور اسوقت حضرت علیؑ رکوع میں تھے سائل نے سوال کیا حضرت علیؑ نے انگلی سے اشارہ کر کے اسکو سمجھایا کہ میرے ہاتھ کی انگوٹھی اتار لے چنانچہ اسنے انگوٹھی اتار لی اور چلا گیا۔ اتنے میں رسولؐ اسلام پر جبرئیل وحی لیکر آئے اور

اور ابو حیان اندلسی مشہور مفسر نے بحر المحیط کے ج ۳ ص ۵۱۳ پر شیخ سلیمان حنفی نے ینابیع المودۃ کے ص ۱۱۴ اور ص ۲۱۲ پر تحریر کیا ہے۔

[1] پ ۶ س (مائدہ ۵) آیت ۵۵

آیۃ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ الخ کی تلاوت کی۔

تمام شیعہ و سنی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیۃ حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور وہی حضرت وحی الٰہی کے مصداق ہیں۔ [1]

آیت میں کلمہ جمع جو استعمال کیا گیا ہے اس سے اس ایک فرد کی طرف اشارہ ہے جس نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی اور یہ بات بھی اجماعی ہے کہ یہ کام کرنے والا شخص حضرت علیؑ تھے۔

لفظ مفرد استعمال کر کے جمع مراد لینا جائز نہیں ہے لیکن جمع بول کے مفرد مراد لینا تمام محاورات میں جاری و ساری ہے۔ اور قرآن میں بھی صرف اسی جگہ نہیں آیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر ایسا استعمال موجود ہے لہٰذا اس اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن مجید میں نعیم بن مسعود اشجعی کیلئے بھی لفظ جمع کا استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الخ [2] اس آیت میں جمع کا صیغہ استعمال ہے لیکن مراد صرف نعیم بن مسعود ہیں۔

اسی طرح سورہ منافقون کی پہلی آیت میں جمع استعمال ہے لیکن اس سے مراد صرف عبداللہ بن ابی ہے۔ [3]

---

[1] تفسیر در منثور ج ۲ ص ۲۹۳، الکافی ابن حجر ص ۵۶، تفسیر المنار ج ۶ ص ۳۶۷، تفسیر کشاف اسی آیت کے ذیل میں، جامع الاصول ج ۹ ص ۴۷۸، تفسیر طبری ص ۱۶۵، کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۱، تفسیر رازی ج ۳ ص ۴۳۱، اسباب النزول واحدی ص ۱۴۸۔

[2] پ ۴ س ۳ آل عمران آیت ۱۷۳

[3] طبری ج ۲۸ ص ۷۱، سیوطی ج ۶ ص ۲۲۳

نیز سورۂ توبہ کی آیت ۱۶۱ اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۵۴ میں بھی جمع کا لفظ استعمال کر کے مفرد مراد لیا گیا ہے۔

اب جبکہ اہلسنت کے بزرگ ترین علماء نے اس آیت کے شان نزول کے بارے میں اقرار و اعتراف کیا ہے تو اب اسمیں کوئی شبہ نہیں ہے کہ رسولخدا کے بعد امام اور پیشوا صرف حضرت علیؑ ہیں جنکی ولایت کا خدا و رسولؐ کی ولایت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

●

ملکی و شرعی سرحدوں کا نگہبان؟

عصر حاضر کے مسیحی مذہب کے فکری و عقائدی نظام کی بنیاد روحانی اور معنوی دعوت پر قائم ہے دین عیسائی کا خلاصہ آجکل صرف جنت کی بشارت اور اسکی طرف دعوت دینا رہ گیا ہے۔ لیکن اسکے برخلاف اسلام ایسا مذہب نہیں ہے جو چند خشک دینی رسموں تک ہی محدود ہو۔

اصیل و مقدس و با مقصد چیز کی طرف دعوت، اور ایسے احکام کی تشریع جو مادیات و معنویات دونوں پر شامل ہوں، اور رسول اسلام کا مختلف جنگوں میں شرکت کرنا اور ان چیزوں کا اسلام کے بنیادی اجزا میں شمار ہونا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس الٰہی دین کا مقصد ایک ایسا نظام حکومت قائم کرنا ہے جسکے مقاصد نجات بخش و بلند ہوں اور اس قسم کے ہوں جو انسانوں کو اپنی طرف کھینچ لیں تاکہ انسان اپنی قدر و قیمت کو پہچان کر اپنی زندگی کیلئے ایسا ہر و گرام منتخب کر سکے جس کے ذریعہ قطعی طور سے آئین توحید کی حفاظت کر سکے اور اسلامی سرزمین سے ہر قسم کے تجاوز و سرکشی کو روک سکے اور الٰہی قوانین کا صحیح طریقہ سے نفاذ کر سکے۔

چونکہ یہ حکومت احکام خدا کے حفاظت کی ذمہ دار ہے اس لئے دشمنان اسلام و مخالفین اسلام کے کسی بھی قسم کے دباؤ یا عظیم ترین فشار

سکے باوجود مسلّم احکام الہی کے ایک جزو کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوگی۔
اور نہ ہی نفاذ احکام میں کسی قسم کی چشم پوشی کرے گی۔

اگر اصولی طور سے دینی رہبری کو حکومت سے جدا کر دیا جائے اور دینی نظام کو سیاسی نظام سے بالکل ہی الگ کر دیا جائے۔ دینی نظام صرف لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے تک محدود ہو جائے تو دین کے نفاذ کی ذمہ داری نہیں لی جا سکتی بلکہ اگر علماء و مفکرین و دانشمند حضرات سعی و کوشش کر کے لوگوں کو مذہب سے آگاہ بھی کریں اور چاہیں کہ لوگ عملی طور سے مذہبی زندگی کے پابند ہو جائیں تب بھی دین کے احکام کا نفاذ ناممکن ہے کیونکہ ظالم و جابر حکومت ایسے نظام کو چلنے نہیں دیگی جو انسانی سعادت کا تو ذمہ دار ہو لیکن حکومت باطل کے لئے ضرب کاری ہو خصوصاً ان احکام کے نفاذ میں روڑے اٹکائے گی جو اسکی حکومت کیلئے خطرہ ہوں اور یہ باطل حکومت ایسے دقیق پروگرام کو معاشرے میں نافذ کرے گی جس سے اسکی حکومت مضبوط و مستحکم ہو جائے۔

اسلئے اگر دین معاشرے کی نجات و سعادت کا خواہشمند ہے کہ معاشرہ اسکی تعلیم کے مطابق چلے تو اسکو رہبری کے مسئلہ میں غور و فکر کرنا ہوگا۔ اور ایسے دستور نافذ کرنے ہونگے جس کے ذریعہ سے معاشرے میں مذہب مستقر ہو جائے اور دین کی ترقی کے لئے رستہ ہموار ہو جائے۔

خود اسلام اور اس سے پہلے جو توحیدی مذاہب گذرے ہیں انھوں نے صالح نظام کی برقراری پر بھرپور توجہ صرف کی ہے اور یہ اصل

منطقی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا ہے بانیان مذاہب کی پوری کوشش اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ انکی تبلیغی مساعی کا ثمرہ حوادث تاریخ کے رحم و کرم پر نہ رہے۔

اسلامی حکومت ــــ یعنی امور امت کا بندوبست ــــ کی بنیاد اس وقت سے پڑی ہے جب آنحضرتؐ نے ہجرت کر کے مدینہ میں نزول اجلال فرمایا۔ اسی زمانہ سے اسلامی حکومت کے نظام کا سسٹم مشخص ہوا ہے۔

جس دن سے رسولؐ اسلام نے مشرکین و گمراہوں کے نہ چاہنے کے باوجود مکتب توحید کی بنیاد رکھی اور اسکی راہ سے کانٹوں کو الگ کیا اسی دن سے سیاسی، اقتصادی، جغرافیائی، فرہنگی میدان میں اسلام کا بول بالا ہونا شروع ہوگیا لائق افراد کو حضورؐ نے بعض امور کی ذمہ داری سونپ دی تاکہ وہ لوگ اپنی حسن تدبیر و لیاقت سے تمام ان امور کو ترقی دیں جنکا تعلق ملکی انتظامیہ سے ہے۔

حق کی نشر و اشاعت و برقراری عدالت کی خاطر جو جنگیں لڑی گئیں اُن میں جیسے ہی کوئی سرزمین فتح ہوتی تھی آنحضرتؐ فوراً وہاں حاکم و قاضی کو معین کر دیتے تھے۔ اور فرہنگ عمومی و نشر دینی و مذہبی تعلیم میں وسعت دینے کیلئے معلم و استاد کا تقرر کر دیتے تھے۔ بلکہ اس خطۂ زمین میں اگر غیر مسلمان آباد ہوتے تھے تو انکی بھی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔

قرآن مجید نے بھی رسولؐ کو حاکم و قاضی کے عنوان سے متعارف کرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ (پ ۶ س مائدہ آیت ۴۸) جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے اسی کے مطابق تم حکم دو اور جو حق بات خدا کی طرف سے آچکی ہے اس سے کترا کے ان لوگوں کے خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو۔

درحقیقت زمین پر حکومت الہی کی بنیاد رکھنے والے انبیائے کرام ہی تھے اور انھیں حضرات نے لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ صالح مومنین کے ہاتھ میں زمام حکومت ہونی چاہیئے۔ اسی طرح قرآن جناب یوسف کا تعارف بھی حاکم کے عنوان سے کرا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ [1] اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہونچے تو ہم نے ان کو حکم و علم عطا کیا۔

اور جناب داؤد کے لئے ارشاد ہوتا ہے: يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ [2] اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا لہٰذا تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کرو اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ پیروی تم کو خدا کی راہ سے بہکا دے گی۔

حدود، دیات، قصاص اور دیگر وسیع ابواب فقہ اس اسلامی حکومت کے تطبیقی و تنفیذی قوانین ہیں جسکی بنیاد رسول خدا نے رکھی تھی۔

---

[1] پ ۱۲ س یوسف، آیت ۲۲۔
[2] پ ۲۳ س ص، آیت ۲۶

●

فردی و اجتماعی حقوق کی حفاظت اور عدالت و رحمت کی توسیع کیلئے سب سے اچھا راستہ صالح افراد کی حکومت ہے اور سب سے اعلیٰ و صالح حکومت معصوم کی حکومت ہے۔ جس کے سایہ میں تمام انسانی حقوق محفوظ ہو سکتے ہیں کیونکہ جب حاکم وقت خدا کا منتخب کردہ ہے تو درحقیقت وہ خدا کی حکومت ہے۔ صرف خدائی نمائندہ کے زیر سایہ امید کی جا سکتی ہے کہ انسان اپنی شخصیت، عزت اور تمام حقوق کی حفاظت کر سکتا ہے کیونکہ انسانی حیثیت کی رعایت اور استقرار عدالت کی سعی و کوشش اس حکومت کے بنیادی اصول ہیں۔ اور یہ چیزیں الٰہی قیادت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ہیں۔

ورنہ ظالم حکومتیں، فاسد و سرکش حاکم بھی حقوق انسانی کے دفاع کا دم بھرتا ہے۔ اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں فردی و اجتماعی حقوق کی حفاظت کرنے والا ہوں اور یہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ عملی طور پر یہ لوگ انسانی شرف کو پامال کرتے ہیں اور انکی حکومت کا نتیجہ قوم پرستی، حق کشی، جھوٹی سیاست کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

قیادت حقہ کی اہمیت اور دینی احکام کی نشر فضیلت و دیانت کے لئے سعی و کوشش، اور حق و آزادی کیلئے انکا مطمع نظر اسی طرح واضح و ناقابل تشکیک ہے جسطرح ظالم و فاسد حکام کی حکومت میں فردی و اجتماعی حقوق کا ضیاع، اہم مسائل کی طرف سے لاپرواہی ناقابل شک و تردید ہے۔

جو شخص امت مسلمہ کی ہدایت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا

ہے اور دینی حکومت کی سربراہی کا خواہشمند ہے اور جانشین رسول ۔ کہلانا چاہتا ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام سے علم و عمل، دانش و بینش، حکمت و معرفت، اور طرز فکر میں مشابہت رکھنے کے علاوہ اخلاقی خصائل، روحانی فضائل، طہارت و عصمت، نفوس انسانی کی تہذیب و تربیت، حقائق دین کی پوری پوری واقفیت و معرفت بھی رکھتا ہو تاکہ اساس حق اور مبانی شریعت کے مطابق سوالات کے جوابات دے سکے اختلافات میں حل و فصل کی صلاحیت رکھتا ہو ورنہ اسلام ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھ میں زمام حکومت دینے کیلئے تیار نہیں ہے اور نہ اسلامی معاشرے کو ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں دے دینے کا قائل ہے ۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ طالوت کو انکے قوم پر زعامت و ریاست صرف علمی برتری اور ظاہری جسمانی طاقت کی بنا پر دی گئی تھی جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے : اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ [1]

(نبی نے کہا) خدا نے اسے تم پر فضیلت دی ہے اور زمان میں نہ صرف علم اور جسم کا پھیلاؤ تو اس کا خدا نے زیادہ فرمایا ہے ۔

جسطرح رسول خدا شخصاً دونوں منصب کے حامل تھے اسی طرح جو بھی رسول کا جانشین ہونا چاہتا ہے دونوں خصوصیت کا حامل ہو یعنی مبدا ہستی سے ارتباط خاص رکھتا ہو اور امت اسلامی کا حاکم بھی ہو !

---

[1] پ ۲ س (البقرہ) آیت ۲۴۷

اسلئے جانشین رسول میں صرف ایک پہلو (حکومت) پر اکتفا نہیں کی جاسکتی اور نہ ایسے شخص کو حکومت دی جاسکتی ہے کیونکہ یہ دونوں منصب ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جاسکتے۔ معاشرے کی حکومت کو معنوی رہبری سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ پس امام جہاں ولایت تشریعی کا حامل ہوتا ہے رسول کیطرح معاشرہ بشری کا بھی حاکم ہوتا ہے۔

امام پنجم اہل سقیفہ کے نظریہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ لوگ یہ دونوں منصب الگ الگ خیال کرتے ہیں حالانکہ قرآن کا فرمان ہے:

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا۔[1]

یا وہ (اللہ کے خاص) لوگوں سے اس فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں جو انھیں اللہ نے دیا ہے (تو اسکا کیا علاج ہے) ہم نے تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے اور انکو بڑی سلطنت بھی دی ہے۔

اس آیت کی تلاوت کے بعد امام فرماتے ہیں: آخر یہ لوگ کسطرح ان دونوں منصب کے خاندان ابراہیم میں جمع ہو جانے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن خاندان رسالتمآب میں دونوں کے جمع ہونیکو قبول نہیں کرتے۔ اور ان دونوں ناقابل تفکیک حقیقتوں کو خاندان رسول کیلئے تسلیم نہیں کرتے ہیں۔[2]

●

---

[1] پ۵ س۴ (نساء)، آیت ۵۴

[2] تفسیر عیاشی ج۱ ص۲۴۷

امامت ایک عقلی ضرورت ہے

ایک طرف تو انسان اپنی پاک فطرت اور سلیم طبیعت کی بنا پر برابر کمال کی طرف متحرک ہے شعوری یا غیر شعوری عنوان سے وہ راستہ پر گامزن ہے بلکہ انسانی کرامت کے آخری درجہ تک پہونچنے کیلئے مشتاق ہے اور فطرت انسان کے اندر یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اور وہ اپنی معنوی احتیاج کا احساس کرتے ہوئے لگاتار کوشش میں ہے کہ بلند سے بلند مرتبہ تک پہونچ جائے اور اس تکوینی راستہ میں کئی مختلف منزلیں ہیں جو مضبوطی کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

اور دوسری طرف خود انسان کے باطن میں ایسے دشمن موجود ہیں جو اسکو منزل کمال تک پہونچنے سے روک سکتے ہیں۔ اور وہ انسان کی نامربوط خواہشات ہیں انسان کو چاہیئے کہ ان تمام پسند خواہشات سے جو اسکے سر نکال ہیں روڑے اٹکاتی ہیں بلکہ انکی کوشش ہوتی ہے کہ اسکو شیطانی خواہشات کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادے انسے مسلسل جنگ کرتا رہے۔ اور شاہراہ تکامل پر گامزن رہے۔

انسان جب تک قید حیات میں گرفتار ہے اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنا مطمع نظر کمال کو بنائے اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ۔

انسانی معاشرے میں ایک ایسا تکامل فرد ہونا چاہیئے جو تمام روحانی مزایا کا حامل ہو احکام الہی کی گہرائی تک پہونچا ہو بال برابر اسمیں انحراف نہ پایا جاتا ہو۔ یعنی وہ شخص معصوم ہو۔

اور یہی معصوم کاروان انسانیت کا قائد اور فیض ربانی کا واسطہ اور عالم غیب ونوع انسانی کا رابطہ ہوتا ہے۔ یہ خدا سے ڈائریکٹ بغیر کسی واسطہ کے ہدایت حاصل کرتا ہے۔ تاریکیوں کے سمندر کا منارہ نور ہوتا ہے اور یہی ہر انسان کو اپنی آسمانی تعلیم وہدایت کے ذریعہ اسکے استعداد کے مطابق منزلِ کمال تک پہونچاتا ہے اور اسکو قداست وعدل وتوحید کے منبع تک پہونچاتا ہے۔

لیکن اگر معاشرہ اس الہی شخصیت سے محروم ہو تو پھر انسان نہ منزل کمال تک پہونچ سکتا ہے۔ اور نہ ہی نوع انسانی وغیب رحمانی کے درمیان کوئی رابطہ و واسطہ باقی رہ جاتا ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کی حرکت تکاملی اپنے متوقع نتیجہ تک نہیں پہونچ پاتی ـــــ

جس خدا نے انسان کو ایسی قوتوں سے آراستہ کیا ہے جو ہمیشہ کمال کی خواہشمند رہتی ہیں اور جس اللہ نے انسان کو یہ ذاتی استعداد بخشا ہے کہ وہ مدارج کمال تک پہونچ سکے اسکے لئے محال ہے کہ منزل مقصود تک رسائی کیلئے اسکی رہنمائی نہ کرے اور ان وسائل واسباب کو اسکے لئے مہیا نہ کرے جن سے وہ کمال کی چوٹی تک پہونچ سکتا تھا۔

یقیناً بے پناہ الطاف الہی کا تقاضا ہے کہ حقائق دین تک پہونچنے کے لئے اسکی رہنمائی کرے اور ایسا راستہ دکھائے جو دنیا وآخرت کی سعادت

کا ضامن ہو ۔ اور خداوند عالم نے اپنے مومن بندوں کیلئے اس جامع و مکمل پروگرام کو اپنے انبیاء کے ذریعہ بھیجا بھی ۔

●

عقیدہ توحید کی بنیادی چیز یہ ہے کہ نظام آفرینش پر خداوند عالم کے علاوہ کسی اور کی حکومت ہے نہ ہو سکتی ہے ۔ اور یہ انسانوں کی دنیا بھی چونکہ کل کائنات کی ایک جزو ہے لہٰذا اس پر بھی خدا ہی کی حکومت ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ آدمی اپنے دائرہ اعمال کے اندر آزاد و خود مختار ہے اور یہ بھی اس بنیادی ارادہ کے پیش نظر ہے جو اسکے سپرد کیا گیا ہے ۔ لیکن اس جزو (انسان) کو کل کائنات ہستی سے اپنے کو ہم آہنگ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ خدائی احکام پر عمل کرے تاکہ حکومت الٰہی میں کوئی تصرف مرضیٔ خدا کے بغیر نہ کرے ۔ پس کر اسنے پیغمبر کے لائے ہوئے قوانین کا احترام نہیں کیا اور مخالفت کی تو اسنے انسان (یعنی کل کائنات ہستی کے ایک) جزو مختصر اور عالم کبیر کے درمیان ناہم آہنگی ایجاد کی ۔ اور صحیح راستہ سے ہٹ گیا اور انحراف کی طرف مائل ہو گیا ۔

اور جس طرح وحی الٰہی و رسول اسلام کے احکام کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے ۔ اسی طرح جو شخص نبی اکرم کے جانشین کے عنوان سے اسلامی معاشرہ کا حاکم ہو اس کیلئے بھی ضروری ہے انھیں جہات باطنی و ارتباط مخصوص بہ مبدء کا دارا ہو جو رسول اسلام کے لئے تھیں تاکہ اسکی اطاعت بھی خداوند عالم کی اطاعت قرار پائے ۔

رسول اسلام نے جس وقت سے حکومت حقہ کی بنیاد رکھی اور ایک

نورانی ماحول بنانے کیلئے زمین ہموار کی اسی وقت سے انسانی تربیت کی ذمہ داری جو آپکے سر پر تھی اسکو بذات خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن چونکہ آنحضرتؐ کی زندگی بھی دوسرے ابنائے بشر کی طرح ایک مختصر مدت کے بعد ختم ہوجانے والی تھی۔ اور معاشرہ اس عظیم مربی و بانی سے محروم ہو جانے والا تھا اس لئے ضروری تھا کہ آپکا جانشین — یعنی وہ صالح و شائستہ انسان جس میں زعامت مسلمین کے تمام شرائط موجود ہوں — اس نظام کو اسی طرح چلائے جس طرح رسولؐ چلایا کرتے تھے

یعنی وہ جانشین جو تمام کمالات اور انسان کامل کے تمام خصوصیات کا حامل ہو اور اپنے تمام پیروکاروں کو روحانی غذا دے سکتا ہو۔ اور ان کو صراط مستقیم کی طرف اور خدا اور اسکے احکام کی اطاعت کیطرف لے جاسکتا ہو وہ مسند خلافت پر متمکن ہو تو ایسی صورت میں لوگوں کے لئے سیدھا راستہ کھلا ہوگا اور ہر شخص اپنے کو نیک بخت بنا سکنے پر قادر ہوگا۔

●

اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ دنیا و آخرت کے درمیان کوئی خط فاصل نہیں ہے جسمانی زندگی کے پیکر اس کو حیات نفسانی و روحانی کے مقررات و موازین سے جدا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی دنیا و آخرت کے ذمہ دار الگ ہیں اسی لئے امام معصوم کہ کے ہاتھ میں جو خدا کا منتخب کردہ ہوتا ہے دنیا اور آخرت کی حکومت کو ہونا چاہیئے تاکہ وہ تمام ملتوں اور قوموں کے مقابلے میں اسلام کے عالمی مصالح کی حفاظت کر سکے۔ اس برحق پیشوا اور زمین پر خلیفۂ خدا کی برکت سے تمام لوگوں کے

لئے حقیقی سعادت کا راستہ ــــ جو صرف ایک ہی ہوتا ہے ــــ کھل جاتا ہے اور وہ اپنی حکیمانہ روش سے اس راستہ کی طرف رہبری کرتا ہے جس کے تمام نتائج اصلی و پاک و خالص ہوتے ہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ بارہ اماموں میں سے صرف حضرت علیؑ ایک محدود مدت کیلئے مسند نشین خلافت ہوئے اور دیگر ائمہ تخت خلافت پر نہیں بیٹھے لیکن یہ تقصیر لوگوں کی ہے کہ انھوں نے قرآن کی حکومت اور فرہنگ اسلامی کو نشر کرنے ہی نہیں دیا۔ یعنی آئمہؑ کو تخت حکومت تک نہیں پہونچنے دیا اور اس طرح لوگوں نے خود اپنا نقصان کر لیا۔ ورنہ خدا نے تو اپنی حجت مخلوق پر تمام کر دی تھی اور لوگونکو اپنے شائستہ و برگزیدہ افراد کی نشاندہی کر دی تھی جو نہ صرف امت اسلامی اور مسلمانوں کے لئے مفید تھے بلکہ ان حضرات کا وجود دنیائے بشریت کیلئے فائدہ مند تھا۔

اسکے علاوہ امام کا وجود صرف حکومت و خلافت ہی کیلئے مفید نہیں تھا بلکہ انکے وجود سے بہت سے فوائد وابستہ تھے۔ امام حق کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے احکام الٰہی کو تحریف و تبدیل سے بچانے والا ہوتا ہے۔ خدا و رسولؐ کیطرف سے اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ حقائق دینی، مطالب قرآن سے آگاہی، معاشرے کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دے۔

مزید برآں چونکہ ذات امام فیضان الٰہی کا مرکز ہوتی ہے اسلئے اگرچہ لوگ اپنی نااہلی یا سستی کیوجہ سے معصومینؑ کی حکومت عدل و انصاف سے تو محروم رہے۔ مگر وجود آئمہؑ سے وابستہ دیگر فوائد سے بہرہ مند ہوتے رہے۔ کیونکہ جب یہ حضرات مخلوق الٰہی کے لئے فیضانِ خداوندی کا ذریعہ

ہیں۔ تو چاہے مسند حکومت پر متمکن ہوں یا نہ ہوں انکے وجود مقدس سے جریان خیر ہوتا ہی رہتا ہے۔ استعداد میں ترقی ہوتی ہی رہتی ہے لوگ ان سے استفادہ کرتے ہی رہتے ہیں۔

نیز ہر حالت میں انکی خصوصی توجہ سے اساس دین کی پائداری ہوتی رہی، اسلام کا فرہنگی مستقبل انکی معصومانہ رہبری سے مرتبط رہا۔ انکا مسلمانوں کے درمیان موجود ہونا ہی بہت سی بنیادی تحریفوں سے اسلام کے بچانے کا سبب بنا۔

●

حضرت علیؑ ایک بیدار مغز اور ہوشیار نگراں کی طرح رفتار زمانہ کے نباض رہے۔ جہاں کہیں غلط فیصلے ہوتے یا کسی حکم میں تحریف کی جاتی یا کسی پر ناجائز حد جاری ہوتی آپ فوراً ادھر متوجہ ہو جاتے اور صحیح حکم کی طرف ہدایت فرماتے۔ اصول و فروع کیطرف خصوصی نظر رکھتے تھے۔ جہاں بھی آپکے رہبری کی ضرورت ہوتی فوراً رہبری فرماتے مختلف مذاہب کے علماء مختلف مقامات سے مختلف مشکل سوالات وحی پیغمبرؐ سے پوچھنے جب بھی مدینہ آتے آپ فوراً انکو اطمینان بخش جواب دیکر مطمئن کر دیتے۔

انھیں آئمہ کے وجود کی برکت تھی کہ اسلامی معارف، قانونی تعلیمات تربیتی و اجتماعی قوانین اس کثرت سے مسلمانوں میں رائج ہوئے اور قرآن کے زندہ احکام معاشرے میں پھیلے۔ انتہا یہ ہے کہ وحشت و بربریت والی حکومتوں میں، اور خلافتوں کے گونا گون واقعات میں، جبکہ لوگ سرکشی، فساد بے خبری میں ڈوبے ہوئے تھے اور انکی تمام تر کوشش حق و حقانیت کے

محدود کرنے پر لگی تھی، معاشرے کے ذہن کو اسلام سے بغاوت کرنے پر آمادہ کیا جا رہا تھا اسوقت ان حضرات نے دانش و حکمت کے چشمے بہا دیئے اور اسطرح سے حق کی حفاظت کی اور معاشرے کو مزید معلومات فراہم کیں۔

بعض خلفاء نے امام کی علمی قدر و منزلت کو مجروح کرنے کیلئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی، مختلف مذاہب علماء اور امام کے درمیان بحث و مناظرہ کی مجالس تشکیل دی لیکن اسکا نتیجہ برعکس نکلا یعنی امام کی علمی منزلت مزید واضح ہو کر دنیا کے سامنے آگئی اور اس کی وجہ سے اسلام و مسلمان و حق کا بول اور بالا ہو گیا۔

یہی حضرات جو تعلیمات رسولؐ کے سچے وارث تھے انھیں کے وجود کی برکت کی وجہ سے توضیح دین، عقائد حقہ کے نشر و استدلال، اخلاق، فقہ سلوک فکری و باطنی معارف کے مختلف ابواب کے سلسلہ میں جو حدیثیں آئی تھیں وہ لوگوں کے دسترس میں آگئیں اور اسی سرمایہ علمی کی بنیاد پر ان میں یہ قدرت پیدا ہو گئی کہ علوم اسلامی کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کیا جا سکے خصوصاً موجودہ فقہ کے مقابلے میں فقہ صحیح کو رواج دیا جا سکے اور اسی بنا پر ابد تک ان لوگوں نے دینی معارف کی شمع روشن کر دی۔

اگر ہم اہلبیتؑ کی اسلامی خدمات کے مختلف شعبوں میں اندازہ کرنا چاہیں خصوصاً زمانہ کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انکی خدمات کا ادراک کرنا چاہیں تو اہلبیتؑ کی حدیثوں اور آئمہ طاہرینؑ کی حدیثوں کا موازنہ کر لیں تو حقیقت برہنہ ہو کر ہمارے سامنے آجائیگی اور اسوقت ہمکو اندازہ

ہو سکے گا کہ آئمۂ شیعہ نے عمیق و اصیل دینی افکار اور معرفت کے مختلف شعبوں میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں بلکہ اہلسنت کے فقہاء و علماء بھی انکے علوم و معارف سے محروم نہیں رہے اور انکے محققین تو ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ کافی مستفید ہوئے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کی شخصیت وہ ہے کہ جنھوں نے فلسفہ، کلام، ریاضیات و کیمیا کے دروازے لوگوں کیلئے کھول دیئے امام ششم کے شاگردوں میں مفضل بن عمر، مومن الطاق، ہشام بن الحکم، ہشام بن سالم، جیسے یگانۂ روزگار علماء کا نام آتا ہے جنھوں نے فلسفہ و کلام میں ایسی مہارت کا ثبوت دیا ہے جسکی مثال سابقین و لاحقین میں نہیں ملتی۔

جابر بن حیان جنکو ریاضیات و کیمیا کا بابا آدم کہا جاتا ہے امام ششم کے شاگرد تھے۔ زرارہ، محمد بن مسلم، جمیل بن دراج، حمران بن اعین، ابو بصیر، عبداللہ بن سنان جیسے حضرات فقہ، اصول، تفسیر میں اکسپرٹ تھے[1] اور ان سب کو امام جعفر صادقؑ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

مناقب کے اندر علامہ ابن شہر آشوب فرماتے ہیں: امام جعفر صادقؑ سے جتنے علوم نقل کئے گئے ہیں کسی بھی شخص واحد سے اتنے علوم منقول نہیں ہیں۔ اصحاب حدیث نے اختلاف نظریات کے باوجود جن معتبر راویوں کے اسماء نقل کئے ہیں انکی تعداد چار ہزار ہے۔

حافظ ابو نعیم اپنی کتاب "حلیۃ الاولیاء" میں فرماتے ہیں:

---

[1] امام صادق و مذاہب اربعہ

جعفر الصادقؑ سے بہت سے آئمہ اور اعلام نے حدیث نقل کی ہے [1]
مثلاً: مالک ابن انس، شعبہ بن الحجاج، سفیان الثوری، ابن جریج، عبداللہ بن عمرو، روح بن القاسم، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن بلال، اسماعیل بن جعفر حاتم بن اسماعیل، عبدالعزیز بن المختار، وہب بن خالد، ابراہیم بن طہمان، ابوحنیفہ، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید، اور انکے علاوہ دیگر فقہا و محدثین بھی ہیں۔ مسلم نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث نقل کرکے احتجاج بھی کیا ہے۔

ابن ابی الحدید معتزلی جو اہلسنت کے بڑے عالم شمار ہوتے ہیں حضرت علیؑ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: میں اس شخص کا کیا تذکرہ کر سکتا ہوں کہ جس کی طرف لوگ تمام فضائل انسانی کی نسبت دیتے ہیں ہر فرقہ انکو اپنے میں شمار کرتا ہے۔ ہر فضیلت کا خاتمہ انکی ذات پر ہوتا ہے تمام علوم کی انتہا انکی ذات پر ہوتی ہے۔ اشرف ترین دانش فلسفہ الٰہی ہے جو حضرت علیؑ کے کلام سے ماخوذ ہے۔ واصل بن عطا جو معتزلہ گروہ کا رئیس ہے اور انکا رہبر ہے انکے استاد دو واسطے سے حضرت علیؑ کے شاگرد رہے [2]۔ اشاعرہ کے پاس جو کچھ ہے سب کا سرچشمہ علیؑ ہیں۔ [3]
علم کلام، فلسفہ شیعہ، فلسفہ زیدیہ کا منبع بلاشک و شبہ حضرت علیؑ ہیں

---

[1] مناقب ابن شہر آشوب حنفی ج ۳ ص ۲۴۸، اور امام صادقؑ و مذاہب اربعہ ج ۳

[2] کیونکہ واصل کے استاد ابو ہاشم ہیں اور انکے استاد محمد حنفیہ حضرت علیؑ کے شاگرد تھے (مترجم)

[3] کیونکہ اشعری فرقہ ابوالحسن علی بن اسماعیل کی طرف منسوب ہے اور ابوالحسن جبائی کے شاگرد ہیں اور جبائی =

علم فقہ اصل علم ہے ہر اسلامی فقیہ حضرت علیؑ سے مستفید ہے مثلاً ابو حنیفہ امام جعفر صادقؑ کے شاگرد ہیں اور چند واسطوں سے حضرت علیؑ کے شاگرد ہیں۔ شافعی محمد بن حسن کے شاگرد اور محمد ابو حنیفہ کے۔ احمد بن حنبل شافعی کے شاگرد ہیں۔ مالک بن انس نے ربیعۃ الرای سے پڑھا۔ ربیعۃ کے استاد عکرمہ تھے۔ عکرمہ عبد اللہ بن عباس کے شاگرد تھے۔ اور ابن عباس حضرت علیؑ کے شاگرد تھے۔ یہ چاروں فقہا حضرت علیؑ کے شاگرد ہیں فقہائے شیعہ کا حضرت علیؑ کی طرف رجوع خارج از بیان ہے۔

علم تفسیر میں تو حضرت علیؑ سب کے استاد تھے ہی۔ تفاسیر کا مطالعہ کیجیے! مسئلہ آپ پر واضح ہو جائیگا ابن عباس کی تفسیر زیادہ ہے اور وہ حضرت علیؑ کے شاگرد ہیں۔ ابن عباس سے پوچھا گیا آپکے علم کی نسبت حضرت علیؑ سے کیسی ہے؟ فرمایا: جو نسبت قطرہ کی دریا سے ہے حضرت عمر حضرت علیؑ سے مسائل پوچھتے اور بارہا کہا تھا: اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ معتزلہ اپنے کو حضرت علیؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ علم نحو کے موجد حضرت علیؑ تھے۔ جنھوں نے ابو الاسود کو اسکی تعلیم دی تھی۔

معتزلہ کے مشہور فرقوں میں سے ایک ہیں۔ مترجم۔

الٰہی قوانین کی تفسیر کون کر سکتا ہے؟

ہمیشہ سے یہ بات مسلم رہی ہے کہ معاشرے کیلئے علماء و دانشمند و متقی حضرات اپنی فکری و علمی کوششوں سے جو قوانین بناتے رہے ہیں انکے نفاذ کے لئے کچھ ایسے بیدار مغز افراد کا ہونا ضروری ہے جو ان قوانین کی تفسیر و تشریح کر سکیں یہ کلیہ اتنا عام ہے کہ اسلامی قوانین "جنکا دارومدار وحی الٰہی و سنت رسولؐ پر ہے" بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

خود قرآن مجید جو اسلامیات کے درک و استنباط کا ایک اصیل، منبع اور بہترین بنیادی ماخذ ہے اسکی بعض آیتوں کی دلالت واضح نہیں ہے اور ان سے یقینی مطلب حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ان مبہم آیات کو وضاحت کیلئے ایک تفسیر کی شدید ضرورت ہے۔ کیونکہ قرآن مختلف چیزوں کیلئے اپنے پروگرام بطور اصول کلی اور اصول عامہ بیان کرتا ہے۔ احکام کے جزئیات سے کبھی بھی تعرض نہیں کرتا صرف کلیات کو بیان کرتا ہے اس لئے کوئی بھی شخص صرف فرامین خداوندی سے احکام کی کامل معرفت نہیں حاصل کر سکتا۔

آیتوں اور روایتوں کے مفہوم سمجھنے میں بہت زیادہ اختلاف رائے

ہوتا ہے۔ اور ان سے مختلف استنباط کیئے جاتے ہیں اور اسی لئے اسلام کے اصلی مفاہیم میں کافی تحریف و تغییر ہوجاتی ہے۔ اور یہیں سے صاحبانِ اقتدار کو من مانی تفسیر کرنے کا اور ایسے مفہوم حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے جو انکی حکومت و اقتدار کو مضبوط بنانے کیلئے بہت مفید ہوتا ہے۔ بنی امیہ و بنی عباس کے دورِ خلافت میں اسکی ان گنت مثالیں موجود ہیں۔

اب بتائیے کہ ایسے تلاطم خیز متموج بیز بحرِ نظریات میں جو یلائے حق کیا کرے اور ہم کیا کریں؟ جس سے ایک حق ناآشنا شخص منزل تک پہونچ جائے؟ کیا ان حالات میں ایک ایسے شخص کی طرف رجوع کرنا ضروری نہیں ہے؟ جو مرکزِ علم مرجعِ فقہ ہو، معصوم ہو، حق آگاہ ہو، صاحبِ نظر ہو، تمام چیزوں پر محیط ہو، آسمانی کتابوں پر مسلط ہو، دانشِ پیغمبرؐ کا وارث ہو؟ اور جو ہمکو قرآن کے اصلی مقاصد سے آشنا کردے، قرآن کے احکام کو عملی جامہ پہنادے، احکام الٰہی کے حدود اسطرح معین کردے جس میں تاویل کی گنجائش ہی نہ ہو۔ اور وہ اصول قرآنی کی تشخیص، توضیح، تشریح، استدلال وحی الٰہی کے سہارے کرے تاکہ تمام مسلمانوں کیلئے دلیل قطعی ہو اور نظریاتی اختلاف میں اس کا قول قولِ فیصل ہو۔

اور اگر ہم نے قرآن کے ساتھ عقدہ کشان تفسیر کو نہ رکھا تو ابہام و گمراہی و ضیاعِ فکری کے نذر ہو جائینگے اور دور از کار تفسیروں کی وجہ سے حقائق قرآن سے بہت دور جا پڑیں گے۔

●

امام جعفر صادقؑ نے اپنی زندگی میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم کی

تھی جسکا مقصد یہ تھا کہ علماء کا ایک ایسا گروہ تیار کر دیا جائے جو لوگوں کو تعلیم دینے کے ساتھ جعلی حدیثوں کے بنانے والوں کے چہروں سے نقاب نوچ لے۔ اور شر و فساد برپا کرنیوالے عناصر، غلط مفاہیم بیان کرنیوالے افراد، غرض آلودہ نظریات پھیلانیوالے لوگوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ حسن اتفاق یہ تھا کہ اسوقت کا سیاسی ماحول اس کیلئے سازگار بھی تھا۔

●

ایک دن حضرت صادقؑ اپنے ان اصحاب و شاگردوں کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے جنھوں نے حضرت کے علم و فکر سے استفادہ کر کے عظیم علمی ثروت امت مسلمہ کے لئے جمع کر دیا ہے۔ انہیں ہشام بن حکم بھی تھے امامؑ نے ہشام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: عمرو بن عبیدہ سے جو تمہارا مناظرہ ہوا تھا بیان نہیں کرو گے؟

ہشام : حضور کے سامنے دہراتے ہوئے شرم آرہی ہے۔

امامؑ : جو صورت حال ہوئی ہو اسکو بیان کرو۔ "شرم نہ کرو"

ہشام : مجھے یہ خبر ملی کہ عمرو بن عبیدہ مذہبی امور کا متصدی ہو گیا ہے اور مسجد بصرہ میں ایک جلسہ بھی کرتا ہے۔ مجھے یہ بات بہت شاق گزری چنانچہ میں روانہ ہوا اور جمعہ کے دن بصرہ وارد ہوا اور مسجد بصرہ پہونچ کر دیکھا کہ ایک بہت بڑے حلقہ کے درمیان وہ بیٹھا ہوا ہے اور لوگوں کے سوالات کے جوابات دے رہا ہے۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح اس کے پاس پہونچ گیا اور اس سے کہا میں ایک مسافر ہوں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ

مجھے سوال کرنے کی اجازت دیں گے ؟

عمرو : ہاں ہاں

ہشام : کیا آپ کے آنکھیں ہیں ؟

عمرو : بیٹا یہ کون سا سوال ہے؟ جو چیز تم خود دیکھ رہے ہو اس کے بارے میں سوال کرنے کا کیا فائدہ؟

ہشام : جناب میں تو اسی قسم کے سوال کرونگا آپ جواب مرحمت فرمائیں تو پوچھوں؟

عمرو : اچھا پوچھو !

ہشام : کیا آپ کے آنکھیں ہیں ؟

عمرو : ہاں ہیں !

ہشام : اس سے آپ کیا کام لیتے ہیں ؟

عمرو : اس سے رنگوں کو اور انسانوں کو دیکھتا ہوں !

ہشام : کیا آپ کے ناک (بھی) ہے ؟

عمرو : ہاں ہے !

ہشام : اس سے آپ کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو : سونگھنے کا کام لیتا ہوں !

ہشام : کیا آپکے پاس منہ ہے ؟

عمرو : ہاں ہے !

ہشام : اس سے آپ کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو : اس سے چیزوں کا مزہ چکھتا ہوں !

ہشام : کیا آپ کے کان ہے؟

عمرو : ہاں ہے!

ہشام : اس سے آپ کیا کرتے ہیں؟

عمرو : آوازوں کو سنتا ہوں!

ہشام : آپ کے پاس دل ہے؟

عمرو : جی ہاں ہے!

ہشام : اس سے بھلا آپ کیا کام لیتے ہیں؟

عمرو : دل ہر چیز کے پرکھنے کا معیار ہے۔ جو چیزیں اعضاء و جوارح پر وارد ہوتی ہیں دل کے ذریعہ ان کے درست اور نادرست ہونے کو جانچا جاتا ہے!

ہشام : کیا کوئی عضو دل سے بے نیاز نہیں ہے؟

عمرو : نہیں!

ہشام : آخر جب سارے اعضاء و جوارح صحیح و سالم ہیں تو پھر دل کی کیا ضرورت ہے؟

عمرو : صاحبزادے جس وقت ان حواس میں سے کوئی اپنے ادراک میں خطا کرتا ہے یا شک میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس دل کی طرف رجوع کرتا ہے تاکہ وہ شک کو دور کر دے تاکہ اطمینان و یقین حاصل ہو جائے!

ہشام : اس کا مطلب یہ ہوا کہ دل بحکم خدا سے اعضاء و جوارح کے شک و تردید کو زائل کرنیوالا ہے اور حیرت و غلطی کو دور کرنیوالا ہے؟

عمرو : ہاں!

ہشام : بس تو پھر دل کا وجود آدمی کیلئے بہت ضروری چیز ہے؟ دل کے بغیر کسی عضو کی صحیح رہبری نہیں ہو پائے گی؟

عمرو : ہاں اور کیا!

ہشام : اے ابو مروان! خداوند عالم نے تمہارے اعضاء اور حواس کو تو بغیر امام و پیشوا کے نہیں چھوڑا تاکہ شک و تردید کے وقت وہ امام انکی رہنمائی کر سکے تو کیا اس پورے انسانی معاشرے کو تمام اختلافات و جہالت کے باوجود خدا بغیر امام و پیشوا کے چھوڑ دے گا؟ اور کوئی ایسا رہبر نہیں معین کرے گا جو لوگوں کی حیرت و غلطیوں کو دور کر دے؟

یہ سن کر عمرو خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوا اور بولا:

عمرو : کیا تم ہشام بن حکم تو نہیں ہو؟

ہشام : میں نے کہا جی نہیں!

عمرو : کیا ہشام کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں میں ہو؟

ہشام : نہیں!

عمرو : اچھا کہاں سے آئے ہو؟

ہشام : میں کوفہ کا رہنے والا ہوں!

عمرو : تب تو تم ہشام ہی ہو یہ کہکر اٹھا اور مجھے اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور جب تک میں وہاں رہا کوئی بات نہیں کی!

حضرت امام صادقؑ مسکرائے اور فرمایا: یہ استدلال کا طریقہ تم نے

کہاں سے سیکھا؟

ہشام: سرکار کی فیض صحبت ہی سے سیکھا ہے!

امام: خدا کی قسم یہ طریقہ استدلال صحف ابراہیم و موسیٰ میں تحریر ہے۔[1]

اس لئے احکام و فرامین الٰہی تک انسان کی دسترسی اسی وقت ممکن ہے جب امت اسلامی کا رہبر رسول خدا کے بعد ایسی شخصیت ہو جو اپنے مقام معنوی و علمی کی اہلیت کی نشاندہی کرے تاکہ خداوند عالم کے دستوروں اور احکام میں ڈائرکیٹ جن جزئیات و تفصیلات کا ذکر نہیں ہے لیکن مرحلۂ عمل میں انسان اسکا بہرحال محتاج ہے۔ انکو بیان کر سکے۔ اور اگر ایسا رہبر نہ ہوا تو امت بھی اپنے اصلی مکتب سے منحرف ہو جائے گی اور منزل سعادت تک پہونچنے سے محروم ہو جائے گی۔

پیغمبر اسلام کے بعد آئمۂ ہدیٰ تاریخ کے طویل ترین نشیب و فراز، گوناگوں و متغیر اوضاع و احوال میں قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے اور اپنی رفتار و گفتار و کردار سے مخلوق کی ہدایت و رہنمائی کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی تعلیمات کا مجموعہ ایک گنجینۂ مایہ دار و ثمر دار کی صورت میں بطور میراث امت اسلامی کے ہاتھوں لگا۔ اور اسی بنیاد پر یہ خزانہ دارائے قدرت و قیمت و حجت بن گیا۔ اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ جو بھی نیا مسئلہ یا حادثہ پیش ہو اسی سرمایہ سے اس کا حل و فصل نکالا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد ان حضرات نے اپنے کو یہ

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۱

ثابت کر دکھایا کہ ایسے معنوی مقامات مثل مقامات معنوی پیغمبرؐ ہیں۔

اور اس حقیقت سے بھی دنیا واقف ہے کہ رسولخدا کے بعد خلفاء کے اندر احکام اسلامی و مذہبی ضرورتوں کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں مثلاً حضرت ابوبکر سے صرف ۸۰ حدیثیں منقول ہیں۔ [1]

نووی نے اپنی کتاب "تہذیب" میں لکھا ہے: صدیق سے کل ایک سو بیالیس ۱۴۲ روایات نقل کی گئی ہیں: ۱۰۴ روایات سیوطی نے "تاریخ الخلفاء" میں نقل کیا ہے اور بائیس ۲۲ بخاری نے نقل کیا ہے۔ [2]

امت کے مذہبی پیشوا کیلئے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرے کے ہر فرد کی دستگیری کرے اور اسکے دینی مشکلات کو حل کرے لیکن یہاں صورتحال یہ ہے کہ پیشوا اتنا جاہل ہے کہ وہ میراث جدہ کا حکم مغیرہ بن شعبہ جیسے فاسق و فاجر سے پوچھتا ہے۔ [3]

اسی طرح اسلامی پیشوا بڑی صراحت کے ساتھ کہتا ہے: جہاں میری غلطی دیکھو ہاتھ پکڑ کر سیدھے راستے تک پہونچا دو اور وہی پیشوا کہتا ہے: میں تمہارا لوگوں کا خلیفہ ضرور ہوں حالانکہ تم سے بہتر نہیں ہوں اگر یہ دیکھو کہ صحیح راستے پر چل رہا ہوں تو میری حمایت کرو اور اگر دیکھو کہ باطل کی راہ پر گامزن ہوں تو مجھے حق کی طرف پلٹا دو۔ [4]

---

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۲ ___ ص ۱۴ [2] اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۲۳۳

[3] موطاء امام مالک ص ۳۳۵

[4] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۵۱

حضرت عمر نے رسول اسلام سے پچاس صحیح حدیثوں سے زیادہ کی روایت نہیں کی ہے۔ ؎۱

حضرت عمر کی دینی معلومات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس کو سنن ابن ماجہ کے ج ۱ ص ۲۰۰ پر لکھا گیا ہے:

ایک شخص نے عمر سے آکر پوچھا اگر میرے اوپر غسل واجب ہو گیا ہو لیکن پانی نہ مل رہا ہو تو میری شرعی تکلیف کیا ہے؟ عمر نے کہا تم سے نماز ساقط ہے حالانکہ قرآن نے ایسے شخص کیلئے صریحی طور سے تیمم کا حکم دیا ہے۔ ؎۲

عثمان کی حالت اس سے بھی گئی گزری ہے ان سے صحیح مسلم میں صرف پانچ حدیثیں اور بخاری میں نو حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ ؎۳

●

یہ سچے مبنی بر حقائق واقعات ان حضرات کی دانش دینی و علمی کی خبر دیتے ہیں جو اسلامی معاشرے کے رہبر و پیشوا تھے۔ ان حالات میں کسی کو کیسے یقین ہوگا کہ احکام الٰہی تحریف سے محفوظ رہیں گے اور اسلامی معاشرہ اپنے دینی اعلیٰ مقاصد کی طرف ترقی کرے گا؟ کیونکہ امت کے بار رہبری کو کاندھے پر اٹھانے والے کو وسیع مذہبی آگاہی اور دینی معلومات ہونی چاہیے تاکہ ہر سوال کا جواب دے سکے۔ حالانکہ خلفاء کے معلومات سچے اور دقیق اسلامی مسائل

؎۱ اضواء علی السنۃ المحمدیۃ ص ۲۰۳

؎۲ نساء آیت ۴۳ اور سورۂ مائدہ آیت ۶

؎۳ اضواء علی السنۃ ص ۲۰۳

کے بارے میں نہ ہونے کے برابر تھے اور یہی چیز مقام رہبری کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے

خلیفہ دوم نے ایک مرتبہ منبر پر عورتوں کے مہر کی زیادتی کو رد کرتے ہوئے کہا : اگر کسی عورت کا مہر اس سے زیادہ ہوا جو رسول خدا نے اپنی بیویوں کو دیا ہے تو زائد مال کو میں بیت المال میں داخل کر دونگا یہ کہکر منبر سے نیچے اترے تو قریش کی ایک عورت نے کہا : اے امیر المومنین خدا کا قول لائق اتباع ہے یا آپکا ؟ کہا خدا کا ! تو اس عورت نے کہا آپ تو مہر کی زیادتی سے روک رہے ہیں اور قرآن مجید کا اعلان ہے :

وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا الخ : اگرچہ تم ان میں سے ایک کو (جسے طلاق دینا چاہتے ہو) بہت سا مال دے چکے ہو تاہم اس میں کچھ واپس نہ لو ... الخ۔ اس پر حضرت عمر نے کہا : ہر شخص عمر سے زیادہ فقیہ جانتا ہے اس جملے کو دو تین مرتبہ دہرایا[1] بعض روایت میں اتنا اور ہے کہ دوبارہ منبر پر جاکر اپنا قول واپس لیا۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک کافر کو قتل کر دیا خلیفہ نے حکم دیدیا کہ قاتل کو قتل کر دیا جائے لیکن اتفاق سے اصحاب رسول میں سے کچھ حضرات موجود تھے جنھوں نے خلیفہ کو بتایا کہ اس صورت میں قاتل سے دیت لی جاتی ہے قاتل کو قتل کرنیکا حکم نہیں دیا جاتا تب خلیفہ نے اپنے حکم سے صرف نظر کیا[2]

---

[1] پ ۴ سورہ النساء آیت ۲۰ واقعہ کی تفصیل سنن البیہقی ج ۷ ص ۲۳۳ الغدیر ج ۶ ص ۹۶ پر ملاحظہ ہو۔
[2] سنن بیہقی ج ۸ ص ۳۳

اب آپ فیصلہ فرمائیے کیا اسلامی معاشرے کی سربراہی ایسے لوگوں کو دی جا سکتی ہے جو بقول خود احکام الٰہی سے اتنے بیگانہ ہوں؟ اور کیا ایسے لوگ معاشرے کے اندر دین خدا کے قوانین کا نفاذ کر سکتے ہیں؟ کیا واقعاً خداوند عالم نے جس امت کی قسمت کے تمام امور کا سرچشمہ وحی الٰہی کو قرار دیا ہو۔ اور تخلیق کائنات کی جو آخری امت ہو اور کائنات ہستی کا عالیترین ذخیرہ ہو گا ایسے لوگوں کے سپرد کر دیگا جو پیچیدہ مسائل کے چہروں سے پردے ہٹا سکتے ہوں؟ اور نہ امت اسلامی کو جو ایک با کمال و غیر متوقف عنصر ہے اسکو ہستی کے سنت جاریہ کے راستے پر لگا سکتے ہوں؟ بلکہ یہ چیزیں تو خیر مشکل ہیں وہ تو دین کے سادہ ترین مسائل کی وضاحت پر قادر نہیں ہیں۔ اور نہ ہی صحیح قانون شریعت کا اجرا کر سکتے ہیں تو پھر بھلا خدا انکے ہاتھ میں کیونکر پوری امت کی ڈور دے سکتا ہے۔

میں اسکا فیصلہ ان عقلوں پر چھوڑتا ہوں جو تعصب سے دور ہوں اور پہلے ہی سے کوئی فیصلہ نہ کر چکی ہوں ـــــ

امامت و باطنی ہدایت

امامت اور انسانوں کے باطنی ہدایت کی خصوصیات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ از قسم ہدایت ظاہری اور امر تشریعی نہیں ہے۔ خداوند عالم کی طرف سے یہ بلند مقام صرف ممتاز و برگزیدہ گروہ کو عطا کیا جاتا ہے۔ خدا کا امر تکوینی ہمیشہ ان بلند شخصیتوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ جو ہدایت روحانی کے جذبے سے سرشار ہونے اور انسانوں کے مراتب ایمان و معرفت اور اور اعمال و رفتار سے آگاہی رکھنے کی وجہ سے انکے باطن اور افکار پر اثر انداز ہوتی ہیں اور امت کے دلوں کو روشنی عطا کر سکتی ہیں اور تہذیب نفس و سیر باطن میں مددگار ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بات پیروکاروں سے متعلق ہے کہ ان عظیم شخصیتوں کے نقش قدم پر چل کر اپنے کو ہوائے نفسانی و خواہشات شیطانی کے جال میں اسیر نہ ہونے دیں۔

بعض عظیم ترین انبیاء مختلف الٰہی امتحانات و اختبارات میں کامیاب ہونے کے بعد اور اپنی روحانی اور معنوی قدرت کے اثبات اور درجہ یقین پر پہونچنے کے بعد اس عہدۂ امامت اور ہدایت باطنی کے مرتبہ پر فائز ہو چکے ہیں۔

بہت سی قرآنی آیات سے یہ بات مفہوم ثابت ہوجاتی بلکہ امام معصوم بھی

حیات معنوی کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز ہوتا ہے۔ اور باطنی ہدایتوں کے اس حساس موقعیت کا دارا ہوتا ہے اور فیض معنوی کی خداوندی کا واسطہ ہوتا ہے جو باطنی طریقہ سے اور ملکوتی وسائل سے اس قسم کی ہدایت کیا کرتا ہے۔

مرتبہ امامت تک پہونچنے کیلئے مخصوص شرائط کا قائل ہے چنانچہ اعلان ہوتا ہے: وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ۔ [1] اور انھیں (بنی اسرائیل) میں سے ہم نے کچھ لوگوں کو چونکہ انھوں نے (مصیبتوں پر) صبر کیا تھا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے (لوگونکی) ہدایت کرتے تھے اور (اس کے علاوہ) ہماری آیتوں کا دل سے یقین رکھتے تھے۔

اس آیت میں ہدایت سے ہدایت تکوینی مراد ہے ہدایت تشریعی نہیں مراد ہے کیونکہ ظاہری راہ نمائی و ہدایت اور دستور شریعت کی بنیاد پر حق کے لئے لوگونکو متوجہ کرنا یہ تو ہر انسان کا فریضہ ہے۔ اسکے نفاذ میں مرتبہ امامت و درجہ صبر و یقین پر فائز ہونا شرط نہیں ہے اور نہ ہی اس میں مختلف مقدمات و مراحل کے طے کرنیکی شرط ہے۔

البتہ ہدایت بار الٰہی ایک ایسا عہدہ ہے جو خدا کیطرف سے معین کیا جاتا ہے۔ اس بلند مرتبہ تک پہونچنا صرف انھیں لوگونکے لئے ممکن ہے جو تلخ حوادث کے مقابلے میں الٰہی امتحانات پر پورے اتریں، گناہ سے معصوم ہوں تب کہیں جاکر یقین کے اس مرتبہ تک پہونچ سکتے ہیں اور عہدہ امامت

---

[1] پ ۲۱ س (سجدہ) آیت ۲۴

پر فائز ہو سکتے ہیں۔ اور یہی چیزیں باطنی ہدایت کے شرائط میں سے ہیں۔

اسی طرح قرآن کہتا ہے: وَجَعَلْنَاهُمْ اَئِمَّةً يَهْدُونَ بِاَمْرِنَا الخ
اور ان سبکو (لوگوں کا) پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے (ان کی) ہدایت کرتے تھے[1]

ایک اور جگہ قرآن اعلان کرتا ہے: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ
اس دن کو یاد کرو جب ہم تمام لوگوں کو انکے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے[2]

—— جب خداوند عالم نے جناب ابراہیم کا کئی چیزوں میں امتحان لیا اور وہ سب میں کامیاب ہو گئے تو خدا نے کہا: اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ[3] (خدا نے) فرمایا میں تم کو (لوگوں کا) پیشوا بنانے والا ہوں (حضرت ابراہیم نے) عرض کی اور میری اولاد میں سے! فرمایا (ہاں مگر) میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہو سکتا۔

اس آیت سے چند نکات کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ابراہیمؑ کو جو امامت ملی ہے وہ انکے دوران رسالت پیش آنیوالے امتحانات میں کامیابی کے نتیجہ میں ملی ہے اور اس لئے کہ وہ ہر مرحلہ امتحانات سے آپ سربلند ہو کر نکلے کیونکہ جب جناب ابراہیمؑ نے اپنی بلند ہمتی سے تمام مراحل طے کر لئے خدا نے وحی فرمائی ہم تمکو امام بنانا چاہتے ہیں۔

---

[1] پ۱۷ س۲۱ (انبیاء) آیت ۷۳

[2] پ۱۵ س۱۷ (بنی اسرائیل) آیت ۷۱

[3] پ۱ س۲ (بقرۃ) آیت ۱۲۳

اور تزکیۂ نفوس، استعدادوں کو ثمر آور بنانے کیلئے اور حقیقت کو خطِ مستقیم کی نگرانی و ہدایت باطنی کی ذمہ داری تمھارے سر پر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۲۔ جناب ابراہیمؑ یکے بعد دیگرے مشکل سے مشکل تر مراحل اور سخت ترین امتحانات و آزمائش سے گزرنے کے عمر کے آخری حصہ میں اس عہدے کے سزاوار ہوئے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ زندگی کے اس مرحلہ میں آپ درجۂ نبوت پر فائز ہو چکے تھے امت کی فکری و عقیدتی رہنمائی کا عہدہ آپ کے ذمہ تھا ان تمام کمالات کے بعد خداوند عالم نے ایک عظیم عہدے کو دینے کا وعدہ فرمایا یعنی عہدہ امامت! اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ منصب امامت اور امت کے باطن میں اثر و نفوذ کا مرتبہ انکی نبوت سے بلند و برتر تھا۔

۳۔ ہدایت باطنی کے شرائط میں ایک شرط عصمت بھی ہے کیونکہ آیت اعلان کر رہی ہے جن لوگوں نے بھی حریم عصمت و تقوی کے باہر حد ظلم و ستم میں قدم رکھا خواہ انھوں نے بیگناہ لوگوں پر ظلم کیا ہو یا اپنے اوپر ظلم کیا ہو بہر حال وہ امامت و ولایتِ خلق کے مرتبہ سے محروم رہیں گے۔

۴۔ امامت ایک خدائی عہد و پیمان ہے اور یہ پیمان صرف ان لوگوں کے ساتھ باندھا جا سکتا ہے جو آراستہ، عادل، متقی، بے آلائش چہروں کے مالک ہوں، انکے لئے ہدایت کرنا، مدد پہونچانا، ہدایت امت سطح بلند تک کرنا ممکن ہو سکے ساتھ اس منصب کا عطا کرنا لوگوں کے اختیار میں نہیں ہے کہ جس کو چاہیں اس عہدہ پر سرفراز کریں۔

۵۔ ایک ہی فرد نبی اور امام ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ جناب ابراہیمؑ کے

یہاں یہ بات بھی کیونکہ ایک طرف تو آپ وحی الہی کی بنا پر نبیؐ تھے اور اپنی قاطع دلیلوں اور قوی براہنوں کے ذریعہ کجرویوں کو دور کیا کرتے تھے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صراطِ مستقیم تک پہونچاتے تھے اور دوسری طرف اپنے کردار اور مخصوص اعمال کے ذریعہ مخلوق کی معنوی ہدایت کیلئے ضروری توانائی بہم پہونچاتے تھے اس لئے باب امامت انکے لئے کھول دیا گیا اور آنجناب اس عظیم منصب پر فائز کئے گئے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت میں امامت صرف ان حضرات کو دی جائیگی جو ظالم نہ ہونگے اور یہ بات شک سے بالا ہے کہ بندگانِ خدا میں صالح ترین افراد جن میں تمام شرائط موجود ہوں نسل ابراہیمؑ میں جناب رسولِ خدا اور آئمہ معصومین کے علاوہ دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس اعتبار سے بھی وہ ممتاز گروہ ہے جو مرتبۂ امامت پر فائز ہوا ہے۔

●

کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے:

: خداوند عالم نے جناب ابراہیمؑ کو نبی بنانے سے پہلے اپنا بندہ قرار دیا اور پھر رسول بنانے سے پہلے نبی قرار دیا۔ اور خلیل بنانے سے پہلے ان کو رسالت مرحمت فرمائی اور امام بنانے سے پہلے ان کو اپنا خلیل بنایا۔ اور جب یہ سب باتیں ہوچکیں تو اعلان کیا : اب میں تم کو امام بنانے والا ہوں۔ [1]

پیشوایانِ اسلام سے بہت سی روایات منقول ہیں کہ ہدایت خلق کیلئے

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۵

وجود امام کی ضرورت کو خود ضرورت واجب بناتی ہے اور انھیں حضرات نے تحریر کیا ہے کہ جب تک دنیا سے ہستی میں بشر کا وجود ہے اس کیلئے حجت خدا کا وجود بھی ضروری ہے تاکہ امت کے افکار، عقائد، اجتماع، افکار سب ٹھیک رہیں اور امت ولی خدا کے زیر سایہ صحیح اسلام سے وابستہ رہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

آل محمدؐ کی مثال ستاروں جیسی ہے کہ جب ایک ستارہ ڈوبتا ہے تو دوسرا طلوع ہو جاتا ہے۔[1]

امام جعفر صادقؑ اپنے خطبے کے درمیان فرماتے ہیں:

خداوند عالم نے اپنے دین کو اہلبیتؑ کے ذریعہ نورانیت بخشی اور اپنے علوم کے بحر ذخار کو واضح کیا۔ بس جس نے از روئے معرفت و بینش حق امام کو پہچانا وہ ایمان کی حلاوت چکھے گا۔ اور اسلام کے نورانی و خوبصورت چہرے سے آشنا ہو گا۔ کیونکہ خداوند عالم نے امام کو انسانوں کیلئے حجت و رہنما قرار دیا ہے۔ عظمت و سرداری کا تاج اسکے سر پر رکھا ہے۔ نور کبریائی کو اسکے وجود پر چمکایا ہے۔ اور ایک نا تمام ہونیوالی آسمانی طاقت کے وسیلہ سے اسکو مورد تائید قرار دیا ہے۔ اسی کے واسطے سے فیضان رب بندگان خدا پر ہوتا ہے۔ خداوند عالم کسی انسان کی معرفت کو اسوقت تک قبول نہ کرے گا جب تک وہ امام کی معرفت حاصل نہ کرے۔

امام پیچیدہ، زندہ مسائل سے آگاہ، سنن کے مشکلات و مشتبہات سے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۰۰ ص ۱۴۶ صبحی صالح

واقف ہوتا ہے ذریت امام حسینؑ میں سے کسی ایک کو خدا امامت کیلئے منتخب کر لیتا ہے۔ جب کوئی امام اس سرائے فانی سے دنیائے جاویدان کی طرف کوچ کرتا ہے تو خدا اسی کی اولاد میں سے کسی ایک کو مخلوق کی ہدایت کے لئے معین کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کو حق کی روشنی دکھائے۔ خدا نے آئمہ کو رہبری کیلئے منتخب کیا تاکہ ہدایت خلق کا مسئلہ آسان ہو جائے کیونکہ وہ حضرات اساس حق و معیار عدالت پر قضاوت کرنیوالے ہوتے ہیں۔

یہ آئمہ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ کے منتخب بندوں میں ہوتے ہیں، عترت پیغمبرؐ کی ممتاز شخصیت ہوتے ہیں۔ انکے وجود خاکی کی پیدائش سے پہلے ان کا جوہر وجود کائنات میں چمکا۔ خدا نے ان کے وجود کو انسانی زندگی کا سرمایہ حیات اور اسلام کے لئے مضبوط ستون قرار دیا۔ [1]

ایک دوسری روایت میں حضرت صادقؑ فرماتے ہیں:

اگر روئے زمین پر صرف دو آدمی رہ جائیں تو انمیں سے ایک امام ہوگا سب سے آخر میں دنیا سے جو شخص رحلت کرے گا وہ امام ہوگا۔ تاکہ کوئی خدا کے سامنے یہ احتجاج نہ کر سکے کہ تو نے مجھے بغیر امام کے چھوڑ دیا تھا۔ [2]

اعمش نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: امام غائب سے لوگوں کو کیونکر فائدہ ہوگا؟ حضرت نے فرمایا: جیسے ابر کے پیچھے اگر سورج ہو تو اس سے

---

[1] ینابیع المودۃ شیخ سلیمان حنفی ص۲۲ و ص۵۲۳

[2] اصول کافی ج۱ ص۱۸۰

فائدہ ہوتا ہے۔ ؎۱

اسحاق بن غالب نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ حضرت صادقؑ نے فرمایا: امام کا تعارف خدا و رسول کی طرف سے ہوتا ہے تاکہ وہ مخلوق خدا پر حجت ہو۔ امام کے وجود کی برکت سے بندگان خدا اور عالم معنی کے درمیان ارتباط برقرار رہتا ہے۔ اور فیضِ حق جاری رہتا ہے کسی کی بھی بشر کے اعمال ولایتِ امام کے بغیر قبول نہیں کئے جائیں گے۔ خدا بندوں کو پیدا کر کے سرگرداں و حیراں نہیں چھوڑ دے گا جب تک کہ تقوی کا راستہ انکو نہ دکھا دے اور ان پر اپنی حجت تمام نہ کر دے۔ ؎۲

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: خدا کی قسم جب سے خداوند عالم نے حضرت آدمؑ کی روح قبض کی ہے اور انکو دار بقا میں لے گیا ہے اس وقت سے کبھی زمین کو حجتِ خدا سے خالی نہیں رکھا۔ امام خلق کو حق کی راہ نمائی کرنیوالا ہوتا ہے اور بندوں پر خدا کی حجت ہوتا ہے۔ آئندہ بھی دنیا امام کے بغیر نہیں رہے گی یہانتک کہ حجتِ خدا بندوں پر تمام ہو جائے۔ ؎۳

ابو خالد کابلی نے اس آیت: فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا الخ ؎۴ تم خدا اور اسکے رسول پر اور اس نور پر ایمان لاؤ جس

؎۱ ینابیع المودۃ ص ۲۱

؎۲ اثبات الہداۃ ج ۱ ص ۲۳

؎۳ اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۹

؎۴ پ ۲۸ س ۶۴ (تغابن) آیت ۸

کو ہم نے نازل کیا ہے ۔ کی تفسیر امام محمد باقرؑ سے پوچھی! تو حضرت نے فرمایا
: خدا کی قسم اس نور سے مراد امام ہے مومنین کے دلوں میں امام کے نور
کی روشنی سورج کی روشنی سے زیادہ ہے۔ امام کا وجود اہل ایمان کے دلوں کی روشنی
کا سرمایہ ہے۔ خداوند عالم جن لوگوں کے دلوں کے لئے چاہتا ہے نور امام کی
تابش نہیں ہونے دیتا اور نتیجہ میں ان لوگوں کے دل تاریک رہ جاتے
ہیں۔ [1]

علامہ صدوقؒ علل الشرائع میں تحریر فرماتے ہیں: جابر کا بیان ہے میں
نے امام باقرؑ سے پوچھا: رسولؐ و امام کی طرف لوگ کیوں محتاج ہیں۔ امام نے
فرمایا: کائنات کی بقا و صلاح کے لئے امام و رسول کا وجود ضروری ہے کیونکہ
پیغمبر و امام کی ہی برکت کی وجہ سے خدا اپنے بندوں سے عذاب کو دور رکھتا ہے
قرآن کا اعلان ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ [2]
حالانکہ جب تک تم ان کے درمیان موجود ہو خدا ان پر عذاب نہیں کریگا
اور اللہ ایسا بھی نہیں ہے کہ لوگ تو اس سے معافی مانگ رہے ہوں اور وہ
ان پر عذاب نازل فرمائے۔

رسولخدا نے فرمایا: جسطرح ستارے اہل آسمان کیلئے سرمایہ امان ہیں
اسی طرح میرے اہلبیت زمین والوں کے لئے باعث امان ہیں اگر آسمان کے

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۱۹۵

[2] پ ۹ س ۸ (انفال) آیت ۳۳

ستارے نابود ہو جائیں تو اہل آسمان کے لئے ناخوشگوار حادثات پیش آئیں گے اسی طرح اگر میرے اہلبیت نہ ہوں تو زبردست حادثہ زمین والوں کو گھیر لے۔

اہلبیت سے مراد وہ رہبر ہیں جنکی اطاعت خدا نے اپنی اطاعت اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ قرار دیا ہے: اور ارشاد ہوتا ہے: یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ [1]

اے ایمان والو! خدا اور رسولؐ اور تم میں جو صاحبان امر ہیں انکی اطاعت کرو۔

اہلبیتؑ رسولؐ صاحبان عصمت ہیں وہ حکم خدا سے سرمو سرتابی نہیں کر سکتے۔ اور ہمیشہ خدا کی طرف سے انکی تائید ہوتی رہتی ہے انکے اعمال و کردار میں ذرہ برابر کجروی و انحراف نہیں ہوتا انکے قدم صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔ انھیں حضرات کے وجود کی برکت سے بندوں کو روزی ملتی ہے شہر آباد ہوتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے، روح القدس ہمیشہ انکے ساتھ رہتے ہیں انکے اور قرآن کے درمیان کبھی جدائی نہیں ہوگی۔ [2]

محمد بن فضیل نے امام رضاؑ سے پوچھا کیا زمین امام کے بغیر استوار ہو سکتی ہے؟ فرمایا نہیں! پوچھا امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے زمین حجت خدا امام سے خالی نہیں ہوتی کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو اہل زمین پر قہر الٰہی نازل ہو جائے فرمایا: زمین امام کے بغیر نہیں رہ سکتی اگر امام نہ ہو تو زمین یقینی طور پر نابود ہو جائیگی۔ [3]

---

[1] پ۵ س (نساء) آیت ۵۹ — [3] اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۹

[2] بحار ج ۲۳ ص ۱۹

عقیدۂ عصمت

اسلامی تاریخ میں ہمیشہ سے یہ بحث رہی ہے کہ رسولؐ و امامؑ کے لیئے عصمت ضروری ہے یا نہیں۔

شیعہ حضرات کے نزدیک امام و رسولؐ کیلئے عصمت ایک اجتماعی چیز ہے۔ احراز منصبِ امامت کیلئے عصمت اساسی شرط ہے کیونکہ امامت بہت ہی اہم و حساس عہدہ ہے۔

ایک ایسے پیشوا کے لیئے جو مکتب و امت دونوں کا ذمہ دار ہو اس کے لیئے برابر یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ کہیں کوئی لغزش نہ کر جائے کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو اس امت کی قدر و قیمت شرف و اعتبار کو اتنا بڑا دھچکہ لگے گا جو اسکو تباہی و انحطاط کی گود میں پہونچا دیگا اور پھر اسلامی معاشرے کا وقار واپس نہ آسکے گا۔

رہبر و امام کے لیئے ضرورتِ عصمت کی طرف توجہ خاص مذہب تشیع کی خصوصیات سے ہے۔ اور یہ بات شیعوں کے دینی تفکر اور اسلام کے وسیع ادراک پر دلیل ہے۔ اور بڑی بالغ نظری اور وسعتِ اطلاع پر مبنی ہے یہ حضرات امام سے عصمت کی جدائی کا تصور محال جانتے ہیں۔ آئمہ اور رسولؐ کا علم دریائے بیکرانِ علم الٰہی سے ماخوذ ہوتا ہے اور یہ خصوصیت عترتِ پیغمبر کے

علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی ۔حالانکہ اہلسنت حضرات ہر شخص کی خلافت و امامت کو کسی شرط کے بغیر مان لیتے ہیں ۔اور امامت کے لیئے عصمت کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی خلفا کو معصوم مانتے ہیں ۔

●

عصمت ایک ایسی اندرونی طاقت ہے جو انسان کو گناہ سے روکتی ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ خداوند عالم نے اسکو ایک ایسی طاقت دیدی ہے جو اسکو عدم عصیان پر مجبور کرتی ہے ۔اور گناہ کرنے کی تمام قوتوں کو اس نے سلب کر دیا ہے اب اس میں گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے جی نہیں ایسا نہیں ہے ! بلکہ اس کے اندر بھی گناہ کرنے کی تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں اور وہ گناہ کرنے پر قادر بھی ہوتا ہے لیکن اس کے یہاں تقوائے الہی ، تسلط بر نفس اور اتنا عمیق ادراک ہوتا ہے کہ گناہ کرنا تو الگ رہا وہ گناہ کا تصور بھی نہیں کرتا ۔احتمال گناہ اسکے یہاں گویا ہے ہی نہیں !!!

قاعدہ یہ ہے کہ انسان ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اس عمل کی قباحت سے جاہل ہے ۔یعنی اس عمل کے برے ہونے اور نقصان دہ ہونے کی معرفت ہی نہیں رکھتا اسلئے ایسے افعال کا ارتکاب کر ڈالتا ہے ۔اور یا کسی حد تک اس فعل کی قباحت سے واقف ہے اور اسکا ایمان باطنی اس عمل قبیح سے روکتا ہے لیکن ہوا و ہوس نفسانی و خواہشات شیطانی کا غلبہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ اس فعل کو کر بیٹھتا ہے ــــ لیکن اگر کوئی شخص قبیح اعمال کے برے نتائج اور خسارتوں سے واقف ہے اور محبت مولٰی کا جذبہ اسکے اندر بہت زیادہ ہے اور تقوی کی چوٹی پر فائز ہے تو ایسے

شخص کے اندر ایک خود حفاظتی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کی بنا پر کسی اور ایسی علت کی ضرورت نہیں رہتی جو اسکے نفس کو برائیوں سے روکے بلکہ وہ خود بخود برائیوں سے دور رہتا ہے۔

شیخ صدوقؒ نے امالی میں محمد بن ابی عمیر سے روایت کی ہے کہ محمد بن ابی عمیر نے ہشام سے ـــ جو امام جعفر صادقؑ کے ایک لائق ترین شاگرد تھے ـــ پوچھا کیا امام معصوم ہوتا ہے؟ ہشام نے کہا ہاں! محمد بن ابی عمیر نے کہا کہ مجھ سے بیان کرو کہ یہ عصمت کیونکر ہوتی ہے؟

ہشام نے کہا: سنو گناہ کی چند علتیں ہوتی ہیں اور وہ تمام علتیں امام میں نہیں ہوتیں اسلئے امام گناہ نہیں کر سکتا مثلاً گناہ کی علت کبھی حسد، کبھی حرص کبھی شہوت، کبھی غصہ ہوا کرتا ہے۔ اور امام کے اندر انمیں سے کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جب امام کے اختیار میں دنیا کی تمام چیزیں ہیں مسلمانوں کا بیت المال تک ہے تو وہ دنیا کے بارے میں حرص کیوں کرنے لگا؟ حسد آدمی اس شخص سے کرتا ہے جو اس سے بلند ہو اور امامت سے بلند تر کوئی چیز دنیا میں نہیں ہے تو امام حسد کیسے کر سکتا ہے؟ اب رہی غصہ کی بات تو وہ دنیاوی امور پر تو غصہ کرتا نہیں ہاں خدا کے لئے غصہ کرتا ہے۔ تو خداوند عالم نے جب حدودِ الٰہی کا اجراء اس کے سپرد کر رکھا ہے تو گناہوں پر وہ خود حد جاری کر سکتا ہے اس کو غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے جو شخص اپنی بات پوری نہیں کر پاتا اسکو غصہ آتا ہے۔ امام شہوت کا پابند نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا نے جس طرح دنیا کو ہمارے لئے محبوب بنایا ہے آخرت کو امام کے لئے محبوب بنایا ہے لہٰذا وہ ہر بات میں آخرت کو پیش نظر رکھتا ہے جیسے ہم دنیا کو پیش نظر رکھتے

ہیں۔ کیا تم نے کسی کو دیکھا ہے کہ حسین چہرے کو چھوڑ کر قبیح چہرے کی طرف رغبت کرے؟ اچھا کھانا چھوڑ کر بد مزہ کھانے کی طرف رغبت کرے؟ نرم و نازک لباس چھوڑ کر سخت و کھردرا لباس اختیار کرے؟ پھر آخرت کی دائمی اور باقی رہنے والی نعمت کو چھوڑ کر دنیا کی فانی نعمت کی طرف کیسے رغبت کر سکتا ہے؟ [1]

جو لوگ مذہبی فریضہ سمجھ کر امام کے ہر حکم کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اس کے تعلیمات و احکام کو بے چون و چرا قبول کر لیتے ہیں کیونکہ انکے احکام کو حکم الٰہی جانتے ہیں اس میں ذرہ برابر شک نہیں رکھتے تو اگر کوئی معصوم نہ ہو امکانِ خطا و اشتباہ رکھتا ہو تو کیا اسکے بھی ہر حکم کو لوگ حکم خدا سمجھیں گے؟ کیا اسکے احکام کی دل کی گہرائی سے پابندی کریں؟ نہیں ہرگز نہیں!

زیبائش دنیا، خواہشات نفسانیہ، حبّ جاہ و مال و ثروت کے مقابلے میں ہر وقت انسان کے پھسلنے کا امکان رہتا ہے۔ یہ صرف قوتِ عصمت کا کرشمہ ہے جو معصوم کے پائے استقلال میں جنبش پیدا نہیں ہونے دیتی اور نہ وہ ان چیزوں کے مقابلے میں کبھی شکست خوردہ ہوتا ہے۔

اگر انسان اپنے دینی رہبر "امام" پر صد در صد اعتماد و بھروسہ نہیں رکھتا تو رسالت مذہب "جو بشریت کو کمال تک پہونچانے کا ذریعہ ہے" نامکمل رہ جائے گی۔ کیونکہ جب امام گناہ و خطا سے معصوم نہ ہوگا تو مذہب انحرافِ عظیم کا شکار ہو جائیگا اور دین خدا اپنے ہدف واقعی سے دور ہو جائے گا۔

---

[1] امالی صدوق ؒ ص۵۰۵، بیروت

اور لوگ ہر حکم و دستور کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کہیں یہ حکم اسلام حقیقی نظریے کے مخالف نہ ہو؟

•

ایک بات اور بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ امام کی عصمت صرف اسکے امامت تک ہی محدود نہیں ہوا کرتی" یا یوں کہہ لیجئے کہ صرف عہدے کے زمانہ میں معصوم ہونا کافی نہیں ہے" بلکہ پوری زندگی اسکو معصوم ہونا ضروری ہے۔ مقام رہبری تک پہونچنے سے پہلے بھی اسکے دامن پر عصیان کا دھبہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پہلی بات تو یہی ہے کہ گناہ کرنے سے اسکی شخصیت اس عظیم عہدے کے لائق نہیں رہے گی۔ اور دوسرے لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس نے سابق میں معمولی سی بھی معصیت کی ہے تو ہمیشہ وہ شخص انکی نظروں میں متہم رہے گا۔ اس پر عوام کو کبھی بھی اعتماد حاصل نہیں ہوگا۔ اور اسکی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں قہری طور سے یہ شبہہ مستحکم ہو جائے گا کہ اسکی رہبری شرعی نہیں ہے۔ اور پھر لوگ اسکو تقویٰ و پاکیزگی کا معیار بھی قرار نہ دیں گے چہ جائے کہ اسکے اعمال و فضائل معنوی پر شیفتہ ہو جائیں۔

جو شخص ماضی میں غرق سا مئے ناب رہ چکا ہو لوگوں کے دلوں سے یہ بات زندگی تک مٹنے والی نہیں ہے اور اسکے مخالفین کو تو بہت بڑا موقع ہاتھ آجائے گا۔ اگر ماضی کے گنہگار کو مستقبل کے پیشوا کی صورت میں پیش کیا جائے تو لوگ کہیں گے خوب! دو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلیں !

اگر ائمہ معصومین کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مخالفین نے اپنی تمام دریدہ دہنیوں اور گستاخیوں کے باوجود انکی شخصیتوں پر فساد و اعمال

و گناہ کا اتہام نہیں لگایا۔ اگر معمولی سا شوشہ دشمنوں کو مل جاتا تو رائی کو پہاڑ بنائے بغیر نہ چھوڑتے اور اس سلسلہ میں ذرہ برابر رو رعایت نہ کرتے اور لوگوں کے دلوں میں بھی شبہ پیدا ہو جاتا کہ احکام الٰہی سے انکا بھی ارتباط نہیں کیونکہ احتمال کذب تو پیدا ہی ہو جاتا۔ اسی لئے ضروری ہے کہ دینی رہبر کا انتخاب خدا کرے کیونکہ وہ جانتا ہے یہ معصوم ہے۔

جناب موسیٰ ؑ کا قصہ پڑھئے کہ جب انکا فرعون جیسے طاغی و باغی کا سامنا ہوا ہے تو اس نے فوراً جناب موسیٰ ؑ پر اعتراض کیا ہے۔ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ [1]

(فرعون بولا موسیٰ) کیا ہم نے تمھیں یہاں رکھ کر بچپنے میں تمھاری پرورش نہیں کی اور تم اپنی عمر سے برسوں ہم میں رہ سہ چکے ہو اور تم اپنا وہ کام (جو قبطی کو مار کے) جو کر گئے اور تم (بڑے) ناشکرے ہو۔ موسیٰ ؑ نے کہا (ہاں) میں نے اس وقت اس کام کو کیا جب میں حالت غفلت میں تھا۔ پھر جب میں آپ لوگوں سے ڈرا تو بھاگ کھڑا ہوا پھر (کچھ عرصہ کے بعد) میرے پروردگار نے مجھے نبوت عطا کی اور مجھے بھی ایک پیغمبر بنایا۔

اسی لئے سب سے ضروری اور پہلی شرط امامت کیلئے باطنی پاکیزگی عمیق تقویٰ، اور عصمت ہے۔

---

[1] پ ۱۹ س ۲۶ (شعراء) آیت ۱۸ تا ۲۱

یہ صحیح ہے کہ ہر انسان سے خطا و اشتباہ کا ہونا ممکن ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکی اطلاعات و معلومات ان مفاہیم و تصورات کا ایک سلسلہ ہے جو مدارک علمی اور حواس کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں جن میں غلطی کا بہرحال امکان موجود رہتا ہے۔

لیکن امام اپنے دل کی آنکھوں سے جہانِ رنگ و بُو کے باطن اور ملکوتِ عالم کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس ذریعہ سے معارف و حقیقی علوم حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا جب واقعات کا ادراک اسطرح کرتا ہے حواس کے واسطہ سے نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ اسکے یہاں خطا و اشتباہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دراصل خطا صورت ذہنی کو خارجی حقیقت سے تطبیق کرنے میں ہوتی ہے۔ اور جب انسان ڈائریکٹ حقیقتوں کے درمیان ہوتا ہے اور اپنی باطنی قوت سے حقیقت ہستی سے رابطہ پیدا کرتا ہے تو وہاں خطا و اشتباہ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

امام کی عصمت رفتار و گفتار، افکار سب میں ہوتی ہے۔ اور یہی عصمت دلیل ہے کہ امام غیب کا عالم ہوتا ہے کیونکہ ظاہری و عمومی و عادی طریقوں سے کوئی بھی شخص تمام حقائق تک دسترسی نہیں حاصل کرسکتا اور نہ حقائق کا اسطرح ادراک کرسکتا ہے جس طرح وہ نفس الامر میں ہیں۔ یہ آگاہی الٰہی اور غیبی احاطہ کا نتیجہ ہے کہ انسان ہمیشہ خطا و اشتباہ سے محفوظ رہتا ہے اور حقائق و اشیا تک اسکی رسائی ہوجاتی ہے اور علم غیب عطیہ الٰہی ہے

یہ بات اصولی طور سے مسلم ہے کہ عملی تقویٰ انسانی نفوس کی تربیت میں بنیادی اثر رکھتا ہے۔ اور امام و رہبر کے افعال و صفات باطنی تغیر و تحول میں نفوس کے اندر تقویٰ کے اضافہ میں، اقوال سے زیادہ اثر انداز ہوا کرتے

ہیں۔ لہٰذا مخلوق کا رہبر معنوی اگر روحانی فضیلتوں سے عاری ہو تقویٰ و پاکیزگی کا اس کے یہاں نام و نشان نہ ہو تو وہ کسی بھی طرح بلند انسانوں کی تربیت نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی انسانی نفوس پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اور نہ لوگوں کی دینی و مذہبی تربیت کر سکتا ہے۔

●

قرآن مجید میں بعض انبیاء کیطرف گناہ کی نسبت دی گئی ہے اس لئے پہلے ہم گناہ کے معنی بیان کرتے ہیں اس کے بعد اصل مسئلہ کو بیان کریں گے خداوند عالم کے احکام کی نافرمانی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ا۔ گناہ واقعی ۲۔ گناہ نسبی۔

ا۔ گناہ واقعی... احکام الٰہی کی مخالفت یعنی گناہوں میں ڈوب جانا یعنی ایسا گناہ کرنا جس کے لئے مخصوص جزا معین کی گئی ہے۔ یہ گناہ انبیاء سے نہیں ہو سکتے۔ انبیاء اس سے منزہ و مبرا ہوتے ہیں۔

۲۔ گناہ نسبی... یعنی ایسے اعمال کرنا جنکے کرنے پر کوئی سزا معین نہیں ہے لیکن مجازاً اور دوسروں کے اعتبار سے اسکو گناہ کہا جاتا ہے اس گناہ کا بھی تصور انبیاء سے نہیں کیا جاتا کیونکہ جو حضرات سالک راہ خدا ہوں، مبدا وحی سے ڈائریکٹ رابطہ رکھتے ہوں، مخفی ترین حقائق کا لمس خفی رکھتے ہوں ان سے اس قسم کے اعمال کی توقع نہیں کی جاتی۔ کیونکہ وہ موقعیت کے جس درجہ پر فائز ہیں ان کے ساتھ یہ سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ ایک سکنڈ کے لئے بھی وہ ذکر حق سے غافل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انکی غفلت "چاہے بہت مختصر ہو" انکو انکے مرتبہ سے گرا دیگی۔

اولیاء اللہ چونکہ انکے پاس ایمان راسخ، علم کثیر ہوتا ہے اور حقائق واقعیہ

تک انکی رسائی ہوتی ہے۔ معرفت تامہ اور کامل بیداری کے مرکز سے ان کا رابطہ ہوتا ہے۔ اسلئے اگر وہ ـــــ چاہے مختصر مدت کیلئے ہو ـــــ بے توجہی اور غفلت سے دوچار ہوجائیں تو اسکو گناہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہی بے توجہی و غفلت دوسروں کیلئے گناہ نہیں ہے ـــــ مشہور بات ہے "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ"۔ ابرار کے لئے جو چیزیں حسنہ شمار ہوتی ہیں وہی چیزیں مقربین کے لئے گناہ شمار کی جاتی ہیں ـــــ مترجم

یہ بات ہر جگہ عام ہے اگر کسی کی ایک اجتماعی شخصیت ہے تو لوگ اسکے مرتبہ و عہدہ کے مطابق افعال کی اس سے توقع رکھتے ہیں کیونکہ لوگوں کی توقعات اشخاص کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتی ہیں اور ہر شخص کو چاہئے کہ لوگوں کی توقعات کے مطابق اپنے کو پورا کرے مثلاً ایک عالم و ادیب سے جس عمدہ کلام کی توقع ہوگی وہ ایک جاہل و بے ادب سے کبھی نہیں ہوسکتی اسی لئے انبیاء کرام سے گناہ تو نہیں ہوتا ہے لیکن اگر کوئی بات انکے شایانِ شان نہ ہو تو خدا ان سے باز پرس کرتا ہے جیسے آدم کا واقعہ ہے۔

میں مانتا ہوں کہ نتائج گناہ کا علم عموماً آدمی کو معصوم نہیں بناتا اور صرف علم برائی سے نہیں روک سکتا جیسے ڈاکٹر کا علم کسی کو موت سے نہیں بچا سکتا لیکن اگر کوئی واقع کا عالم ہو اور گناہ کے تمام خطرناک آثار و نتائج سے باقاعدہ آگاہ ہو اور خدا کے عذاب الیم کا شدید خوف رکھتا ہو تو وہ گناہ نہیں کرسکتا۔

یعنی واقع و حقیقت کا کشف تام اور اسکی ایسی حقیقی معرفت جس میں زمان و مکان کے فاصلے اثر انداز نہ ہوسکیں ایسی چیز ہے جو معصوم کو گناہ کرنے سے روک دیتی ہے۔ مثلاً جس پائلٹ کو کو معلوم ہو کہ فلاں جہاز میں ٹائم بم رکھا ہے اور یہ بھی

جاتا ہو کہ ہوا میں جہاز کے پہونچتے ہی وہ بم پھٹ جائیگا۔ کسی بھی قیمت پر وہ پائیلٹ اس جہاز کو لیکر پرواز نہیں کرے گا۔ اور یہ بھی بدیہی ہے کہ پائیلٹ اگر جہاز کو اڑا کر لے جاتا ہے تو یہ اسکا غیر اختیاری فعل نہیں ہے بلکہ اس کو اختیار ہے چاہے اڑائے یا نہ اڑائے۔ اب اگر وہ جہاز نہیں اڑاتا ہے تو اسکی عقلمندی کی دلیل ہے۔ اسکی عقل اور اسکا علم دونوں مانع ہونگے۔ اور یہ احتمال دینا کہ شاید اسکے باوجود پائیلٹ جہاز کو اڑائے یہ احتمال کالعدم ہے۔

اسی بات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ اگر کسی کو کسی عمل کے خراب نتائج کا صحیح طور سے علم ہو تو پھر وہ شخص ـــ بشرطیکہ علم و عقل رکھتا ہو ـــ اس عمل کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔

پس امام احکام خدا کی اطاعت اور اتصاف فضائل میں اسی طرح مجبور نہیں ہے بلکہ مختار ہے جس طرح اسکی عصمت اس سے سلب ارادہ و اختیار نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اختیاری طور پر گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتا۔ بلکہ غیر معصوم افراد میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو رضائے الٰہی کی خاطر اپنا سب کچھ راہ خدا میں لٹا دیتے ہیں اور اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے لئے بہت سے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ انکے اندر جو یہ حالت پیدا ہوجاتی ہے وہ آگاہی کافی بینش وسیع اور شناخت کامل کی بنا پر نہ ہو بلکہ وہی احساس اطاعت خدا اور پاکیزگی ذہن و فکر اس کا سبب بنے ہوں اور انکے اندر اتنی تبدیلی پیدا کردی ہو کہ سرکشی و عصیان و طغیان کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا ہو اور انکو خدا کی اطاعت کی طرف مائل کردے ہوں۔

ایک اور بات بھی ہے۔ عنایت باری کا تقاضا یہ ہے کہ جسکو لوگوں تک اپنی رسالت کی تبلیغ کے لئے بھیجے اسکو سہو وخطا سے بھی محفوظ رکھے۔ جس طرح احکام کا وحی کے ذریعہ حاصل کرنا خداوند عالم کی عنایت پر موقوف ہے اسی طرح اس مرحلہ میں عصمت بھی عنایت پروردگار کے تابع ہوتی ہے۔ کیونکہ احکام الٰہی کا بندوں تک پہونچنا بغیر سہو ونسیان اور معمولی سی لغزش کے بغیر ہونا ضروری ہے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا۔ [1] (اے رسولؐ) اگر تم پر خدا کا فضل (وکرم) اور اسکی مہربانی نہ ہوتی تو ان (بدمعاشوں) کا ایک گروہ تمکو ضرور گمراہ کرنیکا قصد کرتا حالانکہ وہ لوگ بس اپنے آپ کو گمراہ کر رہے ہیں اور یہ لوگ تمھیں کچھ بھی ضرر نہیں پہونچا سکتے اور خدا ہی نے تو (مہربانی کی کہ) تم پر اپنی کتاب اور حکمت نازل کی اور جو باتیں تم نہ جانتے تھے تمھیں سکھا دیں اور تم پر تو خدا کا بڑا فضل ہے۔

خدا کی طرف سے وحی شدہ احکام کے ابلاغ و نفاذ میں اسی خصوصیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور پیام رسالت کے دائمی ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ امام و رہبر اپنی رفتار و گفتار و کردار میں معصوم ہو کیونکہ احکام الٰہی کے بیان کرنے میں غلطی مقصد امامت ہی کو ختم کردیگی جسطرح ظالم و فاسق حکام مقاصد رسالت کیلئے خطرہ ہوا کرتے ہیں۔

---

[1] پ۵ س۴ (نساء) آیت ۱۱۳

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اجرائے قانون کی حفاظت و ذمہ داری کسی ایسے قابل اعتماد و معصوم شخص کے قوت مجریہ کا رئیس بھی ہو سپرد نہ کی جائے جو دقت و خلوص و امانت کے ساتھ مرحلہ بہ مرحلہ نفاذ کرے تو دین الٰہی کے احکام تغیر و تبدل سے کسی طرح بھی بچ نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ احتمال بہر حال رہتا ہے کہ نفاذ کرنیوالا اشتباہ کر رہا ہو یا حکم الٰہی کو صحیح طور سے سمجھا ہی نہ ہو بلکہ یہ بھی احتمال رہتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ احکام الٰہی میں جان بوجھ کر تغیر و تبدیلی کر رہا ہے۔ لیکن اگر امام معصوم ہو تو سارے احتمالات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیجئے کہ بہت سی آیات امام کی تفسیر و توضیح کی محتاج ہوتی ہیں اور امام المسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ ان آیات کی تفسیر و توضیح بیان کرے۔

جس شخص کے اندر تمام انسانی کمالات مرتبۂ قوۃ سے مرتبۂ فعلیت میں آ چکے ہوں وہی انسان کامل ہے اور امام چونکہ بشر کی حرکت تکاملی کا منتہا ہے۔ اور دین کا صراط مستقیم ہے اس لئے تمام احکام شریعت پر عمر بھر اس کیلئے عمل کرنا ضروری ہے۔ اور زندگی بھر اس کا دامن آلودۂ عصیان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اگر اسکی عمر کا تھوڑا سا حصہ بھی گناہ میں بسر ہوا اور تھوڑی ہی سی مدت کیلئے سہی اگر وہ صراط مستقیم سے منحرف ہو گیا اور خدا کی نافرمانی کر بیٹھا تو پھر وہ دین کا کامل نمونہ نہیں بن سکتا اور نہ اطاعت پروردگار کے راستے سے بشر کو جو بلندی دلا سکتا تھا وہ دلا سکے گا۔

لہٰذا ان تمام باتوں کے پیش نظر اس عصمت تامہ سے جو احکام الٰہی کی بیان کنندہ ہے۔ چشم پوشی کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ عہدۂ امامت پر سرفراز ہونے

سے پہلے بھی عصمت سے غضّ بصر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر امامت کے شرائط متحقق نہ ہوئے تو پھر معاشرہ آسانی کے ساتھ امام کے احکام پر لبیک نہیں کہے گا۔ اور نہ ہی اسکی ہدایت وارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے گا۔

قرآن و سنت سے عصمت کی تائید

اہلبیت رسولؐ کی عصمت پر ایک دلیل آیت تطہیر بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے اندر رجس نام کی کوئی چیز نہیں ہے ملاحظہ فرمائیے: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ [1] (اے پیغمبر کے) اہلبیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے پاک رکھے اور جو پاک رکھنے کا حق ہے اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے۔

عربی لغت میں "رجس" کے معنی پلیدگی اور آلودگی کے آئے ہیں خواہ آلودگی ظاہری ہو یا باطنی جس کی تعبیر گناہ سے کی جاتی ہے اور قرآن میں رجس دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: اِلَّاۤ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ۔ [2] روئے شد قرآن میں کھانے والے کے لئے کوئی چیز حرام نہیں ہے مگر مردار، یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت تو بیشک یہ چیزیں ناپاک اور حرام ہیں۔

یہاں پر ظاہری آلودگی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسری جگہ بھی رجس

---

[1] پ۲۲ س۳۳ (احزاب) آیت ۳۳

[2] پ۸ س۶ (انعام) آیت ۱۴۵

کا استعمال ہوا ہے لیکن وہاں باطنی ناپاکی کے معنی میں استعمال ہوا ہے : وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ ۔[1] مگر جن لوگوں کے دل میں (نفاق کی) بیماری ہے تو انکی پچھلی نجاست پر اس سورۃ نے ایک خباثت اور بڑھا دی ۔

آیت تطہیر میں رجس سے مراد ظاہری پلیدگی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ تو ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے کہ وہ ظاہری نجاست سے پاک رہے اس میں اہلبیتؑ رسولؐ کی کیا تخصیص ہے؟ حالانکہ آیت اہلبیتؑ کی ایک مخصوص فضیلت کو بیان کرنا چاہتی ہے۔ اسکے علاوہ نجاست ظاہری سے اجتناب کوئی ایسی فضیلت نہیں ہے جسکو قرآن اہلبیت کیلئے مخصوص کرنا چاہتا ہو۔ اسلئے ہم مجبور ہیں کہ رجس سے مراد روح کی پاکیزگی اور باطنی طہارت مراد لیں تاکہ قرآن کا ایک واضح مفہوم ظاہر ہو سکے ۔

اب رہا ارادہ الٰہی سے مراد کون سا ارادہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے ارادۂ تکوینی مراد ہے یعنی نظام تکوین کے اندر خدا کا ارادہ یہ ہے کہ اہلبیتؑ کا دامن ہر گناہ سے بری اور ہر فضیلت سے بھرا ہو۔ کیونکہ اگر ارادہ سے مراد ارادۂ تشریعی لیا جائے تو پھر آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ پروردگار عالم نے اپنے نظام تشریع میں یہ قانون وضع کیا ہے کہ اہلبیتؑ اپنے دامن کو گناہوں سے آلودہ نہ کریں یا مثلاً نجاستوں سے پرہیز کریں۔ ظاہر ہے کہ مفہوم واقعیت سے بہت دور ہے اور قابل قبول بھی نہیں ہے کیونکہ ترکِ گناہ اور نجاستوں سے پرہیز ایک دینی

---

[1] پ ۱۱ س (توبہ ۹) آیت ۱۲۵

فریضہ ہے اور شرعی قانون ہے اس سے کسی کو کوئی امتیاز یا افتخار نہیں حاصل ہوتا جس کے لیے رسولؐ کو ضرورت پڑے کہ وہ ایسا کام کریں کہ جو ابھی تک نہیں کیا ہے یعنی اہلبیتؑ کے سروں پہ چادر ڈالیں اور دوسروں کو اس میں داخل ہونے سے روکیں۔

عہدِ رسولؐ میں جب آیت تطہیر نازل ہوئی تو اصحاب میں ہر جگہ غلغلہ بچ گیا اور آیت تطہیر کے جو حضرات مصداق تھے اور جنکی حقیقت و قداست و اخلاص سب ہی کے نزدیک مسلّم بات تھی انکو اصحاب کسا کہا جانے لگا۔ خود حضرات اہلبیتؑ نے جہاں دیکھا کہ اپنی معنویت کا اظہار ضروری ہے وہاں اس سے استدلال بھی کیا۔

عمر کی عمر تمام ہونے کے بعد انکے حسب الحکم جو شوریٰ تشکیل دیا گیا تھا حاضرین کے سامنے حضرت علیؑ نے احتجاج کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے "علاوہ میرے اور میرے اہلبیتؑ کے" کوئی ایسا ہے جسکے بارے میں آیت تطہیر نازل ہوئی ہو؟ سب ہی نے کہا جی نہیں۔ پھر فرمایا: اہلبیتؑ کا وجود فضیلتوں سے سرشار ہے کیونکہ قرآن کا اعلان ہے: اے اہلبیتؑ پیغمبرؐ خدا تم سے ہر قسم کی پلیدگی کو دور کرنا چاہتا ہے اور تم کو پاک و منزہ بنانا چاہتا ہے۔ بنا بریں خدا نے تمام ظاہری و باطنی برائیوں کو ہم سے دور کر دیا ہے اور حق و حقیقت کے راستہ پر ہم کو گامزن فرمایا ہے۔ [1]

ابن عباس کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا: پروردگار عالم نے آدمیوں کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے اور مجھے انھیں سے بہترین والے زمرہ میں قرار دیا

---

[1] غایۃ المرام ص۲۹۵

ہے جیسا کہ خدا نے خود فرمایا ہے: وَاَصْحَابُ الْيَمِيْنِ مَا اَصْحَابُ الْيَمِيْنِ ۔ [1]
اور داہنے ہاتھ والے (واہ) داہنے ہاتھ والوں کا کیا کہنا ہے ۔ وَاَصْحَابُ الشِّمَالِ
مَا اَصْحَابُ الشِّمَالِ ۔ [2] اور بائیں ہاتھ (میں نامۂ اعمال لینے) والے (افسوس)
بائیں ہاتھ والے کیا (مصیبت میں) ہیں ۔ میں جو اصحاب یمین میں ہوں انہیں بہترین
شمار ہوتا ہوں ۔ اسکے بعد انکو تین قسموں میں تقسیم کیا اور مجھے پاک ترین گروہ میں
قرار دیا جیسا کہ ارشاد ہے: وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً فَاَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَا اَصْحَابُ
الْمَيْمَنَةِ وَاَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ مَا اَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ
اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔ [3] اور تم لوگ تین قسم کے ہو تو داہنے ہاتھ (میں اعمال
لینے والے (واہ) داہنے ہاتھ والے کیا (چین میں) ہیں اور بائیں ہاتھ (میں اعمال
لینے) والے افسوس بائیں ہاتھ والے کیا (مصیبت میں) ہیں اور جو آگے بڑھ جانے
والے ہیں (واہ کیا کہنا) وہ آگے ہی بڑھنے والے تھے یہی لوگ (خدا کے) مقرب
ہیں ۔ اور میں سابقین میں سب سے بہتر ہوں اس کے بعد انکو شعبوں اور قبیلوں
میں تقسیم کیا ہے ۔ اور ہم کو سب سے زیادہ نیکوں میں قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد
ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ
قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ [4] لوگو ہم نے تم سب
کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم ہی نے تمہارے قبیلے
اور برادریاں بنائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرے اس میں شک

---

[1] پ ۲۷ س ۵۶ (واقعہ) آیت ۲۷ ، [2] پ ۲۷ س ۵۶ (واقعہ) آیت ۴۱
[3] پ ۲۷ س ۵۶ (واقعہ) آیت ۷ - ۱۱ ، [4] پ ۲۶ س ۴۹ (حجرات) آیت ۱۳

نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت دار وہی ہے جو بڑا پرہیزگار ہو۔
پس میں نسل آدم میں سب سے زیادہ باتقویٰ اور سب سے گرامی ہوں۔ اس کے بعد لوگوں کو خاندانوں میں تقسیم کیا اور مجھے سب سے زیادہ بافضیلت خاندان میں جگہ دی کیونکہ اسی کا ارشاد ہے: اِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ الخ ۔ [۱]

اس بنا پر میں اور میرے اہلبیتؑ معصوم ہیں۔ اس روایت میں رسولؐ نے آیت تطہیر کی بڑی صراحت سے تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ آیت عصمت بھی ہے

•

آیت تطہیر کی شان نزول یہ ہے کہ ام المومنین جناب ام سلمہ فرماتی ہیں۔ (جنکے گھر میں یہ واقعہ ہوا ہے) ایک دن جناب فاطمہؑ ایک ظرف میں کچھ کھانا لے کر رسولخداؐ کی خدمت میں پہونچیں آنحضرتؐ نے فرمایا علیؑ، حسنؑ، حسینؑ کو بھی بلالو چنانچہ جناب فاطمہؑ نے بلایا جب سب کے سب آگئے اور کھانا کھانے لگے تو آیت تطہیر نازل ہوئی اسی وقت آنحضرت نے اس کپڑے کو جو آپ کی پشت پر تھا سب کے سر پر ڈال کر تین مرتبہ فرمایا: خدایا یہی میرے اہلبیتؑ ہیں ان سے رجس کو دور فرما اور انکو پاک و پاکیزہ قرار دے۔ [۲]

بہت سے اہلسنت کے علماء نے لکھا ہے کہ آیت تطہیر ان پانچ حضرات کیلئے آئی ہے رسولخدا، حضرت علیؑ، جناب فاطمہؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ۔ [۳]

۱ـ آیت کا ترجمہ و حوالہ عنقریب ذکر ہو چکا ہے ۔ ۲ـ ینابیع المودۃ ص۱۲۵

۳ـ ینابیع المودۃ ص۱۳۶، در منثور ج ۵ ص۱۹۹، مسند احمد حنبل ج ۱ ص۳۳۱، تفسیر رازی ج ۱ ص۷۸۳۔
خصائص کبریٰ ج ۲ ص۲۶۴، صواعق ابن حجر ص۸۵

عمر ابن ابی سلمہ جو اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں کہتے ہیں : آیت تطہیر ام سلمہ کے گھر نازل ہوئی۔ اس وقت پیغمبر اسلام نے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسنؑ امام حسینؑ کو اپنے پاس بلا کر اپنے پشت پر پڑے ہوئے کپڑے کو ان سب کے سروں پر ڈال کر فرمایا : یہی لوگ میرے اہلبیتؑ ہیں۔ ان سے رجس کو دور کر۔ اور ان کو پاک و پاکیزہ قرار دے۔ جناب ام سلمہ نے پوچھا اے خدا کے رسولؐ کیا میں بھی ان لوگوں میں ہوں؟ فرمایا : اپنی جگہ پر رہو تم بھی اچھے لوگوں میں ہو۔ (لیکن اہلبیتؑ میں تمہارا شمار نہیں ہے) ؎۱

ام المومنین عائشہ فرماتی ہیں : ایک دن صبح کے وقت رسولؐ خدا ایک کپڑا اپنی پشت پر ڈالے ہوئے گھر سے باہر نکلے اتنے میں حسنؑ، حسینؑ، علیؑ، فاطمہؑ آنحضرت کے پاس آئے، رسولؐ نے اس (پشت پر پڑے ہوئے کپڑے) کو ان سب کے سر پر ڈالا۔ اور آیت تطہیر کی تلاوت فرمائی۔ ؎۲

ابو الحمراء — پیغمبر اسلام کے ایک صحابی — کہتے ہیں : میں مدینہ میں آٹھ مہینہ تک رسولؐ خدا کی مراقبت کرتا رہا۔ میں نے مسلسل دیکھا کہ جب رسولؐ خدا نماز کیلئے گھر سے باہر آتے تھے تو پہلے حضرت علیؑ کے گھر آتے تھے اور دروازے کے دونوں طرف ہاتھ رکھ کر فرماتے تھے : نماز، نماز، اے اہلبیتؑ خدا نے تم سے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ نجاستوں کو دور رکھے اور اسطرح پاک و پاکیزہ قرار دے جو پاک و پاکیزہ قرار دینے کا حق ہے۔ ؎۳

؎۱ جامع الاصول ج ۱۰ ص ۱۰۱، روایت در شان نزول آیت، مسند ریاض النضرہ ج ۲ ص ۲۴۹، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۹ و ص ۱۷۲

؎۲ ینابیع المودۃ ص ۱۲۴ ؎۳ در منثور ج ۵ ص ۱۹۹، اسد الغابہ ج ۵ ص ۱۷۴، مجمع الزوائد ج ۹ ص ۱۶۸

چونکہ کساء کے شاہد چند گنے چنے لوگ ہی تھے۔ اور موضوع بہت زیادہ اہمیت کا حامل تھا، اور خود رسولؐ مقبول اسکو لوگوں میں نشر کرنے کے خواہشمند تھے تاکہ اہلبیتؑ کے مصداق کون لوگ ہیں یہ بات واضح ہو جائے، اور خبر محدود دائرہ میں منحصر ہو کر نہ رہ جائے اسلئے کافی دنوں تک اسکو مسلسل نشر کرتے رہے تاکہ تمام اصحاب اس سے باخبر ہو جائیں۔

چنانچہ ابن عباس کا بیان ہے: نَو مہینے تک نماز کے وقت رسولِ خدا حضرت علیؑ کے مکان پر جاکر فرمایا کرتے تھے: اے اہلبیتؑ تم پر سلام ہو اس کے بعد آیت تطہیر کی تلاوت کرتے تھے۔ [1]

انس ابن مالک کہتے ہیں: چھ ماہ تک مسلسل نماز صبح کے وقت پیغمبر اسلام جناب فاطمہؑ کے گھر جاکر فرمایا کرتے تھے: اے میرے اہلبیتؑ نماز کیلئے اٹھو اسکے بعد آیت تطہیر کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ [2]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: روزانہ نماز صبح کے وقت جب رسولِ خدا ہمارے مکان کے پاس پہنچتے تھے تو فرمایا کرتے تھے تم لوگوں پر خدا کی رحمت ہو نماز کے لئے اٹھو پھر آیت تطہیر کی تلاوت فرماتے تھے۔ [3]

●

---

[1] کفایۃ الطالب گنجی شافعی ص۲۳۳، الامام الصادق والمذاہب الاربعہ ج۱ ص۱۹۰، روایت ابن عباس، درمنثور ذیل آیہ در مسند احمد حنبل ج۱ ص۳۳۱، خصائص نسائی ص۸، ریاض النضرۃ ج۲ ص۲۶۹، مجمع الزوائد ج۹ ص۱۱۹ و ص۲۰۷

[2] ترمذی ج۲ ص۲۹، مستدرک حاکم ج۳ ص۱۵۸، تفسیر ابن کثیر ج۳ ص۴۸۳، فصول المہمہ ص۸، تفسیر طبری ج۲۲ ص۵، درمنثور ج۵ ص۱۹۹، کنز العمال ج۷ ص۱۰۳، مسند احمد حنبل ج۳ ص۲۵۲، [3] غایۃ المرام ص۲۹۵

نیز انھیں حضرت ؑ سے منقول ہے :

ذات اقدس الٰہی کے پاس دو قسم کے علوم ہیں۔ ۱۔ دانش خصوصی ۔ ۲۔ دانش غیر خصوصی :

پہلا علم کسی بھی انسان کے پاس نہیں ہے البتہ دوسرا علم فرشتوں اور انبیاء کو دیا گیا ہے ، اور یہی دوسرا علم ہماری دسترس میں بھی ہے ۔ [1]

امام محمد باقر ؑ نے فرمایا :

حضرت آدم ؑ کے ساتھ جو علم و دانش اترا تھا وہ ختم نہیں ہوا بلکہ وراثتاً ایک کے بعد دوسرے کو ملتا رہا حضرت علی ؑ الٰہی دین و شریعت کے عالم تھے ، اور ہم میں سے کوئی بھی عالم دنیا سے اس وقت تک نہیں جاتا جب تک اپنے اہل میں سے اپنا جانشین نہ معین کر دے جو اسکے علوم کا وارث ہو یا جس چیز کو خدا چاہتا ہے وہ جانتا ہے ۔ [2]

یہ بھی فرمایا : ہم علوم الٰہی کے خزینہ دار ہیں سونے و چاندی کے ڈھیروں کے خزینہ دار نہیں ہیں ۔ [3]

حضرت علی ؑ نے فرمایا :

ہاں خدا زمین کو اپنے اس حجت سے کبھی خالی نہ رکھے گا جو حق کیلئے قیام کرتا ہو ۔ خواہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو یا ظاہر ہو ۔ اور یہ اسلئے ہے تاکہ حجت حق باطل نہ ہونے پائے ۔ اور یہ حجت ہائے خدا کتنے ہیں اور کہاں ہیں ؟

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۲۵۵ [2] اصول کافی ج ۱ ص ۲۲۲

[3] غایۃ المرام ص ۵۱۳

خدا کی قسم وہ عدد کے لحاظ سے کم ہیں۔ لیکن خدا کی بارگاہ میں بڑی منزلت والے ہیں خدا انہیں کے واسطے سے اپنے بینات کو محفوظ رکھتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے جیسے حضرات کے پاس امانت رکھ دیں۔ انکے علمی ذخائر نے انکو بصیرت کی حقیقت تک پہونچا دیا ہے اور وہ روح یقین تک پہونچ گئے۔ مالداروں کیلئے جو چیز مشکل ہے انکے لئے آسان ہے۔ وہ حقائق مسائل سے انس رکھتے ہیں۔ اور ناآگاہ افراد متوحش ہوتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں جنکی روحیں اوجِ رفعت تک پہونچی ہوں اور جائیگاہِ اعلیٰ سے متعلق ہوں وہی لوگ زمین پر خدا کے خلفاء ہیں جو انسانوں کی راہِ حق کی طرف رہبری کرتے ہیں۔ [1]

●

حضرت علیؑ کی پوری زندگی میں کئی ایسے دینی مشکل مسائل درپیش ہوئے جنکے حل پر خلیفہ قادر نہیں تھے۔ چونکہ ان مسائل کا حل علیؑ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اسلئے بتقاضائے ضرورت حضرت علیؑ کی طرف ہر خلیفہ رجوع کرتا تھا لیکن پوری تاریخ اسلام میں کوئی ایسا موقع نہیں دکھایا جاسکتا جہاں پر اسلامی نظریہ سمجھنے کیلئے حضرت علیؑ نے کسی اور کی طرف رجوع کیا ہو کہ اس کے ذریعہ حکمِ الٰہی کو سمجھتے۔ !

سعید ابن مسیب کہتے ہیں: حضرت علیؑ کے علاوہ کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی: "جو چاہو میرے مرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لو"

پس جو بھی حکومت اسلامی کا ذمہ دار ہو اسکا علم اتنا وسیع ہونا چاہیئے

---

[1] مناقب خوارزمی ص ۳۹، معجم نہج البلاغہ میں اسکے ۱۳ مصدر ذکر کیا ہے ص ۱۴۰

حکم نہیں کرتے۔ [1]

اسی طرح حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: آخر راہِ حق و حقیقت کے دریافت کرنے میں کیوں متحیر ہو؟ جبکہ عترتِ رسولؐ تمہارے درمیان میں ہے۔ یہ حضرات حق کے رہبر، دین کے پرچمدار، سچائی کی زبان ہیں۔ عترت کو قرآن ہی کی طرح (عظیم) سمجھو اور پیاسوں کی طرح انکی طرف دوڑو۔ [2]

امام رضاؑ نے فرمایا: امام وہ شخصیت ہے جو گناہ و معاصی سے مبرا ہوتی ہے۔ اور ہر عیب سے پاک ہوتی ہے اور علم و دانائی کے قرین ہوتی ہے۔ [3]

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: انبیاء اور انکے خلفاء گناہ سے مبرا ہوتے ہیں کیونکہ یہ حضرات معصوم ہوتے ہیں۔ [4]

حضرتؑ مزید وضاحت فرماتے ہیں: امام کی شخصیت ممتاز و برگزیدہ ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کی خدا کی طرف رہنمائی کرنیوالا ہوتا ہے، وہ ایسا قیام کرنیوالا ہے جس سے دلوں میں امید ہوتی ہے، ایسا برگزیدہ ہے کہ عالم ذر میں خدا کی خاص توجہات کا مرکز ہوتا ہے۔ اسکے بعد نظام آفرینش میں طلوع کرتا ہے، انسانوں کی خلقت سے پہلے شبح کی صورت میں یمین عرش الہی پر قیام پذیر ہوتا ہے، دانش و حکمت کو غیب سے سیکھتا ہے، اپنی دانائی ہی کیوجہ سے مقام امامت تک پہونچتا ہے، اور پاک طینت ہونے کی وجہ سے منتخب کیا جاتا ہے۔

امام آدمؑ و نوحؑ کا بہترین فرزند ہوتا ہے، آل ابراہیمؑ کا برگزیدہ ہوتا ہے،

---

[1] اثبات الہداۃ ج ۱ ص ۲۳۲ — [2] نہج البلاغہ ۸۳

[3] اصول کافی ج ۱ ص ۲۰۰ — [4] بحار ج ۲۵ ص ۱۹۹

اولاد اسماعیلؑ کا خلاصہ ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ کا مختار ہوتا ہے، خدا اس پر مخصوص توجہ رکھتا ہے، خدا کی طرف سے اسکی حفاظت و نگہبانی ہوتی ہے، شیطان کے جال سے محفوظ رہتا ہے، فساق کی تاریکیاں اور انکے وسوسے اسکی ذات میں اثر انداز نہیں ہو سکتے، ناپسند کردار و افعال سے محفوظ ہوتا ہے، ہر عیب سے پاک و پاکیزہ ہوتا ہے آفات سے محجوب گناہوں سے معصوم ہوتا ہے، بدی سے آلودہ دامن نہیں ہوتا بلوغ و رشد کی ابتدا ہی سے بردباری اور نیکی میں مشہور رہتا ہے، پاکدامنی، فضیلت اور دانش سے پہچانا جاتا ہے۔ ۱؎

●

ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا فرماتے تھے:

اے لوگو میں تمہارے درمیان میں دو بیش بہا قیمتی امانتیں چھوڑ رہا ہوں اگر تم لوگ ان دونوں سے متمسک رہے تو گمراہ نہ ہوگے۔ انمیں ایک دوسرے سے بزرگ ہے اور وہ دونوں امانتیں ایک تو خدا کی کتاب ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ارتباط کا ذریعہ ہے اور دوسری میری عترت ہے آگاہ ہو جاؤ کہ قرآن و عترت قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے۔ ۲؎

یہ روایت وہی مشہور حدیث ثقلین ہے جس کو شیعہ و سنی علماء نے اپنی کتابوں میں متعدد سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس متواتر حدیث سے چند نکتے مورد استفادہ ہو سکتے ہیں۔

۱؎ اصول کافی جلد ۱ ص ۲۰

۲؎ ینابیع المودۃ ص ۳۲، ترمذی میں زید بن ارقم کے حوالے سے منقول ہے ج ۵ ص ۳۲۹ حدیث ۳۸۷۶

۱۔ اہلبیتؑ کے کردار کے مطابق عمل کرنا اور انکے تمام احکام کی پیروی کرنا اور انکو اپنے لئے نمونہ قرار دینا اور انکی مخالفت ضلالت و گمراہی کا سبب بن جانا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ جب یہ حضرات کبھی غلطی نہ کریں اور ہمیشہ دائرۂ عصمت میں محصور رہیں ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر فطری بات ہے کہ امت انکی پیروی کر کے گرداب ضلالت و ہلاکت میں پھنس سکتی ہے۔ حالانکہ رسولخدا نے بطور حتم و جزم یہ اعلان فرمایا ہے کہ اہلبیتؑ کی پیروی سبب گمراہی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ حضرات مجسم اسلام ہیں۔ اسلئے انکی روش ایسی ہونی چاہیئے جو امت کیلئے نمونہ ہو۔

۲۔ رسول اکرم نے قرآن و اہلبیتؑ میں قیامت تک جدائی کو محال قرار دیا ہے تو جس طرح قیامت تک قرآن کی بقا کی ذمہ داری ہے اسی طرح قیامت تک زمین بھی امام سے خالی نہیں ہو سکتی۔

اسکے علاوہ رسولخدا کے نظریہ کے مطابق انکے اہلبیتؑ ہر زمانہ میں مختلف حالات کے اندر زندگی بسر کرتے رہے اور ہمیشہ ایک معتبر علمی مرجع رہے لہذا تمام مسلمانوں پر لازم ہے دین خدا کے احکام حاصل کرنے میں انھیں کی طرف رجوع کریں

امام رضاؑ ارشاد فرماتے ہیں:

جب خدا کسی کو بندوں کے امور کے ادارے کیلئے منتخب کرتا ہے تو اس منزل کیلئے اسکے سینہ کو کشادہ کر دیتا ہے اور اسکے دل کو حکمت کا مرکز قرار دیتا ہے۔ اور اپنے علوم کا برابر اس پر الہام کرتا رہتا ہے۔ اور وہ کسی بھی مشکل سے مشکل سوال کے جواب سے عاجز نہیں ہوتا۔ اور راہ حق کے انتخاب میں کبھی سرگردان نہیں ہوتا۔ وہ معصوم ہونے کی وجہ سے گناہ و خطا سے منزہ و مبرا ہوتا ہے۔ مدد الٰہی ہمیشہ اسکے شامل حال رہتی ہے۔ صراط مستقیم پہ چلنے کی کامیابی

اسی کی وجہ سے ہوتی ہے، وہاں لغزش و خطا کا تصور بھی نہیں ہوتا، خداوند عالم اسکو یہ مقام اسی لئے عطا کرتا ہے تاکہ وہ خدا کے بندوں پر حجت اور اسکی مخلوقات پر گواہ ہو، یہ وہ فضیلت ہے کہ خدا جسکو مناسب سمجھتا ہے عطا کرتا ہے اور خدا تو بڑا فضل والا ہے۔ [1]

علامہ سید شرف الدین اس سلسلہ میں ایک احتمال دیتے ہوئے فرماتے ہیں: باوجود اسکے کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں کسی بھی قسم کی تحریف نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ آسمانی کتاب لوگوں کے تصرف سے مکمل طور پر محفوظ ہے۔ ــــ لیکن یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہے کہ آیتوں کی تدوین و جمع آوری بعینہ اسی طرح ہے جسطرح وہ آیتیں نازل ہوئی تھیں؟ کیونکہ ایک احتمال یہ ہے کہ آیت تطہیر اہلبیت کیلئے الگ نازل ہوئی ہو لیکن آیات کی ترتیب و تدوین و جمع آوری کے وقت اشتباہاً یا جان بوجھ کر ازواج پیغمبرؐ کے ذکر کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ [2]

---

[1] اصول کافی ج ۱

[2] کلمۃ الغراء ص ۲۳۳

جامعیتِ امام

امام اس بابرکت و پرخیر وجود کا نام ہے جو امت کی تمام ضرورتوں سے ہر طرح آگاہ ہو دونوں جہان کی تمام نیک بختیوں اور زندگی کی بلندیوں، بشر کی جملہ معنوی و مادی سعادت و خوشبختیوں یا لوگوں کے ارادے اور انسانوں کی ہدایت کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہو ان تمام سے آگاہ ہو۔ اور ان امور کے تمام کلیات و جزئیات کے تمام ان لوازمات کے ساتھ جو انسان کو او قیانوس حیات سے سربلندی کے ساتھ عبور کر سکیں اور ساحل ابدیت تک پہونچا سکیں ان سے واقف و باخبر ہو۔

تمام حقائق کائنات کا علم، دانائی، و بینائی کے اعلیٰ ترین درجات تک رسائی قرآن سے آشنائی، یہ ساری باتیں امام کی جامعیت ہی کا نتیجہ ہیں۔ امام کی شخصیت درحقیقت شخصیت رسولؐ کا امتداد ہے، علم و معرفت و تمام صفات میں امام رسولؐ کی تصویر ہوتا ہے، اور یہ وہ خصوصیت ہے جو خدا اپنے کامل ترین بندوں ہی کو عطا فرماتا ہے۔

جب پیشوا کی احکام کی حقیقت اور باطن تک رسائی ہو اور جو عین اسلام و صراط مستقیم ہو جس کی مذہبی معرفت اجتہادی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو اسکے بارے میں جہالت و ناآگاہی کا تصور ناممکن و محال ہے۔ جو شخص فیضان الٰہی کا مرکز، بشریت کا رہنما ہو کیا اسکی طرف شریعت الٰہی کے قوانین سے بے خبری نسبت دی جاسکتی ہے

جو معصوم انسان احکام الٰہی کا خزینہ دار و نگہبان ہو وہ معاشرے کو ترقی کی راہ پر لیجانے اور انسان کی پرورش کرنے پر آمادہ کرتا ہو، شریعت کی صراط مستقیم تک لوگوں کی رسائی کا سبب ہو وہ بھلا جاہل ہو سکتا ہے؟

امت کے عقائدی و اجتماعی مصالح کی حفاظت کے لئے طریقۂ کار معین کرنا بھی امام کے فرائض میں سے ہے۔ کیونکہ خدا کے بے انتہا لطف و کرم کا تقاضا یہی ہے کہ بشر سرگردان و پریشان نہ رہے، اسلئے دنیا و آخرت کے پیشوا کو لوگوں کا روحانی و فکری مرجع ہونا بھی ضروری ہے۔ اور اسکے لئے ضروری اسباب سے آگاہی بھی لازم ہے۔ احکام و فرامین الٰہی تک پہونچنے کا راستہ ہمیشہ اسکے سامنے کھلا ہوا چاہیئے تاکہ وہ اپنی تعلیماتی گذر گاہ سے معاشرے کی مقاصد دین و رشد کیطرف رہنمائی کر سکے۔ اسی صورت میں بشر کے مشکلات کے حل کی کنجی اسکے ہاتھ میں ہوگی اور عقد و بھلانے کے راستے مسدود ہونگے۔ اور یہ مفاہیم احادیث آئمہؑ کی روشنی میں واضح ہیں۔

مختلف موضوعات پر گفتگو، علمی بحثیں، مناظرے کے ذریعہ حق کو بیان کرنا کفر آمیز افکار و شبہات اور دینی سوالات کے اطمینان بخش جوابات دینے سے آئمہ کی بینش دینی اور تفکر اسلامی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جی ہاں جس شخص کا دل نور سے زیادہ منور، جس کا علم سب سے برتر، جس کی نظر سب سے وسیع تر، جسکی عقل سب سے بالاتر، جسکی توجہ سب سے عمیق تر ہو اور سب سے اہم تر یہ کہ معصوم ہو وہ ہر ایک سے زیادہ پیروی کیلئے شائستہ تر و بہتر ہوگا۔

کیونکہ جاہل و نا آگاہ اور محدود دینی معلومات رکھنے والا رہبر ــــــ دانستہ یا نادانستہ ــــــ قرآن کی مخالفت سے دوچار ہوتا ہے اسلئے کہ اسکی

کوئی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے کہ وہ اپنے رفتار میں یا گفتار میں قرآن کی مخالفت نہیں کرے گا۔ اسلئے اگر لوگ اسکی پیروی کرینگے تو وہ درحقیقت قرآن کی مخالفت کریں گے۔ اور اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ بہت سے موارد میں اسکی نظر غیر یقینی و ظنی ہے۔ اور اسمیں بھی شک نہیں ہے کہ غیر یقینی نظریہ رکھنے والا چاہے بلند تر احتمالات کی پیروی کرے پھر بھی بدبختی کے بغیر وہ راہ حق قرآن سے جدا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہمیشہ معصوم ہی کی پیروی کرنی چاہیئے۔

امام جعفر صادق (ع) فرماتے ہیں:

خداوند عالم اپنے دین کو پرتو درخشان اہلبیتؑ سے روشن کرتا ہے اپنے دانش و معرفت کے چشموں کو انہیں کے طفیل سے نمایاں کرتا ہے۔ جو شخص امام کے حق واجب کو درک کرے گا وہی ایمان کی لذت کو چکھ سکے گا اور اسلام کی برتری اور اسکے نقص ہو کامل چہرے کی زیارت کر سکے گا کیونکہ خداوند عالم نے امام کو پرچم ہدایت، مخلوق پر حجت قرار دیا ہے۔ اسکے سر پہ تاج عظمت رکھا ہے امام وہ شخصیت ہے جسکا وجود انوار حق سے گھرا ہوتا ہے حقائق آسمانی سے اسکی تائید ہوتی ہے، اسکی دانش کے موارد اختتام پذیر نہیں ہیں، اسباب کو وسیلہ بنائے بغیر نعمت ہائے الٰہی تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

پروردگار بندوں کی معرفت کو امام کی معرفت کے بغیر قبول ہی نہیں کرتا امام وحی و سنت کے پیچیدہ حقائق سے آگاہ ہوتا ہے، مخلوق کی رہبری و ارشاد کے لئے خداوند عالم ہمیشہ امام حسینؑ کی نسل سے کسی کو منتخب کرتا ہے۔ [1]

●

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۲۰۳

اسلامی مدارک کے اندر سے ہے کہ جو چیزیں انبیاء نے ماسبق کو عطا کی گئی تھیں۔ وہ رسولِ اسلام اور آئمہؑ کے بھی دسترس میں تھیں۔ چنانچہ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں :

پروردگار کیلئے دو علم ہیں۔ ۱۔ خاص۔ ۲۔ عام

علم خاص تک نہ تو انبیاء کی رسائی ہے نہ ملائکہ مقربین کی۔ البتہ علم عام انبیاء اور مقرب فرشتوں کے دسترس میں ہے۔ اور رسولِ خدا کے واسطے سے ہم کو بھی پہونچا ہے۔ ۱؎

حضرت امام موسیٰ ابن جعفرؑ نے فرمایا :

خدا کی قسم جو حقائق ہم تک پہونچے ہیں نہ سلیمان کو دیے گئے ہیں اور نہ کسی بھی فرد بشر کو عطا کئے گئے ہیں خداوند عالم نے سلیمان کے قصہ میں فرمایا ہے: یہ ہماری عطا ہے لہٰذا احسان کرو یعنی دوسروں کو بھی سکھاؤ یا خود اسکو حفظ کرو کہ تم سے اس بارے میں کوئی حساب نہ ہوگا۔ ۲؎

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا :

جسکے پاس پوری کتاب کا علم ہے وہ حضرت علیؑ ہیں۔ خود آپ نے فرمایا ہے : آگاہ ہو جاؤ جو دانش آسمان سے آدم کے وسیلہ سے زمین تک آئی ہے۔ وہ اور وہ تمام فضیلتیں جو آدم سے لیکر خاتم المرسلینؐ تک دی گئی ہیں سب کی سب خاتم المرسلینؐ کی عترت میں ہیں۔ ۳؎

۱؎ بحار ج ۲۶ ص ۱۶۰

۲؎ بحار ج ۲۶ ص ۱۵۹

۳؎ بحار ج ۲۶ ص ۱۶۰

نیز انھیں حضرت سے منقول ہے :

ذات اقدس الٰہی کے پاس دو قسم کے علوم ہیں۔ ۱۔ دانش خصوصی۔ ۲۔ دانش غیر خصوصی :

پہلا علم کسی بھی انسان کے پاس نہیں ہے البتہ دوسرا علم فرشتوں اور انبیاء کو دیا گیا ہے۔ اور یہی دوسرا علم ہماری دسترس میں بھی ہے۔ [۱]

امام محمد باقرؑ نے فرمایا :

حضرت آدمؑ کے ساتھ جو علم و دانش اترا تھا وہ ختم نہیں ہوا بلکہ وراثتاً ایک کے بعد دوسرے کو ملتا رہا حضرت علیؑ الٰہی دین و شریعت کے عالم تھے اور ہم میں سے کوئی بھی عالم دنیا سے اس وقت تک نہیں جاتا جب تک اپنے اہل میں سے اپنا جانشین نہ معین کر دے جو اسکے علوم کا وارث ہو یا جس چیز کو خدا چاہتا ہے وہ جانتا ہے۔ [۲]

یہ بھی فرمایا : ہم علوم الٰہی کے خزینہ دار ہیں سونے و چاندی کے ڈھیروں کے خزینہ دار نہیں ہیں۔ [۳]

حضرت علیؑ نے فرمایا :

ہاں خدا زمین کو اپنے اس حجت سے کبھی خالی نہ رکھے گا جو حق کیلئے قیام کرتا ہو۔ خواہ وہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو یا ظاہر ہو۔ اور یہ اسلئے ہے تاکہ حجت حق باطل نہ ہونے پائے۔ اور یہ حجت ہائے خدا کتنے ہیں اور کہاں ہیں؟

---

[۱] اصول کافی ج ۱ ص ۲۵۵ [۲] اصول کافی ج ۱ ص ۲۲۲

[۳] غایۃ المرام ص ۲۵۳

خدا کی قسم وہ عدد کے لحاظ سے کم ہیں۔ لیکن خدا کی بارگاہ میں بڑی منزلت والے ہیں خدا انھیں کے واسطے سے اپنے بینات کو محفوظ رکھتا ہے تا کہ وہ اپنے جیسے حضرات کے پاس امانت رکھ دیں۔ انکے علمی ذخائر نے انکو بصیرت کی حقیقت تک پہونچا دیا ہے اور وہ روح یقین تک پہونچ گئے۔ مالداروں کیلئے جو چیز مشکل ہے انکے لئے آسان ہے۔ وہ حقائق مسائل سے انس رکھتے ہیں۔ اور ناآگاہ افراد متوحش ہوتے ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرتے ہیں جنکی روحیں اوج رفعت تک پہونچی ہوں اور جایگاہ اعلیٰ سے متعلق ہوں وہی لوگ زمین پر خدا کے خلفاء ہیں جو انسانوں کی راہِ حق کی طرف رہبری کرتے ہیں۔ [1]

●

حضرت علیؑ کی پوری زندگی میں کئی ایسے دینی مشکل مسائل درپیش ہوئے جنکے حل پر خلیفہ قادر نہیں تھے۔ چونکہ ان مسائل کا حل علیؑ کے علاوہ کسی کے پاس نہیں تھا۔ اسلئے بتقاضائے ضرورت حضرت علیؑ کی طرف ہر خلیفہ رجوع کرتا تھا لیکن پوری تاریخ اسلام میں کوئی ایسا موقع نہیں دکھایا جاسکتا جہاں پر اسلامی نظریہ سمجھنے کیلئے حضرت علیؑ نے کسی اور کی طرف رجوع کیا ہو کہ اس کے ذریعہ حکمِ الٰہی کو سمجھتے۔ !

سعید ابن مسیب کہتے ہیں: حضرت علیؑ کے علاوہ کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی: "جو چاہو میرے مرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لو"

پس جو بھی حکومت اسلامی کا ذمہ دار ہو اسکا علم اتنا وسیع ہونا چاہیئے

---

[1] مناقب خوارزمی صفحہ ۳۹۰۔ معجم نہج البلاغہ میں اسکے لئے ۱۳ مصدر ذکر کیا گیا ہے صفحہ ۱۳۰۷

کہ مسائل اور اسلامی قوانین کی شناخت اسکی رای اور نظریہ امت اسلامی کے لئے معیار ہو۔ قرآن علی الاعلان اعلان کرتا ہے ؛ [1]

أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمَّنْ لَا يَهِدِّي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۔ [2]

جو شخص دین کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اسکے حکم کی پیروی کی جائے یا وہ شخص جو دوسرے کی ہدایت تو درکنار خود جب تک دوسرا اسکو راہ نہ دکھائے دیکھ نہیں پاتا آخر تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو ؟

اس آیت میں وجدان کے سپرد معاملہ کر دیا گیا ہے اور اسکا فیصلہ خود لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے ظاہر ہے کہ انسان کا وجدان خود ہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ جس نے راہ حق کو پہچان لیا ہو اور حق کی تشخیص کر چکا ہو اور معاشرے کو اسی سمت بلا رہا ہو۔ وہی اس قابل ہے کہ اسکی پیروی کی جائے لیکن جو مسائل میں، راہ حق کی تشخیص میں خود ہی دوسروں کا محتاج ہو اسکی اطاعت قطعاً مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا صرف اسی حاکم کی پیروی کرنی چاہئے جو دوسروں کی ہدایت کا محتاج نہ ہو۔

"بریہ" نامی ایک عالم ہشام بن حکم ہمراہ امام جعفر صادقؑ کی ملاقات کو جا رہا تھا اتفاق سے راستہ میں امام موسیٰ کاظمؑ سے ملاقات ہو گئی۔ امام کاظمؑ نے بریہ سے پوچھا تم اپنی مذہبی کتاب کے بارے میں کتنی معلومات رکھتے ہو؟ بریہ نے کہا: مجھ سے بہتر جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ امامؑ نے پوچھا تاویل و تفسیر میں اپنے اوپر

---

[1] کنز العمال ج ۵ ص ۱۱۳

[2] پ ۱۱ سورۂ یونس آیت ۳۵

کیونکر بھروسہ کرتے ہو؟ بریہ نے کہا: میں اپنی دانش و فہم پر کامل بھروسہ رکھتا ہوں۔ امام ہفتمؑ نے انجیل کی تلاوت شروع کی۔ بریہ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور واقعاً وہ بہت متاثر ہوا پھر بولا: میں پچاس سال سے آپ جیسے شخص کی تلاش میں ہوں۔ پھر وہ مسلمان ہو گیا اور اسکے ساتھ والی عورت بھی مسلمان ہو گئی۔

ہشام و بریہ اور وہ عورت تینوں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں پہونچے ہشام نے پورا واقعہ نقل کیا تو امام جعفر صادقؑ نے امام موسیٰ کاظمؑ کی شان میں اس آیت کی تلاوت فرمائی: ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ انمیں سے بعض بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے[1] (معقول ترجمہ)

بریہ[2] نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا آپ توریت، انجیل اور دیگر کتب انبیاء کا علم کیونکر رکھتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا: یہ چیزیں ہمکو میراث میں ملی ہیں۔ ہم انکی تلاوت ویسے ہی کرتے ہیں جیسے خود اہل کتاب کرتے ہیں اور تلفظ بھی انھیں کی طرح کرتے ہیں۔ خداوند عالم زمین پر ایسے شخص کو حجت نہیں قرار دیتا جو کسی مسئلہ کے جواب میں کہدیں: میں نہیں جانتا۔[3]

نوفلی کا بیان ہے: امام رضاؑ کے تشریف لانے کے بعد مامون نے حکم دیا کہ مختلف مذاہب کے علماء کو دعوت دو جیسے عیسائیوں کے پوپ[4] یہودیوں کے حبر[5] (عالم)، ستارہ پرستوں کے عالم، دہریوں کے عالم، زرتشتیوں کے قاضی[6] رومیوں[7]

۱۔ پ۳ س آل عمران آیت ۳۴
۲۔ بعض روایات میں بریہ کے بجائے بریہہ نام آیا ہے۔ مترجم
۳۔ کافی ج ۱ ص ۲۲۵
۴۔ اسکا نام جاثلیق تھا۔ مترجم
۵۔ اسکا نام راس الجالوت تھا۔ مترجم
۶۔ الہربذ الاکبر۔ مترجم
۷۔ قسطاس۔ مترجم

سے پزشک، متکلمین کے سردار کو ایک جلسہ میں بلا کر اکٹھا کرو۔ اسکے بعد مامون نے امام رضاؑ کے پاس پیغام بھیجا تمام مذاہب کے سر آوردہ علماء جمع ہونیوالے ہیں اگر آپ کا جی چاہے تو تشریف لائیے اور انکی علمی بحثوں میں شرکت فرمائیے۔ حضرت نے اس جلسہ میں شرکت کی منظوری دیدی اور نوفلی کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: مامون نے جو تمام مذاہب کے علماء کو جمع کیا ہے کیا تم بتا سکتے ہو اسکا کیا مقصد ہے؟

نوفلی: جی ہاں اسکا مقصد یہ ہے کہ آپکا امتحان لے اور آپکے علم کا اندازہ لگائے حضرت نے فرمایا: کیا تمکو خطرہ ہے کہ اس مباحثے میں یہ لوگ مجھے شکست دے دینگے؟ نوفلی! خدا کی قسم مجھے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن خدا سے امید کرتا ہوں آپ کو سب پر غلبہ عطا کرے۔ پھر حضرت نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ مامون کب پشیمان ہوگا؟ نوفلی! جی ہاں بالکل چاہتا ہوں حضرت نے فرمایا: جب میں یہودیوں کو توریت سے، عیسائیوں کو انجیل سے زبور والوں کو زبور سے، صابئین کو انکی عبری زبان میں ہربذان کو فارسی زبان میں رومیوں کو رومی زبان میں، اصحاب مقالات کو انھیں کی زبان میں استدلال کرکے ان سب کو مغلوب کرونگا اور وہ سب میری دلیلوں کو مان کر اپنا اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیں گے۔ اس وقت مامون پشیمان ہوگا اور اسکو پتہ چلیگا کہ جس مسند پر وہ بیٹھا ہے وہ اسکی جگہ نہیں ہے۔

دوسرے دن وقت معین پر جلسہ منعقد کیا گیا اور امام رضاؑ بھی تشریف لائے تو یہودیوں کے عالم نے کہا: جملوگ توریت، انجیل، زبور، صحف ابراہیم کے علاوہ آپ کی کسی دلیل کو نہیں تسلیم کریں گے۔ حضرت نے قبول فرمایا اور اسکے بعد انبیاء کی کتابوں سے حضرت رسولؐ کا خاتم النبیین ہونا ثابت فرمایا۔ اور

حضرتؑ نے ایسے دلائل پیش کئے جن میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہ رہ گئی تھی۔ سب سے پہلے یہودی عالم نے حضرتؑ کے استدلال کو تسلیم کرتے ہوئے حق بات کو مان لیا اور مسلمان ہو گیا۔ اسکے بعد دیگر افراد سے "جو حضرتؑ کی تقریر سے کافی متاثر ہو چکے تھے" گفتگو فرمائی اور وہ لوگ بھی خاموش رہے تب حضرتؑ نے کہا اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہو تو بلا تامل پوچھ لے۔

عمران صابی ——— جو علم کلام کا بے مثل عالم تھا ——— بولا: میں بصرہ، کوفہ، شام، جزیرہ ہر ہر جگہ گیا اور وہاں کے متکلمین سے بحث کی مگر کوئی بھی "خدائے واحد" کا اثبات نہیں کر سکا۔ تب امام نے وحدانیت پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ گفتگو فرمائی جس سے عمران قانع ہو گیا اور بولا کہ میں گواہی دیتا ہوں خدا ویسا ہی ہے جیسا آپ نے بیان فرمایا اور محمدؐ اسکے بندے ہیں جنکو بشر کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا۔ پھر رو بقبلہ ہو کر سجدہ میں گر پڑا اور مسلمان ہو گیا ——— تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ علامہ صدوقؒ کی توحید میں تحریر ہے ———

بحث و مباحثہ ختم ہونے کے بعد مامون اٹھا اور امام رضاؑ کے ساتھ گھر سے باہر چلا گیا۔ اور لوگ بھی متفرق ہو گئے۔ [1]

●

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: تقویٰ اختیار کرو اور اپنے امام کی پیروی کرو کیونکہ نیک و صالح معاشرہ امام عادل کے طفیل میں رستگار ہوتا ہے۔ اور فاسد و آلودہ بگناہ معاشرہ امام فاجر کی وجہ سے منحرف ہو جاتا ہے اور نابود ہو جاتا ہے۔ [2]

---

[1] اثبات الہداۃ ج ۶ ص۵۳ ——— ص۵۹ توحید صدوق ص۴۲۶ ——— ص۴۴۹۔ [2] بحار الانوار ج ۸

اس سے معلوم ہوا کہ معاشرہ کی نجات و ہلاکت امام پر موقوف ہے اگر امام نیک و صالح ہے تو معاشرہ کو نجات ملے گی اور اگر امام ہی فاسق و فاجر ہے تو معاشرہ بھی تباہ و برباد ہو جائے گا۔

علوم امام کے سرچشمے

امام کے عمیق ترین و دقیق ترین علوم کا ماخذ و سرچشمہ عالم غیب سے الہام کا ہوتا ہے۔ خود قرآن مجید بھی ائمہ معصومینؑ کے علوم کا منبع ہے۔ ائمہ اپنے وسیع عقول و کامل علوم اور وسعت فکر، اور دینی بے پناہ معلومات کی بنا پر مسائل کے جوابات اور احکام کا اسی قرآن سے استنباط کر لیا کرتے تھے۔ اسی الہی کتاب اور اصل اسلامی منبع سے مختلف علمی حقائق کا استخراج کر لیا کرتے تھے۔

تیسرا ذریعہ وہ انبیاء کی کتب و صحیفے تھے جو رسولؐ خدا سے ائمہ معصومینؑ کو میراث میں ملے تھے۔

ان تینوں مدارک — الہام من الغیب، قرآن، صحف و کتب انبیاء — کے سلسلے میں بہت سی روایتیں بھی وارد ہوئی ہیں ہم انھیں میں سے بعض کا تذکرہ کرتے ہیں —

امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

جناب داؤدؑ کو انبیاء الہی کے علوم میراث میں ملے تھے پھر داؤدؑ کا علم سلیمانؑ کو وراثت میں ملا پھر جناب سلیمانؑ سے حضرت خاتم الانبیاءؐ تک منتقل ہوا اور ہم کو آنحضرتؐ سے میراث میں ملا۔ ابراہیمؑ کے صحیفے، موسیٰؑ کی توریت، ہمارے پاس ہے۔ ابوبصیر نے — جو اس وقت وہاں موجود تھے — بڑے تعجب

سے کہا پھر تو بہت زیادہ علم آپ کے پاس ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا: اے ابو محمد اس علم کی قدر و قیمت اس علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو دن و رات، ساعت بہ ساعت ہم پر الہام ہوتا ہے۔ ؎۱

حضرت امام علی رضاؑ ارشاد فرماتے ہیں:

جب خداوند عالم اپنے بندوں کے امور کی سرپرستی کیلئے کسی شخص کو منتخب کرتا ہے تو اسکے لئے شرحِ صدر کر دیتا ہے۔ اور اسکے دل میں حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے۔ اس پر الہام کرتا ہے اسکے بعد وہ شخص نہ کسی جواب سے عاجز ہوتا ہے۔ اور نہ کبھی راہِ صواب سے بھٹکتا ہے۔ اور وہی شخص معصوم و موید ہوتا ہے۔ موفق و مسدد ہوتا ہے۔ خطا لغزش، ٹھوکر سے محفوظ ہوتا ہے۔ خدا ان تمام خصوصیات سے اسکو مخصوص کرتا ہے تاکہ اسکے بندوں پر حجت، اسکی مخلوق پر شاہد ہو۔ اور یہ تو خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دیدے خدا بہت فضل والا ہے۔ ؎۲

حسن بن عباس معروفی نے ایک خط میں امام رضاؑ سے پوچھا: حضور رسول نبی اور امام میں کیا فرق ہے؟ حضرت نے جواب میں لکھا: رسول وہ شخص ہے جس پر جبرئیل نازل ہوں اور وہ جبرئیل کو (بیداری میں) دیکھتا بھی ہے اور انکی باتوں کو سنتا بھی ہے۔ اور اس پر وحی نازل ہوتی ہو اور کبھی وہ جبرئیل کو عالم خواب میں دیکھتا ہے جیسے ابراہیم نے دیکھا تھا۔ لیکن نبی وہ شخص ہے جو کبھی فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں اور کبھی دیکھتا ہے مگر کلام نہیں سنتا: اور امام وہ شخص ہے

؎۱ اصول کافی ج ۱ ص ۲۲۵   ؎۲ اصول کافی ج ۱ ص ۲۰۳

جو فرشتہ کے کلام کو سنتا ہے مگر فرشتہ کو دیکھتا نہیں ہے۔ [1]

امام موسیٰ کاظم ؑ نے فرمایا:

ہمارے علوم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) گذشتہ، (۲) آئندہ، (۳) حادث،
علوم گذشتہ کی ہمکو تفصیل و تفسیر بتا دی گئی ہے۔ علوم آئندہ ہمارے پاس تحریری طور پر موجود ہیں، علوم حادثہ و جدید کا ہمارے گوش و دل پر القا کر دیا جاتا ہے اور یہی ہمارا سب سے افضل علم ہے، اور ہمارا نبی سب سے آخری نبی ہے اسکے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ [2]

پس روحانی فیضان جو رسولخدا کیلئے تھا وہ آئمہ معصومین کیلئے بھی ہے انبیاء و مرسلین کے مرنے کی وجہ سے خدا اور اسکے بندوں کا رابطہ منقطع نہیں ہوا کرتا۔

●

اب آپ قرآن مجید جو منبع بے پایان ہے اور آئمہ معصومین کیلئے مورد استفادہ ہے اسکے بارے میں خود انھیں حضرات سے سنئے:

امام محمد باقر ؑ فرماتے ہیں:

ہمارے علوم میں سے ایک قرآن کے احکام و تفسیر کا علم ہے جو خدا نے ہمکو دیا ہے اور تغیرات و حوادث زمانہ کا علم ہے جب خدا کسی قوم کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو انکو سامع قرار دیتا ہے اور اگر خدا انکو سامع قرار دے جو گوش شنوا سے محروم ہیں تو وہ اعتراض کر کے چلے جاتے ہیں گویا کچھ سنا ہی نہیں (امام نے تھوڑی دیر سکوت فرما کر) فرمایا: اگر ہمکو ایسے لوگ مل جاتے جو ہمارے

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۱۷۶   [2] اصول کافی ج ۱ ص ۲۶۴

علوم سے ظرف بن سکے تو ہم بھی کچھ کہتے غیر خدا پر بھروسہ ہے۔ ؎۱

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا :

قرآن میں خبر ہائے گذشتہ و آئندہ اور اختلافات کے فیصلوں کا حکم موجود ہے اور ہم لوگ ان سب سے واقف ہیں۔ ؎۲

حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

قرآن کی باتیں کرو میں تم کو بتانا چاہتا ہوں کہ گذشتہ و آئندہ کے تمام علوم قرآن میں ہیں جن احکام و مسائل کی تم کو ضرورت ہے وہ بھی قرآن میں ہیں اسی طرح وہ باتیں بھی ہیں کہ جن کی وجہ سے تم میں آپس میں اختلاف ہوگا۔ اگر مجھ سے پوچھو تو تم کو سب بتا دوں۔ ؎۳

امام موسیٰ کاظمؑ کے ایک صحابی نے آپ سے پوچھا: کیا قرآن و سنت میں تمام چیزیں موجود ہیں یا آپ اپنی طرف سے بیان کر دیتے ہیں؟ امام نے فرمایا: اپنی طرف سے بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہاں قرآن و سنت میں سب کچھ موجود ہے۔ ؎۴

تاویل قرآن کا علم غیبی علوم سے ہے۔ یعنی یہ وہ علم نہیں ہے جس کو عادی طریقوں سے سیکھا جا سکتا ہو۔ بنابریں تاویل قرآن ــــ یعنی خدا کے واقعی مراد کے چہرے سے نقاب کشائی ــــ کا علم علم غیب سے ہے اس لئے فیضان الٰہی کے بغیر اس کا علم نہیں حاصل ہو سکتا۔

؎۱ اصول کافی ج ۱ ص ۲۲۹ ؎۲ اصول کافی ج ۱ ص ۶۱

؎۳ " " ص ۶۱ ؎۴ " " ص ۶۲

قرآن کا ارشاد ہے : هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ اٰیَاتٌ مُّحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِیْلِهٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ۔ [1]

اسی خدا نے تم پر ایسی کتاب نازل کی جسکی کچھ آیتیں تو بالکل صاف صاف ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ آیتیں مبہم ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے وہ فتنہ پھیلانے اور (حصول مطلب کیلئے) اسکی تاویل کرکے انھیں مبہم (گول مول) آیتوں کی پیروی کرتے ہیں حالانکہ انکا اصل مطلب خدا اور معصومین کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

بنابریں راسخون فی العلم سے مراد صرف وہی حضرات ہوسکتے ہیں جو آیات متشابہات کی تاویل خدا ہی کی طرح جانتے ہوں۔ اور بہت سی روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ امام تاویل قرآن کا علم جانتا ہے۔

امام محمد باقرؑ کے ایک صحابی نے امامؑ سے پوچھا : اس روایت کا کیا مطلب ہے کہ قرآن کی ہر چیز کا ظاہر اور باطن ہے اور ہر حرف کی حد ہے۔ اور ہر حد کیلئے آگاہی ہے۔ اس میں ظاہر و باطن سے کیا مراد ہے؟ امام نے جواب دیا: جو قرآن نازل ہوا ہے وہی ظاہر ہے اور تاویل قرآن باطن ہے اسکا کچھ حصہ تو گذر گیا اور کچھ کا ابھی وقت نہیں آیا ہے وہ چاند و سورج کی طرح جریان میں ہے۔ جب کا زمانہ ہوتا ہے وہ جاتی ہے۔ اور ارشاد خدا ہے۔ "وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون

---

[1] پ ۳ س ۳ (آل عمران) آیت ۷

فِی الْعِلْم" اور ہم قرآن کی تاویل سے مکمل طور سے آگاہ ہیں۔ ۱؎

امام جعفر صادق ؑ کا ارشاد ہے :

راسخون فی العلم کی سب سے بلند و بالا شخصیت رسولِ خدا کی ہے۔ پروردگار نے جو بھی آنحضرتؐ پر اتارا اسکی تاویل سے بھی آپؐ کو آگاہ کر دیا۔ اور ہر چیز کی تاویل کا علم رسولؐ و آلِ رسولؐ کو عطا فرمایا۔ اور جو لوگ تاویل قرآن کا علم نہیں رکھتے اگر ان میں کا کوئی عالم کوئی بات کہتا ہے تو خدا خود انکے بارے میں کہتا ہے : یَقُوْلُوْنَ: اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۔۔۔ وہ یہ کہہ دیتے ہیں ہم خدا پر ایمان لائے ہیں ہر چیز ہمارے رب کی طرف سے ہے ۔۔۔ پس جان لو قرآن میں عام بھی ہے خاص بھی ہے محکم بھی ہے متشابہ بھی ہے ناسخ بھی ہے منسوخ بھی ہے اور راسخون فی العلم اس کو جانتے ہیں۔ ۲؎

●

ائمہ معصومین ؑ کا ایک منبع وہ کتابیں اور صحیفے ہیں جو رسولِ خدا سے ان حضرات کو میراث میں پہونچے ہیں۔

امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا ہے :

(خدا نے) ہمارے قبضے میں ایسی کتاب دیدی ہے جس نے ہمکو دوسروں سے بے نیاز کر دیا ہے حالانکہ لوگ ہمارے محتاج ہیں اور یہ کتاب ایسی ہے جسکو رسولؐ نے لکھوایا ہے حضرت علی ؑ نے لکھا ہے۔ اس میں حلال و حرام کے تمام مسائل موجود ہیں۔ تم لوگ جن چیزوں کے بارے میں سوالات کرتے ہو

۱؎ المیزان ج ۳ ص ۶۷   ۲؎ اصول کافی ج ۱ ص ۲۱۳

ہمکو معلوم ہے کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو کیا نتیجہ ملے گا اور عمل نہ کرو گے تو اسکا حشر کیا ہوگا۔ ؂۱

امام جعفر صادقؑ کے ایک مخصوص صحابی نے کہا: میں نے امام سے پوچھا جو علمی میراث آپکے پاس ہے وہ علوم کے کلیات ہیں یا ایسے امور کی تفسیر ہے جس پر لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے مثلاً طلاق و میراث وغیرہ۔ حضرت نے فرمایا: حضرت علیؑ نے تمام چیزوں کو ــــ خواہ وہ طلاق ہو یا میراث ــــ تحریر کردیا ہے اگر ہمارا امر ظاہر ہوا تو کوئی مسئلہ پیش نہیں آئیگا جس میں ہم سنت رسولؐ نہ رکھتے ہوں کہ جس کو اجرا کریں گے۔ ؂۲

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: پیغمبرؐ نے مجھے حکم دیا: اے علی میں جو کچھ بولوں اسکو لکھتے جاؤ۔ میں نے کہا اے خدا کے رسولؐ کیا آپ کو خوف ہے کہ میں بھول جاؤں گا؟ فرمایا نہیں کیونکہ میں نے درگاہ احدیت میں دعا کی تھی کہ تم کو حافظ قرار دیدے۔ مگر یہ چیزیں میں تمہارے شرکا ــــ یعنی وہ آئمہ جو تمہارے بعد تمہاری نسل سے ہونگے ان ــــ کیلئے لکھوا رہا ہوں جنکی برکت سے میری امت پر بارش ہوتی ہے لوگونکی دعائیں قبول ہوتی ہیں، جنکی وجہ سے امت پر عذاب نہیں ہوتا اور رحمتِ حق آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اسکے بعد امام حسنؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: یہ دوسرا ہے اور پھر امام حسینؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ تیسرا ہے اور باقی اسکی نسل سے ہونگے۔ ؂۳

؂۱ اصول کافی ج ۱ ص ۲۳۹

؂۲ جامع احادیث شیعہ ج ۱ ص ۱۳۸

؂۳ ینابیع المودۃ ص ۲۳

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :

تمام کتابیں حضرت علیؑ کے پاس تھیں جب آپ نے عراق کے سفر کا ارادہ فرمایا تو انکو جناب ام سلمہ کے پاس امانتاً رکھوایا جب حضرت علیؑ کی شہادت ہوگئی تو وہ کتابیں امام حسنؑ تک پہونچیں۔ انکے بعد امام حسینؑ کے پاس منتقل ہوئیں اور جب امام حسینؑ کی شہادت ہوگئی تو وہ سب امام زین العابدینؑ کے قبضہ میں آئیں انکے بعد میرے والد ماجد کے قبضہ میں منتقل ہوئیں۔ ؎١

امام محمد باقرؑ نے جابر سے فرمایا :

اے جابر اگر ہم اپنے شخصی نظریے کی بنیاد پر حدیثوں کو بیان کریں تو ہلاک ہو جائیں۔ آگاہ ہو جاؤ ہم جن روایتوں کو بیان کرتے ہیں وہ رسولِ خدا کی روایتیں ہیں جو ہمارے پاس ذخیرہ ہیں اسکو ہم نے اسی طرح محفوظ رکھا ہے جسطرح لوگ چاندی سونے کی حفاظت کرتے ہیں۔ ؎٢

حضرت علیؑ کا اعلان ہے :

قرآن مجید کے اندر کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم ہو کہ یہ کہاں اتری ہے اور کس کے بارے میں اتری۔ میرے سینہ میں علم کثیر ہے مرنے سے پہلے جو چاہو پوچھ لو۔ جب کوئی آیت نازل ہوئی تھی اور میں نہیں ہوتا تھا تو رسولِ خدا میرے انتظار میں رہتے تھے میرے پہونچتے ہی مجھے آگاہ کر دیتے تھے اور فرماتے تھے : علی تمہاری عدم موجودگی میں یہ آیات نازل ہوئیں پھر شرح تنزیل اور انکی تاویل بھی بیان فرماتے تھے۔ ؎٣

؎١ جامع احادیث شیعہ ج ١ ص ١٣١ ؎٢ جامع احادیث شیعہ ج ١ ص ١٣١ ؎٣ ینابیع المودۃ ص ٨٣

یہ بھی حضرت علیؑ نے فرمایا :

بہت سے علوم میرے سینہ میں محفوظ ہیں جنکو رسولخدا نے مجھے بتایا تھا اگر ایسے لوگ مل جاتے جو اسکی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتے اور جو کچھ سنتے وقت و امانت کے ساتھ اسکو باز گو کر سکتے۔ تو کچھ تھوڑا سا علم میں انکے سپرد کر دیتا اور علوم کے دروازے انکے سامنے کھول دیتا کہ ایک ایک دروازے سے ہزار ہزار دروازے کھل جاتے۔ ۱؎

مالک بن انس کا بیان ہے کہ رسولخدا نے حضرت علیؑ سے فرمایا : میرے بعد جو چیزیں اختلاف کا باعث ہیں تم انکو بیان کروگے اور آشکار کروگے۔ ۲؎

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس تعلیم سے رائج و عادی تعلیم مراد نہیں ہے کیونکہ رسولخدا فرصت کے اوقات میں اور محدود وقت کے اندر اپنے کلام معجز نما سے حضرت علیؑ کیلئے ہزار دروازے کھول دیتے تھے اور علیؑ کے سینہ کو معارف دینی و علمی سے بھر دیتے تھے ____ بلکہ یہ تعلیم اور درجہ آگاہی کی بلندی مخصوص کیفیت اور نبوی طاقت و باطنی ہدایت کے ذریعہ تھا۔ اس طرح آپ نے حضرت علیؑ کے سینہ و دل کو عمیق حقائق سے پر کر دیا تھا۔

سلیم بن قیس کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا :

تمام اصحاب رسول کی سطح استعداد ایسی نہیں تھی کہ وہ مسائل کو آنحضرت سے پوچھ سکتے اور جواب سمجھ سکتے۔ بعض لوگ کسی موضوع کے بارے میں سوال

۱؎ غایۃ المرام ص۵۱۸

۲؎ کنز العمال ج ۶ ص۱۵۶۔ مستدرک صحیحین ج ۳ ص۱۲۲

تو کر لیتے تھے لیکن اس کے جواب کے سمجھنے کی باقاعدہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے
اور بعض تو مسئلہ بھی نہیں پوچھ سکتے تھے ان کی دلی خواہش ہوتی تھی کہ کچھ نئے لوگ
آ کر سوالات کریں تا کہ وہ بھی جواب سنیں ۔ لیکن میں شب و روز خدمت رسولؐ
میں رہتا تھا مجھ سے تنہائی میں بات کرتے تھے جہاں جاتے تھے اپنے ہمراہ مجھے
بھی لے جاتے تھے ۔ تمام اصحاب اس بات کو جانتے تھے کہ ایسے مواقع کسی کو نصیب
نہیں ہوتے ۔ کبھی آنحضرتؐ میرے گھر تشریف لاتے تھے اور کبھی میں آپکی امانت گاہوں
میں سے کسی ایک میں پہنچ جاتا تھا ۔ جب میں جاتا تھا تو سب کو ہٹا دیتے تھے
اور حکم دیتے تھے میری بیویاں بھی چلی جائیں ۔ لیکن جب آنحضرتؐ میرے گھر تشریف
لاتے تھے تو فاطمہؑ و میرے بچے گفتگو میں شریک رہتے تھے ۔ جب میں سوالات
کرتا تھا تو میرے سوالوں کے ختم ہو جانے کے بعد جوابات دیتے تھے ۔ اور
کبھی میں خاموش رہتا تھا تو وہ حضرتؐ خود ہی آغاز سخن کرتے تھے ۔ جتنی آیتیں آنحضرتؐ
پر نازل ہوتی تھیں میرے سامنے پڑھتے تھے اور میں لکھتا تھا آیات کی تفسیر ناسخ
منسوخ ، محکم متشابہ خاص عام سب کو مجھے بتاتے تھے اور خدا سے دعا کرتے
تھے کہ مجھے ان کے حفظ کرنے اور سمجھنے کی قدرت عطا فرمائے ۔ اس لئے
جن علوم کی مجھے تعلیم دی تھی ان کو اور آیتوں کو میں اب تک نہیں بھولا ہوں ،
تمام احکام الٰہی حلال ، حرام ، امر ، نہی ، جو خدا کی طرف سے نازل ہوتے تھے ان کی
اور انبیائے سابق کی تمام کتابوں کی مجھے تعلیم دیتے تھے ۔ اور میں ان سب کو
حفظ کر لیتا تھا ایک حرف بھی میں نہیں بھولا ہوں ۔ پھر میرے سینہ پر ہاتھ رکھ
کر دعا فرماتے تھے ۔ خداوندا علیؑ کے دل کو علم و فہم ، حکمت و نور سے پُر
کر دے ۔

میں نے عرض کیا جب سے آپ نے میرے لئے دعا فرمائی ہے میں ایک حرف بھی نہیں بھولا کیا آپ کو خطرہ ہے کہ میں بھول جاؤں گا؟ فرمایا جہل و نسیان کا کوئی خطرہ نہیں ہے اس اعتبار سے میں آسودہ خاطر ہوں اور تم پر بھرپور اعتماد کرتا ہوں۔ [1]

جی ہاں انھیں خصوصیات کی بنا پر فرمایا تھا: میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کے دروازہ ہیں۔ جو شخص تحصیل دانش کرنا چاہتا ہے اس کو دروازے سے آنا چاہیے۔ [2]

اسی لئے آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا: جو شخص میرا علم حاصل کرنا چاہے وہ اس شخص آگاہ (حضرت علیؑ) سے حاصل کرے۔

آنحضرتؐ نے اسی طرح یہ بھی فرمایا ہے:

۱۔ اے علیؑ میں شہر علم ہوں اور تم اس شہر کے دروازہ ہو جو شخص یہ خیال کرے کہ دروازے کے علاوہ کسی اور راستے سے شہر میں داخل ہوگا وہ جھوٹا ہے۔ [3]

۲۔ میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اسکے در ہیں۔ [4]

چونکہ عمل کے لئے علم مقدم ہے اس لئے مسلمان اگر اپنے اعمال تعلیمات رسولؐ کے مطابق بجا لانا چاہیں تو حضرت علیؑ سے دانش و رہنمائی کی درخواست سب چیزوں پر مقدم ہے۔

●

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۶۴ [2] مناقب خوارزمی ص ۴۹، مستدرک صحیحین ج ۳ ص ۱۲۶، تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۴۸، صواعق ص ۷۳، اسد الغابہ ج ۴ ص ۲۲۔ [3] ینابیع المودۃ ص ۷۴

[4] ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴، کنز العمال ج ۶ ص ۴۰۱، حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۶۴

رسولِ خدا مسلمانوں کے آئندہ معاشرے کی علمی ضرورتوں سے باقاعدہ آگاہ تھے۔ اس لئے آپ کی پوری توجہ اس بات پر تھی کہ اپنے علوم کو کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو آپ کے بعد امت کی دینی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور بغیر کسی تغیر و تبدل کے احکامِ الٰہی لوگوں تک پہونچا سکے۔ اس لئے آپ خدا کی طرف سے مامور ہوئے کہ علیؑ کی تربیت کریں۔ یعنی ایسی شخصیت جو بیدار مغز ہو اور لوگوں کو دینِ خدا کے مطابق تربیت دینے کی اصل و بنیاد ہو اور احکامِ الٰہی کی حفاظت بھی کر سکتی ہو۔

اور ایک مثالی قائد کے اندر جو خصوصیات ہوتی ہیں ان کی جامع ہوں اس لئے خدا نے نبی کو مامور کیا کہ وہ علیؑ کی تربیت کریں تاکہ اس عظیم ذمہ داری کو پورا کر سکیں۔

ابن عباس کا بیان ہے رسولِ خدا نے فرمایا :

جب میں اپنے پروردگار کے سامنے راز و نیاز کے لئے کھڑا ہوا تو میرے خدا نے مجھے تعلیم دی اور اس نے جو بھی تعلیم دی میں نے علیؑ کو تعلیم کر دی۔ پس علیؑ ہی میرے علم و دانش کا دروازہ ہیں۔ [1]

امام حسینؑ فرماتے ہیں :

جب یہ آیت — وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ [2] —
ہم نے ہر چیز کا احصا امام مبین میں کر دیا ہے " نازل ہوئی تو اصحاب نے رسولِ خدا سے پوچھا امام مبین سے توریت یا انجیل یا قرآن مراد ہے؟ فرمایا: ان میں سے

---

[1] ینابیع المودۃ ص ۶۹ [2] پ ۲۲ یٰسٓ (۳۶) آیت ۱۲

کوئی مراد نہیں ہے اس کے بعد میرے والد کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا یہ وہ امام ہے کہ خداوند عالم نے ان کے وجود کو دانش و علوم سے سرشار فرمایا ہے ۔[1]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں :

رسولِ خدا ہر سال اپنے وقت کا تھوڑا سا حصہ غارِ حرا میں بسر کرتے تھے میرے علاوہ آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ اس وقت اسلام میں رسولِ خدا کے گھرانے کے علاوہ کوئی مسلمان گھرانہ نہیں تھا اور رسول کے گھرانے میں آنحضرتؐ کے علاوہ جناب خدیجہؑ اور تیسری فرد میں تھا ۔

میں وحی و رسالت کے نور کو دیکھتا تھا ۔ بوئے نبوت کو سونگھتا تھا جب رسولؐ پر وحی نازل ہوئی تو شیطان کے چیخنے کی آواز میں نے سنی میں نے پوچھا اے خدا کے رسولؐ یہ کیسی آواز تھی ؟ فرمایا : شیطان کی آواز تھی جو اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے ۔ اے علیؑ جو میں سنتا ہوں تم بھی سنتے ہو ، جو میں دیکھتا ہوں تم بھی دیکھتے ہو بس اتنا فرق ہے کہ تم نبی نہیں ہو میرے وزیر ہو اور نیک مرد ہو ۔[2]

رسولؐ خدا نے فرمایا : خدا علیؑ کو اپنے الطاف کا مرکز قرار دے ۔ خدایا حق کو ادھر پھرا جدھر علیؑ پھریں ۔[3]

---

[1] ینابیع المودۃ ص۲

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲

[3] ترمذی ج ۵ ص۲۹۷

غیب و شہود

عالم غیب " عالم شہود " کے مقابل میں ہے۔ جو چیز احساس انسان سے خارج ہو اور ظاہری طور سے ادراک کے قابل نہ ہو اس کو " عالم غیب " میں شمار کیا جاتا ہے مثلاً ہم کو قیامت کے احوال و اوضاع کا علم نہیں ہے اس دن کس طرح کا ثواب و عقاب ہوگا اس کی حقیقت کا ہم کو علم نہیں ہے۔ فرشتوں کا وجود کیونکر ہے حضرت باری تعالیٰ کی ذات و صفات سے ہم کو آگاہی نہیں ہے۔ ہمارے نہ جاننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ سب بہت لطیف و چھوٹے اجسام ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محدود ادراک سے یہ چیزیں کہیں بلند و بالا ہیں اور دائرۂ زمان و مکان سے خارج ہیں اس لئے ہم ادراک نہیں کر سکتے " تو یہ سب چیزیں " عالم غیب میں شمار ہوں گی۔

غیب کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں: غیب مطلق۔ غیب نسبی

۱۔ غیب مطلق: اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ہر شخص کے لئے اور ہر زمانے میں غیب ہوں انسان کبھی اس کو اپنے حواس ظاہری سے ادراک ہی نہیں کر سکتا ہو جیسے ذات خدا۔

۲۔ غیب نسبی: اس سے وہ چیزیں مراد ہیں جو بعض کے لئے تو غیب ہیں لیکن بعض کے لئے شہود ہیں لیکن جو چیزیں انسان کے حواس پنجگانہ سے

ادراک کی جا سکیں انکو عالم شہود ہی سے شمار کرنا چاہیے۔ یعنی شہود کا انسان کے حواس ظاہری کے احاطہ کے اندر محدود ہونا شہود کہلاتا ہے اس کے آثار اور اس کا مادہ اس دنیائے شہود سے ہے کیونکہ حواس کے ذریعہ ان کا ادراک ممکن ہے بلکہ اگر کوئی چیز بہت چھوٹی یا ناچیز ہونے کی وجہ سے بغیر ذرہ بین کے نہ دیکھی جا سکے جیسے ایٹم، میکروبات اجراثیم، (وائرس) وغیرہ تب بھی اس کا شمار عالم شہود سے ہوگا کیونکہ ان چیزوں کا حجم اتنا مختصر ہے کہ ہمارے حواس ان کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ذرہ بین وغیرہ سے بھی یہ چیزیں نہ دکھائی دیں۔ بلکہ آلات کی مدد سے دیکھنا ممکن ہے اس لئے ان کا شمار عالم شہود ہی سے ہوگا۔

اسی طرح محققین کے وہ نئے نئے انکشافات جو اس جہان پُر اسرار میں موجود ہیں جیسے قوت جاذبہ، ایکسریز، لیزر ان کا بھی شمار "علم غیب" میں نہیں ہوتا اگرچہ یہ حسب ظاہر ناقابل شناخت ہیں لیکن چونکہ ان حقائق کا علم طبعی اسباب و وسائل کی بنا پر ہو چکا ہے اور انکشاف کے بعد یہ راز لوگوں کے ہاتھوں میں آچکا ہے اس لئے اس کو علم غیب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہمارے محدود و مشخص حواس کے ناقص ادراک کا نتیجہ ہے جو اس حد تک چیزوں کی حقیقت کو طبعی طور سے ہمارے لئے روشن نہیں کر سکتا۔

●

بعض حیوانات کی قدرت احساس ہم سے بدرجہا زیادہ ہے چنانچہ بہت سی وہ چیزیں جو ہمارے لئے پوشیدہ ہیں وہ دیکھ سکتے ہیں یا کسی دوسرے احساس سے اسکا ادراک کر سکتے ہیں حالانکہ ہم صرف ان کے آثار و نتائج ہی سے ان کے

وجود پر استدلال کر سکتے ہیں دیکھ نہیں سکتے۔

بنابریں جہانِ غیب کی چیزوں کا تصور ہم صرف عقلی دلائل یا ان حضرات کے خبر دینے سے ہی کر سکتے ہیں جن کو عالم الغیب اور امورِ خفیہ پر پورا پورا تسلط ہے کیونکہ ہم عالم غیب کا احاطہ نہیں کر سکتے البتہ وہ مادی ظواہر جو ہمارے حواس سے متجانس ہیں یا علمی وسائل کے ذریعہ مخصوص شرائط کے ساتھ اور محدود افق میں ہمارے لئے ان کے بارے میں اطلاع حاصل کرنا ممکن ہے ان کا شمار عالم غیب میں نہیں ہے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ان حقائق کے بارے میں ہمیں تو کوئی علم نہیں ہے لیکن ہم ان کے بارے میں ان اشخاص کے واسطے سے علم حاصل کر سکتے ہیں جو ہماری ان امور تک ہدایت کر سکتے ہیں۔ اور انھیں غیبی خبر دینے والوں کی خبروں کی بنیاد پر ہم اپنا ایمان و اعتقاد بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور اسی لئے ہم کہتے ہیں عالم غیب کا جتنا تصور ہمارے لئے ممکن ہے وہ صرف اسی قدر ہے جس کا تصور ہم کسی بھی علمی مفہوم کا خبروں کی بنا پر کر سکتے ہیں۔

ہم چونکہ اپنے محدود و ناقص وجود کے ساتھ عالم مادہ میں مقید ہیں اس لئے بہت سی غیر مادی اور غیر محسوس چیزیں ہمارے دائرۂ ادراک سے خارج رہتی ہیں اور بہت سے اسرار و رموز تک رسائی سے ہم محروم ہی رہتے ہیں غیب کی باتوں کو تو جانے دیجئے ہمارے پاس اس عالم محسوس کے ظواہر کے ادراک کے لئے کافی قدرت نہیں ہے حالانکہ یہ عالم محسوس بلا کسی قید و شرط کے ہمارے وجود مادی سے مجانس بھی ہے۔

اس لئے عالم وجود کی ہمارے لئے دو قسمیں ہیں ۱۔ ظاہر ۲۔ باطن (اسی کو غیب و شہود بھی کہتے ہیں) اور یہی غیر محسوس و مخفی امور جن کا ادراک ہمارے بس سے

باہر ہے۔ مالک کون و وجود سب کائنات کے نزدیک ظاہر ہے۔

زمانہ گذشتہ کا ہر واقعہ جو ہماری یادوں کے کند سے پرے ہے، جس کا صفحۂ تاریخ میں بھی کوئی ذکر نہیں ہے جو ہم سے پوشیدہ و پنہاں ہے۔ وہ پیشگاہ پروردگار عالم میں حاضر و موجود ہے۔

اسی طرح بہشت و دوزخ و قیامت جو آئندہ نامعلوم میں ہونے والے ہیں جن کی اس وقت کوئی تصویر بھی نہیں پیش کی جا سکتی خدائے قدیر کے سامنے حاضر ہیں جس خدا کی ذات کی کوئی حد متصور نہیں ہے اور نظام کائنات کا کوئی نقطہ اس کے وجود مقدس سے خالی نہیں ہے وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور تمام امور پر اطلاع تام رکھتا ہے۔

جن حوادث پر ملیارد ہا سال گزر چکے یا ملیارد ہا سال اور گزر جائیں اسکے حاضر علم سے باہر نہیں ہیں۔ گذشتہ و آئندہ حوادث کی تقسیم ہمارے افق فکر اور ہمارے وجود محدود میں ہے۔ جو زمان و مکان کا پابند ہے چونکہ ہم ایک مادی ہیں اور فزیک و نسبیت کے قانون کی بنا پر مادہ اپنے تکامل تدریجی اور تغیرات ہمیشگی میں زمان و مکان کا محتاج ہے لہذا ہم بھی زمان و مکان سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

علم خدا بجمیع معنی الکلمہ حضوری ہے جیسے خود ہم کو اپنا علم! یہ بھی حضوری ہے۔
ذات اقدس الہی کے سامنے گذشتہ و آئندہ کی تمام چیزیں بغیر کسی واسطے کے حاضر ہیں۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (خداوندا) تیرے سامنے ہر راز آشکار اور ہر پنہاں حاضر ہے۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۵)

یقیناً خدا اوقیانوسوں اور زمین و آسمان کے اندر موجود ایٹموں، عالم ہست و بود میں اربوں چھوٹے بڑے موجودات کی حرکتوں اور منزلوں، اور ہر چیز کے

ظاہر باطن سے آگاہ ہے اسکا علم اشیائے گذشتہ واشیاء موجودہ اور حوادث فعلی کے احاطہ کامل پر منحصر نہیں ہے بلکہ وہ آئندہ کی چیزوں کا اسی طرح عالم ہے جس طرح موجودہ چیزوں کا۔

اگر ہم بھی ہر جگہ ہوتے اور کسی مخصوص نقطہ میں محدود نہ ہوتے تو تمام حقائق وجزئیات امور پر ہم بھی واقف ہوتے۔

علم خدا اور بندوں کے علم میں کوئی مشابہت نہیں ہے اور نہ ایک کا دوسرے پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ خدا کی دانائی کو اس کی مخلوق میں تحقیق کرکے جانا جاسکتا ہے انسانی علم خارجی معلوم کا محتاج ہوتا ہے۔ یعنی پہلے خارج میں کوئی معلوم ہو تب انسان کو اس کا علم ہوسکتا ہے لیکن خدا کے یہاں یہ بات نہیں ہے۔ اصولی طور پر خدا کے لئے کوئی شی غیب ہے ہی نہیں جو بھی ہے سب اسکے لئے حضور ہے۔

حواس ظاہری کے واسطے سے ہم چاہے جو بھی علم حاصل کریں اس کا شمار "غیب" میں نہیں ہوگا۔ البتہ جن علوم کے سیکھنے میں حواس پنجگانۂ ظاہری کی احتیاج نہ ہو بلکہ دوسرے کسی طریقہ سے ہاتھ آئے وہ غیب میں شمار ہوگا۔

تمام موجودات وجہان مادی کے واقعات ایک ایسی دنیا سے نازل ہوتے ہیں جو اس سے کامل تر ہے۔ اور اس کا تحقق اسی دنیائے نامحسوس میں ہے اگر انسان ظواہر اشیاء کو اپنے حواس کے ذریعہ ادراک کرے اور اسی طرح عالم حقیقت پر مطلع ہو جائے تو اس کو غیب نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر پوشیدہ اشیاء کی حقیقت کو چشم باطن سے دیکھے اور ان کے کمال وجودی کے مراحل کو ملاحظہ کرے اور اسی طرح ــــ حواس کی مداخلت کے بغیر ــــ ظواہر اشیاء کی حقیقت تک رسائی حاصل کرے تو اس قسم کے علم کو علم غیب میں شمار کیا جائے گا۔

قرآن مجید کا اعلان ہے : (۱) عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۝ پ ۲۸ س (حشر) آیت ۲۲ ۔ "وہ پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے (اور) رحمٰن و رحیم ہے"۔

(۲) عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝ پ ۱۳ س (رعد) آیت ۹ "(وہ) پوشیدہ و ظاہر کا جاننے والا ہے سب سے بزرگ اور اور سب سے اعلیٰ ہے"

(۳) عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِي مَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝ پ ۲۴ س (زمر) آیت ۴۶ " اے چھپی اور کھلی (چیزوں) کے جاننے والے تو ہی اپنے بندوں کے اختلافی معاملات میں فیصلہ کرنے والا ہے"

(۴) إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ پ ۱ س (بقرہ) آیت ۳۳ "میں زمین اور آسمانوں کے غیب سے واقف ہوں اور جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو چھپاتے ہو اس پر بھی مطلع ہوں۔

(۵) ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ پ ۲۸ س (جمعہ) آیت ۸ ۔ "پھر تم کو ظاہر و باطن کے عالم کے حضور میں پیش کیا جائے گا اور تمہارے اعمال سے تم کو آگاہ کیا جائے گا"

(۶) عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ۝ پ ۷ س (انعام) آیت ۷۳ "(وہ) ظاہر و باطن کا عالم ہے اور حکیم و خبیر ہے"

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے :

خدا ہر چیز کا عالم ہے لیکن ان اسباب و وسائل کے بغیر کہ اگر وہ فنا ہو جائیں تو علم بھی فنا ہو جائے۔ خدا اور اس کے معلومات کے درمیان علم نامی کوئی چیز امر زائد موجود نہیں ہے۔ صرف اسکی ذات مقدس ہے اور بس۔ (توحید صدوق)

یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم غیب کیا صرف ذات پروردگار کے لئے مخصوص ہے؟ یا انسان بھی غیب کا عالم ہو سکتا ہے؟

کچھ حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ علم غیب صرف خدا کے لئے مخصوص ہے انکے نظریے کے مطابق انبیاء و بزرگان دین بھی علم غیب تک رسائی نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے اپنے نظریے پر چند ان آیتوں سے استدلال کیا ہے جن میں مبداء کمال نے مطلق علم غیب کو اپنی ذات کے مختصات میں شمار کیا ہے۔ اور جن میں انبیاء نے بطور قطع اپنے سے علم غیب کی نفی فرمائی ہے۔

اب آپ ان آیتوں کو پڑھیے۔ اور نتیجہ نکال لیجئے:

۱. وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۰ پ ۷ س (انعام) آیت ۵۹
"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں اور ان کو خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔"

۲. وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ
پ ۹ س (اعراف) آیت ۱۸۸۔ "اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی خیر و خوبی اکٹھا کر لیتا اور خرابی تو مجھے چھو بھی نہ پاتی"

۳. وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ
إِنِّي مَلَكٌ ۰ پ ۱۲ س (ھود) آیت ۳۱۔ "اور میں تو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ ہی میں اپنے کو فرشتہ کہتا ہوں"

۴. قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ وَمَا
يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ۰ پ ۲۰ س (النمل) آیت ۶۵۔ "(اے رسول) تم کہہ دو آسمان اور زمین میں خدا کے علاوہ کوئی بھی غیب نہیں جانتا اور نہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ

کس وقت اٹھائے جائیں گے

۵. قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۝

پ ۲۶ (الاحقاف) آیت ۹۔ اے رسول! کہدو میں کوئی انوکھا رسول تو ہوں نہیں مجھے نہیں معلوم کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

۶. وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۝ پ ۱۱ س (توبہ) آیت

اور بعض اہل مدینہ میں سے (بھی) نفاق پر اڑے ہوئے ہیں (اے رسول) تم ان کو نہیں جانتے۔

ان آیات کی روشنی میں خدا کے سوا کوئی انسان کیا کوئی نبی بھی غیب کا عالم نہیں ہو سکتا! انتہی

اتنی بات تو بالکل صحیح ہے کہ خدائے واحد کے علاوہ غیب مطلق پر کوئی بھی آگاہ نہیں ہے اور علوم غیب کا انحصار صرف ذات باری میں ہے ــــ رہے انبیاء تو ان کی برتری تمام مخلوق پر دوسرے اعتبار سے یقیناً مسلم ہے لیکن چونکہ انکی ذات بھی محدود ہوتی ہے اس لئے ذاتاً وہ بھی جہان غیب پر محیط نہیں ہو سکتے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی طے ہے کہ غیب کے دروازے انپر ہمیشہ کے لئے بند بھی نہیں ہیں کہ اگر خدا چاہے کہ ان کو غیب عطا کرے تب بھی وہ عالم غیب نہیں ہو سکتے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو خدا کا عطیہ ہے اپنے لائق بندوں اور رسولوں کو دے سکتا ہے۔ پس ان کا علم غیب ذاتی و استقلالی نہیں ہو سکتا یہ علم الٰہی کا پرتو ہوتا ہے۔

یہ آیتیں بتا رہی ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ رسول تمام وما فیہا پر مسلط ہوتا ہے اور اس کے پاس ایسی قدرت ہوتی ہے جس کی بنا پر

ہر خیر و منفعت کو اپنے لئے مہیا کر سکتا ہے اور بڑی آسانی سے ہر بلا و نقصان کو اپنے سے دور کر سکتا ہے ۔ اس لئے خدا نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ علی الاعلان لوگوں کو بتا دیجئے کہ میرے پاس ذاتی طور سے ایسی کوئی طاقت نہیں ہے بلکہ میرے پاس جو بھی طاقت و قوت ہے وہ خدا کی دی ہوئی ہے میرا علم بھی وحی و تعلیم الٰہی کے واسطے سے حاصل ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین کے خزانے میرے قبضے میں ہوتے ۔ میں دنیا کا مالدار ترین شخص ہوتا مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہونچتا اپنی پیش بینی سے ہر بلا و مصیبت کو اپنے سے دور کر دیتا ۔

یہاں پر رسول وحی و تعلیم الٰہی سے قطع نظر کرتے ہوئے اپنی ذاتی اطلاع و شخصی علم کی بنا پر امور مذکورہ کی نفی کر رہے ہیں۔ لیکن یہی رسول وحی الٰہی کے ساتھ دشمنوں کے ناپاک ارادوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور اسی غیبی آگاہی کی بنا پر دشمنوں کے مخفی خطروں سے محفوظ ہو جاتے ہیں پس یہ آیتیں غیر خدا سے بطور مطلق علم غیب کی نفی پر دلالتیں نہیں کر رہیں ۔ اور اسی کے ساتھ جن آیتوں میں صریحی طور سے پیغمبروں کے لئے علم غیب کا اثبات کیا گیا ہے ان سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ اور جو یہ فرمایا ہے کہ : میں کوئی انوکھا پیغمبر تو ہوں نہیں ... الخ ۔ اس میں اس نکتہ کو بیان کرنا مقصود ہے کہ پیغمبر ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ علم الٰہی کے سہارے بغیر ان کے وجود سے علوم و دانش کے سوتے پھوٹتے ہیں جیسے دوسرے انبیاء کا علم بھی خود ان کا ذاتی نہیں ہوا کرتا ۔ وہ لوگ بھی وحی و تعلیم الٰہی کے بغیر اپنے اور دوسروں کے انجام سے ناواقف ہوتے تھے ویسے ہی میں بھی ہوں۔ میں کوئی انوکھا تو نہیں ہوں

منافقین سے متعلق جو آیت ہے اس میں ظاہر ہے کہ نفاق کی تمرین و مشق صرف عادی راستہ کو بند کر سکتی ہے لیکن غیر عادی اخبار سے مانع تو نہیں ہو سکتی ۔

آیت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ عادی طریقوں سے تم ان کو نہیں جان سکتے نہ کہ غیر عادی ذرائع سے بھی نہیں جان سکتے ہو غیر عادی سے مراد غیب ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ پیغمبر صرف منافقین کو پہچانتے ہی نہ تھے بلکہ موقع بہ موقع ان کے چہروں سے نقاب کشائی بھی کر دیتے تھے اور اپنے مخصوص اصحاب کو بتا بھی دیتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں میں ہے حذیفہ یمانی کو رسولؐ نے منافقین کے نام بھی بتا دیے تھے۔ اور ایک خلیفہ دوم نے حذیفہ سے پوچھا بھی تھا کہ میرا نام تو منافقین میں نہیں ہے؟ مگر حذیفہ نے بتایا نہیں!

حضرت عمر نے نماز میت میں ہمیشہ حذیفہ کی روش پر عمل کیا۔ اگر حذیفہ کسی کی نماز میت میں شریک ہوتے تھے تو حضرت عمر بھی شریک ہو جاتے تھے۔ ورنہ اگر حذیفہ نہیں شرکت کرتے تھے تو حضرت عمر بھی نماز میت میں شریک نہیں ہوتے تھے"[1]

اصولی طور سے شناخت کے بغیر تکلیف ناممکن ہے۔ خدا اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کافروں اور منافقوں سے جنگ کیجیے اور ان کے خواہشات کی پیروی نہ کیجیے مثلاً: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔[2] "اے نبی کفار و منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو" دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ۔[3] "کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانو اور ایذا دینا چھوڑ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو"۔

---

[1] اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۹۱

[2] پ ۱۰ س ۹ (التوبہ ۹) آیت ۷۳

[3] پ ۲۲ س ۳۳ (الاحزاب) آیت ۴۸

اب سوچیے کیا یہ ممکن ہے کہ خدا اپنے رسول کو منافقین سے جنگ کا حکم دے لیکن رسول منافقوں کو پہچانتے ہی نہ ہوں؟ ایک طرف تو رسول سے کہے ان کی دعوت پر توجہ نہ کرو اور دوسری طرف آخری عمر تک رسول ان کو پہچانتے ہی نہ ہوں کیا یہ ممکن ہے؟ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ منافقین کی عدم شناخت موقتی تھی دائمی نہیں تھی۔ [1]

اب یہاں سے ان آیات کو ملاحظہ فرمائیے جو غیر خدا کے لئے علم غیب کا اثبات کرتی ہیں:

۱. وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ ۝ پ ۴ (آل عمران) آیت ۱۷۹ "خدا تم کو غیب کی باتوں سے آگاہ نہیں کرے گا البتہ خدا اپنے رسولوں میں جس کو چاہتا ہے اسکو (غیب کے لئے) منتخب کر لیتا ہے۔

۲. ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۝ پ ۳ (آل عمران) آیت ۴۴۔ "(اے رسول) یہ غیبی اخبار ہیں جن کی وحی ہم تم کو کر رہے ہیں"۔

۳. عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ پ ۲۹ (جن) آیت ۲۶-۲۷۔ "(خدا) عالم غیب ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ رسول کے کہ اس کے آگے اور پیچھے (فرشتوں کو) نگہبان مقرر کر دیا ہے"۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے غیب کا ذاتی مالک حقیقی خدا ہے اور وہ اپنے

---

[1] آگاہی سوم صفحہ ۱۸۳

غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں اس کے وہ بندے جو اسکے پسندیدہ ہوں (یعنی انبیائے کرام) انکو مطلع کرتا ہے اور انکے لئے نگراں بھی معین کرتا ہے ـــــــ

اور یہ قرآن جبرئیل کا کلام ہے جو بہت طاقتور فرشتہ ہے۔ اور صاحب عرش کے نزدیک ہی رہتا ہے فرشتوں کا کمانڈر انچیف ہونے کے ساتھ وحی الٰہی کا امین ہے اور تمہارا رسوؐل (یعنی محمدؐ) دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے جبرئیل کو مشرق کے افق اعلیٰ میں دیکھا ہے۔ اور یہ غیب کے سلسلے میں بخیل بھی نہیں ہے۔ اگر مصلحت ہو تو تم کو بھی غیب بتا سکتا ہے۔

یہاں پر اثبات غیب کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ رسوؐل غیب بتلانے میں بخیل بھی نہیں ہے۔

جب ان دونوں قسموں کی آیتوں کو ایک دوسرے کے پہلو میں رکھا جائے تو خود ایسے شواہد و قرائن ان آیتوں میں مل جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں قسموں میں تضاد نہیں ہے۔ بلکہ پہلی قسم کی آیتوں میں غیب ذاتی و استقلالی کی نفی ہے اور دوسری قسم میں غیب نسبی کا ثبوت ہے۔ یعنی خدا اپنے جس رسولؑ کو چاہے غیب عطا کر سکتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ انبیا کو جو غیب دیا جاتا ہے انکی معنوی و روحانی ظرفیت کی مناسبت سے دیا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں انبیاء کے رشد فکری و نفسانی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اور جو لوگ انبیاء اور ائمہ کے بارے میں علم غیب کے مدعی ہیں ان کا بھی مطلب غیب ذاتی و استقلالی نہیں ہے۔ اس طرح آیات کی دو قسموں ـــ پہلی قسم جس میں غیب کی نفی کی گئی ہے اور دوسری قسم جس میں غیب کا اثبات کیا گیا ہے ـــ میں رفع تضاد مکمل طور سے واضح ہو جاتا ہے۔

●

اگر صحیح طور سے دیکھا جائے تو رسالت الٰہی کا دعویٰ علم غیب وآگاہی از وحی کے ساتھ ہے۔ کیونکہ یہ بالکل ہی بے معنی سی بات ہے کہ نبی ایک طرف تو دعوائے نبوت کرے اور دوسری طرف اپنے سے علم غیب کی نفی کرے۔ اور قرآن نے جو انبیاء سے علم غیب کی نفی کی ہے اسکا مطلب جاہلیت کے طرز فکر کی تغلیط تھی کیونکہ انلوگوں کا خیال تھا کہ انبیاء انسانی خصوصیات سے مبرا ہوتے ہیں اور ایسی علمی صلاحیت رکھتے ہیں جو کائنات ہستی میں کسی کو میسر نہیں ہے اور وہ اپنی لامحدود طاقت وقوت کے بل بوتے پر ان سے جس بات کی خواہش کی جائے فوراً پوری کر دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں انبیاء کیلئے ایسے عقیدے رکھنے کا مطلب انکے لئے بعنوان موجود فوق البشر پرستش کے راستے کھولنا تھے۔ اس لئے قرآن نے اس قسم کے عقائد کی تردید کر دی۔ اور انکی ذہنیتوں کو حقیقت کے قبول کرنے پر آمادگی عطا کرنے کیلئے یہ اعلان کرانا ضروری سمجھا کہ انبیاء بھی عام انسانوں کی طرح کھاتے ہیں راستہ چلتے ہیں آرام کرتے ہیں ان تمام باتوں کے باوجود ان کا اہم امتیاز یہ ہے کہ بواسطۂ وحی پیام الٰہی کو حاصل کرتے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو پہونچاتے ہیں۔

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف رسالت انبیاء کی حقانیت ثابت کرے اور دوسری طرف باطل نظریات کو ختم کر دے تاکہ انسان شرک سے محفوظ رہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

«وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ۔ (اسراء آیت ۹۰ــ ۹۳)

اور انھوں نے کہا ہم تم پر اسوقت ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے چشمہ نہ جاری کر دو یا تمھارے لئے خاصکر کھجوروں اور انگوروں کا ایسا باغ نہ ہو جس کے اندر تم زمین کھود کر چشمہ نہ جاری کر دو (اور) یا پھر اپنے خیال کے مطابق ہمارے اوپر آسمان کا ایک ٹکڑا نہ گرا دو یا اللہ اور فرشتوں کو سامنے لاکر کھڑا نہ کر دو یا تمھارے پاس سونے کا محل نہ ہو یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تمھارے اس جادو پر بھی ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم پر ایک ایسی کتاب نہ اتار دو جس کو ہم پڑھیں تم کہو میرا خدا ان باتوں سے مبرا ہے اور میں تو صرف ایک رسول ہوں " ـــــ اسی طرح لوگ کہتے تھے : یہ رسول کھانا کیوں کھاتا ہے بازار میں کیوں چلتا ہے اس پر کیوں ظاہری طور سے فرشتہ نہیں اترتا تاکہ اسکی سچائی کا گواہ ہو ۔ یا اس رسول کے پاس خزانہ کیوں نہیں ہے یا اس کے پاس باغ کیوں نہیں ہے کہ اسکے پھلوں کو کھایا کرے "۔ (سورہ فرقان آیت ۷ ـ ۸)

آپ نے دیکھا جاہلی زمانہ کے انسانوں کا یہ طرز فکر تھا !

کیا امام دنیائے غیب سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے؟

افرادِ بشر میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کیلئے الہام و اشراق کی مدد سے علمِ غیب کے دریچے کھل جاتے ہیں اور بہت سے پوشیدہ حقائق پر آگاہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ استدلال و تفکر و قوتِ عقل کے اعمال سے وہ کبھی اس منزل تک نہیں پہونچ سکتے تھے۔

اشراق و الہام کے اس قسم کا تعلق اور غیر حسی ادراک حقیقت شناسی کا ایک راستہ ہے جو محدود جہاں بینی کے پیشِ نظر تو قابل توجیہ نہیں ہے لیکن اصولِ علمی کے اعتبار سے ناقابلِ انکار ہے۔

ڈاکٹر الکسیس کارل — DR. ELECSES, COROL — جو بہت مشہورِ عالم ہیں وہ الہام و ادراکِ عرفانی کیلئے ایک خاص منزلت کے قائل ہیں۔ اور اسکی قدر و قیمت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اس کو ایک استثنائی عطیہ خیال کرتے ہیں چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

جو لوگ نابغہ ہوتے ہیں وہ طاقت مطالعہ اور ادراک قضایا کے علاوہ دیگر بعض خصوصیات مثلاً الہام و اشراق کے حامل ہوتے ہیں۔ جو چیزیں دوسروں پر پوشیدہ ہیں یہ لوگ اشراق کے ذریعہ اس پر مطلع ہو جاتے ہیں، مجہول اور جن قضایا کے درمیان

بظاہر کوئی رابطہ وارتباط نہیں ہے یہ اس کے اندر مجہول روابط کو دیکھ لیتے ہیں، مجہول خزانوں کو اپنی ذہانت سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے روشن بین حضرات حواس کے سہارے بغیر دوسروں کے افکار کو پڑھ لیتے ہیں۔ زمان ومکان کی قید سے آزاد اور ان سے پرے ہونے والے حوادث کو کم وبیش دیکھ لیتے ہیں اور بعض چیزوں اور واقعات کے بارے میں ایسی خبریں دیتے ہیں جو حواس سے حاصل شدہ خبروں سے زیادہ قابل اطمینان ہوتی ہیں۔

روشن فکر افراد کیلئے دوسروں کے چہروں کو دیکھ کر کچھ بیان کر دینے سے زیادہ آسان بات دوسروں کے افکار کو پڑھ لینا ہے۔ کیونکہ چہرہ دیکھ کر شعور میں پیدا ہونے والے افکار کو نہیں بیان کیا جاسکتا کیونکہ آدمی جس چیز کو نہیں دیکھتا اس کے لئے جستجو بھی نہیں کرتا۔

بہت سے ایسے بھی افراد ہیں جو عام حالات میں روشن فکر نہیں ہیں لیکن انھوں نے اپنی پوری زندگی میں ایک دو مرتبہ اس قسم کے ارتباطات (یعنی قلبی اور روحانی رابطہ) کا تجربہ کیا ہے۔ اور یہ چیز عالم خارج کی معرفت حس کے علاوہ دوسرے اور ذرائع سے بھی ممکن ہے۔ اور یہ بات بھی ناقابل تردید ہے کہ دو ایسے بشر جن میں ڈائرکٹ کوئی رابطہ نہ ہو ہم اپنی قوت فکر کے ذریعہ انہیں رابطہ کو سوچ سکتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ فکری دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اور ہمارے اوپر واجب ہے کہ علم متاپسیکک میں جن امور سے بحث کی جاتی ہے انکو قبول کریں کیونکہ اس علم کے اندر وجود انسانی کے ان پہلوؤں اور حقائق سے بحث کی جاتی ہے جو ابھی تک ہمارے لئے مجہول ہیں اور ہو سکتا ہے آگے چل کر یہ علم بعض لوگوں میں جو فوق العادۃ روشن فکری ہوتی ہے انکو بیان کر سکے۔ ۱؎

۱؎ انسان موجود ناشناختہ ص۱۳۵ اور اسکے بعد

اس بنا پر ہو سکتا ہے کہ روح انسانی کیلئے (اعضاء کے علاوہ) ایک یا کئی ایسے راستے ہوں جس سے وہ عالم خارجی سے رابطہ پیدا کر سکتی ہو اور وہ راستے حسی و عقلانی ادراک کے علاوہ ہوں۔ اور محققین اپنی تحقیقات کے مطابق اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کا امور غیبی پر مطلع ہونا نہ صرف یہ کہ ممکن امر ہے بلکہ ثابت شدہ چیز ہے۔

●

یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ انسان عالم خواب میں خارجی دنیا سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ اور کچھ جدید اطلاع بھی فراہم کر لیتا ہے تو پھر اسمیں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ اسکی روحانی و باطنی طاقت عالم بیداری میں بھی ایسے کرشمے دکھا سکے اور پروردگار نے اپنے بندوں کیلئے یہ دریچہ اسی لئے کھول رکھا ہو تاکہ اس کے بندے کچھ پوشیدہ حقائق معلوم کر سکیں۔

جب عام انسان کیلئے یہ خدائی عطیہ ہے کہ وہ اپنی روحانی طاقت سے غیب کی باتوں پر مطلع ہو سکے تو پھر وہ کامل و اکمل حضرات جیسے انبیاء و اولیاء کیونکہ امور غیبی پر مطلع نہیں ہو سکتے؟

علوم آئمہ کا سب سے عمدہ طریقہ وہ الہام ہے جو خدا کے حکم سے ان حضرات پر ہوا کرتا ہے اور یہ حضرات عالم غیب سے رابطہ پیدا کر کے بہت سے حقائق و واقعات پر اطلاع حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بہت سی روایات اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ برگزیدگان خدا عالم غیب سے (جب چاہیں) رابطہ پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح مخفی حقائق اور اسرار و رموز پر مطلع ہو سکتے ہیں ــــ اور جہان غیب سے ائمہ پر جو الہامات ہوتے ہیں وہ وحی الٰہی کے ماسوا ہوتے ہیں کیونکہ جو الہامات ان حضرات پر کئے جاتے ہیں ان میں یہ فرشتہ وحی (جبرئیل) کو نہیں دیکھتے ــــ اگر یہ

الہامات از قسم وحی ہوتے تو یہ حضرات جبرئیل کو بھی دیکھتے مترجم ـــ البتہ جن حقائق پر ان کو مطلع کیا جاتا ہے اس سے ان کے ادراکات کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور انکی علمی طاقت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

البتہ ائمہؑ کا عالم غیب سے جو ارتباط ہوتا ہے وہ بطور اطلاع ـــ بغیر کسی قید و بند کے ـــ نہیں ہوتا۔ بلکہ انکے ارتباط کی ایک حد معین ہوتی ہے اور ایک مخصوص چوکھٹے کے اندر ہی اندر ہوتا ہے۔ اور یہ حد بندی خود خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ حضرات اپنے محدود علم اور خدا کی مدد کے محتاج ہونے کی وجہ سے مطلق غیب کو نہیں جانتے کیونکہ مطلق غیب کا عالم صرف خدا ہوتا ہے۔ اور کوئی نہیں۔ لیکن چونکہ یہ حضرات اپنے زمانے کے کامل ترین انسان ہوتے ہیں اور اسماء و صفات الٰہی کے مظہر تام ہوتے ہیں اور انکی نورانیت درجہ کمال پر ہوتی ہے اس لئے جب یہ عالم غیب کیطرف متوجہ ہوتے ہیں تو عالم غیب و شہود کا مالک خدا کچھ غیبی مسائل اور حقائق کائنات انکے اختیار میں دیدیتا ہے۔ اور انکے علوم میں گہرائی پیدا کرنے کیلئے عالم غیب کا دریچہ ان کے لئے کھول دیتا ہے۔

لہٰذا ان حضرات کا عالم غیب سے اتصال و ارتباط پیدا کرنا بطور استقلال انکے لئے ثابت نہیں ہے۔ بلکہ اسمیں لطف پروردگار بھی شامل ہے اور جن روایات میں ائمہ نے اپنے سے علم غیب کی نفی کی ہے ان کا بھی مطلب یہی ہے کہ یہ حضرات بطور استقلال عالم غیب نہیں ہیں اور انکے پاس جو علم غیب ہے وہ خدا کی مرضی کے بغیر نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ حضرات علم غیب جانتے ہی نہیں۔۔!

امام محمد باقرؑ کے ایک صحابی ـــ جنکا نام حمران تھا ـــ نے امامؑ سے پوچھا: عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ اَحَدًا کا کیا مطلب ہے؟ سائل کی بات تمام ہونے

سے پہلے امامؑ نے فرمایا : اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ۔ (پ ۲۹ س ۷۲ (جن) آیت ۲۶)

نوٹ ۔ : سائل نے جو آیت پڑھی اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم الغیب ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ۔ امامؑ نے آیت کا اگلا حصّہ پڑھ دیا : لیکن جس رسول کو پسند کرے اسکو غیب پر مطلع کر دیتا ہے ۔ ۔ انتہیٰ ۔

اسکے بعد امامؑ نے فوراً فرمایا : خدا کی قسم محمدؐ وہ رسول تھے جو خدا کے پسندیدہ تھے ۔ اور خدا کے اس قول " عالم الغیب " کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں بندوں پر پوشیدہ ہیں ان چیزوں کے خلق کرنے سے پہلے اور فرشتوں تک پہونچنے سے پہلے خدا مرحلۂ قضا و قدر میں ان چیزوں سے واقف تھا ۔ اے حمران یہ وہی علم ہے جو ذات پروردگار عالم کیلئے مخصوص ہے کہ اگر اس کا ارادہ ان چیزوں سے متعلق ہو تو ان کو پیدا کرتا ہے ۔ اور نہ متعلق ہو تو نہیں پیدا کرتا ۔ لیکن جو علم مرحلۂ قضا و قدر میں پہونچ چکا ہے وہ رسولِ خداؐ پر القا کیا جا چکا ہے اور ان سے ہم تک پہونچا ہے ۔ ؎۱

●

قرآن بڑی صراحت کے ساتھ اعلان کر رہا ہے کہ خدا اپنے برگزیدہ بندوں کو (جیسے انبیائے کرامؑ) مختلف دور میں علم غیب سے مطلع کرتا ہے تو پھر آئمہ معصومینؑ بھی عنایت و اعانت پروردگار عالم سے بوقت ضرورت جہان غیب سے رابطہ پیدا کر سکتے ہیں اور ضروری اطلاع فراہم کر سکتے ہیں لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ آئمہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اپنی باطنی طاقت سے استفادہ کرتے تھے اور جہان غیب سے اتصال رکھتے تھے ۔ اور اپنے تمام کاموں میں علم غیب کا سہارا لیتے تھے کیونکہ خدا کا بنیادی

؎۱ اصول کافی ج ۱ ص ۲۵۶

مقصد یہ ہے کہ رسولؐ و امامؑ کو بصورت بشر مبعوث کرے اور انکی روزمرہ کی زندگی بالکل اسی طرح کی ہو جیسے عام انسانوں کی ہوتی ہے۔ اور اسی پروگرام کے پیش نظر یہ حضرات ظاہری طور سے تمام امور انجام دیتے تھے۔ اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کرتے تھے چلتے چلتے تھے بازاروں میں چلتے تھے کسب معاش کرتے تھے یعنی عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور دوسرے افراد کی طرح شرعی تکالیف کے پابند تھے اسی لئے معاشرے میں تعلیم و تعلم میں، مخلوق کو ہدایت کرنے میں، وہی طریقہ اختیار کرتے تھے جو عام لوگوں کا ہوتا تھا تاکہ لوگ یہ خیال کریں کہ یہ بھی ہماری طرح کے ہیں اگر ایسا نہ کرتے تو لوگوں کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ تھا۔

ایک اور نکتہ کی طرف آپکی توجہ مبذول کرا دوں کہ آئمہؑ کے غیب جاننے ــــ مثلاً کسی چیز کے ہونے سے پہلے اسکی اطلاع رکھنا، یا فلاں بات یقیناً ہو کے رہے گی ــــ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان حضرات کا علم اس میں موثر ہے بایں معنی کہ اگر یہ نہ جانتے ہوتے تو فلاں واقعہ نہ ہوتا ان کے علم کی وجہ سے فلاں بات ہوئی جیسے ڈاکٹر کا علم مریض کے مرنے کے سلسلہ میں موثر نہیں ہوتا یعنی مریض کی موت آئی ہے تو وہ مرے گا خواہ ڈاکٹر کو علم ہو یا نہ ہو۔ اس لئے خیام کا یہ کہنا کہ اگر مے نخورم علم خدا جہل شود صرف بکواس ہے یہ اس وقت درست ہوتا جب علم خدا موثر ہوتا۔ مترجم ــــ

امام کا یہ جاننا کہ فلاں شخص اپنے ارادے و اختیار سے فلاں کام کرے گا اس شخص کے ارادہ و اختیار میں کوئی تاثیر نہیں رکھتا۔ اور نہ اس کا شمار روکنے والے عوامل میں ہوگا کہ انسان سے اس کی آزادیٔ عمل کو سلب کر لے۔ اور آئمہؑ کی تکلیف کا تعلق عادی و عام طریقوں سے ہوتا ہے نہ کہ غیبی معلومات کی بنا پر۔ یعنی غیبی معلومات قضائے مبرم کی اطلاع یہ سب حادثات کی خبر دیتا ہے اس سے کوئی شرعی تکلیف ثابت نہیں ہوتی۔

اور یہ غیب کی خبر دینا نہ کوئی امر ہے نہ نہی ہے۔

ایک امام کے صحابی کا بیان ہے کہ اہل فارس میں سے ایک شخص نے امام موسیٰ کاظمؑ سے پوچھا: کیا آپ حضرات غیب جانتے ہیں؟ امامؑ نے اسکے جواب میں کہا: امام باقرؑ نے فرمایا ہے: کبھی علم غیب ہمارے اختیار میں ہوتا ہے تو ہم جانتے ہیں اور کبھی ہمارے اختیار میں نہیں ہوتا تو ہم نہیں جانتے۔ خداوند عالم نے کچھ اسرار جبرئیل کے حوالے کئے، جبرئیل نے رسولِ خدا کو اسکی اطلاع دی۔ اور رسولِ خدا نے جس کو چاہا اسکو آگاہ کر دیا۔ [1]

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: جس طرح حضرت ابراہیم نے ملکوت آسمان و زمین کا مشاہدہ کیا تھا کیا حضرت رسولؐ نے بھی مشاہدہ فرمایا تھا؟ امامؑ نے فرمایا: ہاں رسولؐ نے بھی مشاہدہ کیا اور تمہارے امامؑ نے بھی۔ [2]

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: اگر امام کسی چیز سے اطلاع حاصل کرنا چاہتا ہے تو خدا اسکو آگاہ کر دیتا ہے۔ [3] ہم اولوالامر علم خدا کے خزانہ دار اور وحی خدا کے محل اسرار ہیں۔ [4] خدا کی شان اس سے کہیں بزرگ ہے کہ جس کے ذریعہ اپنے بندوں پر حجت تمام کرتا ہے۔ اسی پر زمین و آسمان کی خبروں کو پوشیدہ رکھے۔ [5]

اگر جناب موسیٰ و خضر کے درمیان میں ہوتا تو میں انکو بتاتا کہ میں تم لوگوں سے زیادہ عالم ہوں اور ایسے امور بیان کرتا جس کو وہ نہیں جانتے تھے۔ کیونکہ یہ حضرات

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۲۵۶

[2] اصول کافی ج ۲ ص ۲۵۸

[3] بحار ج ۲۶ ص ۱۱۵

[4] اصول کافی ج ۱ ص ۱۹۲

[5] بحار ج ۲۶ ص ۱۱۰

صرف ماضی کے حالات جانتے تھے اور حال کے، اور قیامت تک ہونیوالے حالات سے آگاہ نہیں تھے۔ لیکن انکو رسولخدا کا علم میراث میں ملا ہے۔ [1]

خدا کی قسم مجھے اولین و آخرین کا علم عطا کیا گیا ہے۔ اتنے میں ایک صحابی نے پوچھا: کیا آپ علم غیب جانتے ہیں؟ فرمایا: تجھ پر وائے ہو اس بارے میں تو ان نطفوں سے بھی آگاہ ہوں جو ابھی رحم مادر اور پشت پدر میں ہیں۔ تملوگوں پر وائے ہو اپنے سینوں میں وسعت پیدا کرو، تاکہ تمہاری آنکھیں بینا ہوں تمہارے دل مسائل کا ادراک کر سکیں۔ ہم مخلوق خدا کے درمیان حجت خدا ہیں۔ لیکن ان حقائق کا تحمل وہی مومن کر سکتا ہے جسکا ایمان تہامہ جیسے پہاڑ کی طرح محکم و مضبوط ہو۔ خدا کی قسم اگر ہم چاہیں تو تہامہ پہاڑ کے سنگریزوں کی تعداد انکو بتا سکتے ہیں۔ (سنو) ہر شب و روز یہ سنگریزے اسی طرح انکی تعداد بڑھتی ہے جیسے انسانوں کے یہاں اولاد ہوتی ہے۔ خدا کی قسم میرے بعد ایک دوسرے سے دشمنی کرنے لگوگے یہاں تک کہ تمہارا ایک گروہ دوسرے کو تباہ و برباد کر دے گا۔ [2]

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں:

حضرت علیؑ سے رسولخدا کے علم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: رسولخدا کے پاس تمام انبیاء کا علم تھا اور ما کان و ما یکون کا علم تھا پھر اضافہ فرماتے ہوئے فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے رسولخدا کا علم میرے پاس ہے گذشتہ اور قیامت تک ہونیوالی چیزوں کا میرے پاس علم ہے۔ [3]

حضرت علیؑ ہی کا قول ہے:

---

[1] کافی ج ۱ ص ۲۲۱ — [2] بحار ج ۲۶ ص ۲۷ — [3] بحار ج ۲۶ ص ۱۱۰

مجھے اس گروہ پر تعجب ہے جو ہماری امامت کے قائل ہیں اور مانتے ہیں کہ ہماری اطاعت عین اطاعت خدا اور رسول کی طرح واجب ہے۔ لیکن اپنی دلیل کو خود توڑ دیتے ہیں اور اپنے بیمار دلوں کے باعث اپنی ہی دشمنی پر اتر آتے ہیں۔ ہمارے حق کو کم سمجھتے ہیں جو لوگ ہمارے حق سے واقف نہیں ان پر اعتراضات کرتے ہیں کیا تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ خدا اپنے بندوں کو ہماری اطاعت کا حکم تو دیتا ہے لیکن زمین و آسمان کی خبروں کو ہم سے مخفی رکھتا ہے۔ اور بندوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ چیزیں ہم کو نہیں بتاتا۔[1]

امام جعفر صادقؑ حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے فرمایا:

خداوند عالم نے ہم کو تو ایسی خصوصیتیں عطا کی ہیں جو رسول اکرمؐ کے علاوہ کسی کو نہیں عطا فرمایا۔ علوم کے دروازے ہمارے لئے کھول دیئے، موت، بلاؤں، نسبوں، فصل خطاب کی ہم کو تعلیم دی، (فصل خطاب سے مراد حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والی چیز یا حکم ہے) ملکوت الٰہی میں نظر کی، گذشتہ و آئندہ کے حالات و واقعات کا ہم کو علم دیا، خدا نے لوگوں کے دین کو ہماری ولایت کی وجہ سے کامل کیا اور ان پر نعمتوں کو تمام کیا اور انکے اسلام کو پسند کیا کیونکہ میری ولایت کے دن رسول کو حکم دیا: لوگوں کو بتا دو آج میں نے ان کے دین کو کامل کر دیا اور ان پر نعمتوں کو تمام کر دیا اور ان کے اسلام کو پسندیدہ قرار دیا یہ سب میرے اوپر خدا کا کرم ہے بس تمام سپاس و ستائش اسی کی ذات اقدس سے مخصوص ہے۔[2]

●

اہلسنت کے بہت بڑے عالم ابن ابی الحدید معتزلی تحریر کرتے ہیں:

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۲۶۱

[2] بحار ج ۲۶ ص ۱۴۱

حضرت علیؑ نے جو یہ فرمایا۔ آئندہ کے بارے میں مجھ سے جو بھی پوچھو میں بتاؤنگا ۔ ہے اسکا مطلب نہ تو خدائی کا دعویٰ ہے نہ رسالت کا دعویٰ ہے۔ بلکہ حضرت علیؑ کا مقصد یہ ہے کہ میں جو یہ غیب کی باتیں بتا رہا ہوں انکو رسولؐ خدا سے سیکھا ہے اس کے بعد ابن ابی الحدید اضافہ کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی طرف سے جو غیبی خبریں پہونچی ہیں ہم انکا امتحان کیا اور تمام کی تمام خبریں حقیقت کے مطابق تھیں اور حضرت علیؑ کی خبروں کا واقع کے مطابق ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو غیب کا علم تھا۔ اور اسی لیے آپ فرماتے تھے کہ: اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں آئندہ کے حالات سے واقف ہوں مجھ سے جو بھی پوچھو اس سے تمکو آگاہ کروں گا۔ (ابن ابی الحدید ج ص)

میثم تمار کا قصہ تو بہت ہی مشہور ہے: تاریخوں میں ہے کہ ایک دن بہت بڑے مجمع میں حضرت علیؑ نے میثم تمار ۔۔۔ یہ حضرت علیؑ کے مخصوص صحابہ میں سے تھے ۔۔۔ کو مخاطب کرکے انکو انکی زندگی کی غم بھری داستان اسطرح سنائی:

اے میثم میرے بعد تم گرفتار کئے جاؤگے۔ تم کو سولی دی جائیگی اس واقعہ کے دوسرے دن تمھارے دانتوں اور ناک کے خون سے تمھاری ڈاڑھی رنگین ہوگی تیسرے دن نیزے کی شدید ضرب سے جو تم پر لگائی جائیگی شہید ہو جاؤگے۔ اس دن کا انتظار کرو جس جگہ یہ واقعہ تم پر گذرے گا وہ عمرو بن حریث کے گھر کے قریب ہوگی۔ تم دسویں وہ آدمی ہوگے جو اسطرح جان دوگے بس اتنا فرق ہوگا جس لکڑی پر تمکو سولی دی جائیگی وہ اوروں کے مقابلے میں چھوٹی ہوگی جس درخت پر تمھارا اجر ختم ہوگا میں اسکو تمھیں دکھادونگا۔ دو دن کے بعد اس درخت خرما کو میثم کو بیجا کر دکھا بھی دیا:

میثم دن کے وقت کبھی اس درخت کے سائے میں پناہ لیتے تھے اور اس وسیع و پرسکون جگہ پر اپنے معبود کی عبادت میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اور تھوڑی دیر

کیلئے اور درخت کیطرف متوجہ ہو کر کہتے تھے : خدا تجھے برکت دے کہ مجھے تیرے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور تو میرے لئے اُگا ہے۔

اور جب کبھی عمرو بن حریث سے ملاقات ہو جاتی تھی تو کہتے تھے : میری ہمسائیگی کا خیال رکھنا لیکن عمرو میثم کا مطلب نہ سمجھ کر تعجب سے پوچھتے تھے : کیا آپ ابن مسعود والا مکان خرید رہے ہیں ؟ یا ابن حکم والا ؟

دن گزرتے رہے حضرت علیؑ کی شہادت ہو گئی ایک دن میثم کو گرفتار کر کے عبیداللہ بن زیاد کے حوالے کر دیا گیا۔ اور میثم جو خلوص و محبت حضرت علیؑ سے رکھتے تھے ابن زیاد کے گوش گزار کر دیا گیا اور ابن زیاد جو ہمیشہ سے آل علیؑ کی محبت میں جلنے والے چراغوں کو خاموش کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اپنی طاقت کے نشہ میں چور ہو کر میثم کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے۔

ابن زیاد : تمہارا خدا کہاں ہے ؟

میثم : بہت ہی سکون و اطمینان سے کہتے ہیں : ظالموں کی تاک میں ہے۔

ابن زیاد : میں نے سنا ہے علیؑ نے تمکو تمہاری سرنوشت سے آگاہ کر دیا ہے ؟

میثم : ہاں خبر دیدی ہے۔

ابن زیاد : بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرونگا ؟

میثم : میرے مولا نے کہا ہے کہ تو مجھے سولی دے گا اور میں دسواں آدمی ہونگا جو سولی پر چڑھایا جاؤنگا اور میرے سولی کی لکڑی سب سے چھوٹی ہوگی۔

ابن زیاد : (غصہ سے) علیؑ نے جو کچھ کہا ہے میں اسکے خلاف کرونگا۔

میثم : تم حضرت علیؑ کی مخالفت کیونکر کر سکتے ہو ؟ اسلئے کہ رسول خدا نے

حضرت علیؑ کو میرے ماجرا سے آگاہ کیا تھا اور جبرئیل نے رسولِ خدا کو بتایا تھا اور خدا نے جبرئیل کو خبر دی تھی۔ میں تو دار کے اس جگہ کو بھی جانتا ہوں جہاں پر سولی دی جائیگی اور میں پہلا مسلمان ہوں کہ میری زبان کو لگام لگائی جائیگی۔

ابن زیاد نے حکم دیا میثم کو قید خانہ میں ڈالدو۔ میثم نے قید خانہ میں پہونچکر مختار سے رابطہ قائم کرلیا اور مختار سے کہا تم قید خانہ سے آزاد ہوجاؤگے اور امام حسینؑ کے خون بدلہ لینے کیلئے قیام کروگے اور ابن زیاد کو قتل کروگے۔

زیادہ دن نہیں گذرے تھے کہ مختار قید سے رہا ہوگئے میثم کو ابن زیاد کے پاس لیجایا گیا اس نے حکم دیا کہ عمرو بن حریث کے مکان کے پاس جو درخت خرما ہے وہاں پر میثم کو سولی پر لٹکا دیا جائے اب عمرو بن حریث کو میثم کی گفتگو یاد آئی اور میثم کا مطلب سمجھے اسی لئے عمرو نے اپنے خادم کو حکم دیا ہر شب درخت کے نیچے صفائی کرو اور چراغ جلایا کرو۔

جتنے گھنٹوں میثم دار پر چڑھے رہے لوگ انکے گرد جمع ہوجاتے تھے اور میثم سے فضائل و مناقب اہلبیت سنا کرتے تھے کیونکہ علیؑ کی محبت میثم کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ابن زیاد کو خبر دی گئی میثم نے دار سے تیری عزت لے لی اور تجھ کو ذلیل و خوار کردیا ابن زیاد نے غصہ سے حکم دیا میثم کی زبان کو لگام لگا دو تاکہ وہ کوئی بات نہ کرسکیں۔

میثم کا قصہ حضرت علیؑ کی پیشنگوئی کے مطابق انجام پاتا رہا۔ دوسرے دن میثم کا جسم مقدس دار پر تھا کہ ناک و منہ سے خون بہنے لگا اور پھر تمام رنج و غم کو برداشت کرتے ہوئے ظالموں نے میثم کے بدن پر ایسا نیزہ مارا جس سے انکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور اسطرح حضرت علیؑ کا قول سچا ثابت ہوا (ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۲۹۱)

خاتمۂ جنگ جمل اور فتح بصرہ کے بعد حضرت علیؑ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا :

"خدا کی قسم تمہارا شہر ڈوب جائیگا اور تمہاری مسجد سینۂ کشتی کی طرح پانی سے نکلی ہوگی خداوند عالم اس شہر بصرہ پر نیچے اور اوپر سے عذاب نازل کریگا"

ابن ابی الحدید نے ان کلمات کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے : ابتک بصرہ شہر دو مرتبہ ڈوب چکا ہے ایک مرتبہ "القادر باللہ" کے دوران حکومت میں یہ شہر خلیج فارس میں طغیانی آجانے کی وجہ سے پورا ڈوب گیا تھا۔ صرف جامع مسجد کا تھوڑا سا حصہ پانی کے اوپر دکھائی دے رہا تھا جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا تھا۔ اور دونوں مرتبہ تمام مکانات خراب ہو گئے تھے اور بہت سے لوگ موت کی آغوش میں سو گئے تھے۔ [1]

امام حسنؑ نے جعدہ کے ذریعہ زہر دینے کا واقعہ خود ہی بتا دیا تھا اور امام حسینؑ سے بھی فرمایا تھا : تیس ہزار لوگ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہونگے اے حسینؑ تمہارے قتل اور تمہاری اولاد و خاندان کو گرفتار کرنے کیلئے جمع ہو جائیں گے۔ [2]

بنی ہاشم نے طے کر لیا کہ محمد بن عبداللہ کو خلیفہ بنا یا جائے اسی مقصد کیلئے ایک جلسہ تشکیل دیا گیا۔ امام جعفر صادقؑ سے بھی اصرار کیا گیا آپ ضرور تشریف لائیں حضرت نے قبول فرمایا۔ جلسہ کی تشکیل کے بعد محمد نے امام ششمؑ سے کہا کہ آپ میری بیعت کریں۔ اسوقت امام نے فرمایا : خلافت نہ ملے گی نہ تمہارے دونوں لڑکوں محمد و ابراہیم کو ملے گی آپ نے سفاح کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ شخص خلیفہ ہوگا اسکے بعد یہ ہوگا۔ منصور کی طرف اشارہ فرمایا "پھر عباس کے فرزندوں کو ملے گی اور عالم یہ ہوجائیگا کہ بچے بھی خلافت کرنے لگیں گے اور عورتوں سے مشورہ لیا جانے لگے گا۔ اور تمہارے

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۲۵۳

[2] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۱۴۶

بیٹے محمد و ابراہیم بھی قتل کر دئے جائیں گے ۔ [1]

امام محمد باقرؑ نے اپنے بھائی "زید بن علیؑ" سے فرمایا :

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے کہیں تم لو آمادہ نہ کریں ۔ کیونکہ وہ لوگ تم سے عذاب خدا کو دور نہیں کر سکتے ۔ جلدی نہ کرو خدا بندوں کی جلد بازی کے ساتھ جلدی نہیں کرتا ۔ وقت سے پہلے اقدام نہ کرو ورنہ مشکلات و بلائیں تم کو کمزور کر دیں گی اور تم کو شکست ہو جائیگی اے بھائی میں تم کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں کہ تم وہی کوفہ کے محلہ کناسہ میں سولی پر چڑھائے جانے والے (زید) ہو ۔ [2]

شیخ حر عاملیؒ لکھتے ہیں : اس حدیث میں امامؑ نے جن چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور جنکی خبر دی ہے وہ تواتر کی حد تک پہونچ گئی ہیں ۔

حسین بشار کہتے ہیں : امام رضاؑ نے فرمایا :

عبداللہ (یعنی مامون) محمد (یعنی امین) کو قتل کر دیگا ۔ میں نے پوچھا ہارون رشید کا بیٹا محمد ؟ فرمایا : ہاں ! عبداللہ (مامون) جو خراسان میں ہے وہ محمد (امین) جو زبیدہ کا بیٹا ہے اسکو بغداد میں قتل کر دیگا ۔ [3]

حذیفہ کہتے ہیں میں نے امام حسینؑ کو فرماتے ہوئے سنا :

خدا کی قسم بنی امیہ میرا خون بہانے پر تل جائیں گے اور عمر بن سعد اس فوج کا سردار ہوگا (امام حسینؑ نے رسول اسلام کی زندگی میں یہ بات فرمائی تھی) میں نے پوچھا : فرزند رسول کیا آپکے نانا نے یہ بتایا ہے ؟ فرمایا نہیں تب میں رسول خدا کے پاس گیا اور امام حسینؑ کی گفتگو

---

[1] مقاتل الطالبین اصفہانی ص ۱۷۲

[2] مقاتل الطالبین ص ۲۹۸

[3] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۱۳۳

دیرائی! تو نبیؐ نے فرمایا: میرا علم حسینؑ کا علم ہے اور حسینؑ کا علم میرا علم ہے۔ [1]

امام حسن عسکریؑ کے اصحاب میں سے ابوہاشم نامی شخص کہتا ہے:

میں نے امام حسن عسکریؑ کو ایک خط لکھا اسمیں اپنے رنج و غم و گرفتاری وغیرہ کا ذکر کیا امامؑ نے جواب میں لکھا: آج تم نماز ظہر اپنے گھر میں پڑھوگے! اور واقعی میں ظہر وقت آزاد ہوگیا اور نماز ظہر اپنے گھر میں آکر پڑھی۔ [2]

خیران بیان کرتے ہیں:

ایک دن میں امام ہادیؑ سے ملاقات کرنے مدینہ گیا حضرتؑ نے مجھ سے پوچھا واثق کے بارے میں کیا خبر رکھتے ہو؟ عرض کیا میں نے دس دن پہلے اس سے ملاقات کی تھی بالکل صحیح و سالم تھا!

فرمایا: اہل مدینہ کہتے ہیں وہ مرگیا۔ پھر حضرت نے مجھ سے پوچھا: جعفر کے بارے میں بھی کچھ جانتے ہو؟ عرض کیا: وہ قید میں تھا اور اسکے حالات بڑے دردناک تھے فرمایا: وہ حکومت پر قابض ہوگیا۔ اسکے بعد حضرت نے ابن الزیات کے بارے میں پوچھا وہ کیا کررہا ہے؟ میں نے عرض کیا لوگوں کا اسکے اردگرد جمگھٹا تھا وہ امور کا حل و فصل کررہا تھا۔ فرمایا: وہ بھی خوش آئند نہیں تھا۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا! مقدرات الٰہی کو پورا ہونا ہے۔ واثق مرگیا، جعفر خلیفہ ہوگیا، ابن زیات کو قتل کردیا میں نے پوچھا یہ کب ہوا؟ فرمایا: تمہارے نکلنے کے چھ دن کے بعد یہ واقعات رونما ہوئے۔ [3]

سوید بن غفلہ کا بیان ہے:

---

[1] اثبات الہداۃ ج ۵ ص ۲ [2] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۲۸۹ [3] اثبات الہداۃ ج ۶ ص ۲۱۳

ایک دن حضرت علیؑ مسجد کوفہ میں خطبہ دے رہے تھے کہ منبر کے نیچے سے ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا: اے امیر المومنین وادی القریٰ سے گزرتے ہوئے میں نے سنا کہ خالد بن عرفطہ مر گیا خدا سے اسکی بخشش کیلئے فرمائیے: حضرت نے فرمایا: خدا کی قسم وہ زندہ ہے اور اسوقت تک زندہ رہے گا جبتک ایک ایسے گمراہ لشکر کی رہبری نہ کرے جس لشکر کا سردار حبیب بن حمار ہوگا۔ اتنے میں ایک شخص کھڑا ہوکر بولا میں حبیب بن حمار ہوں میرے بارے میں آپ ایسا کیوں فرما رہے ہیں جبکہ میں آپکا شیعہ ہوں؟ حضرت علیؑ نے فرمایا: تم حبیب بن حمار ہو؟ اس نے کہا ہاں۔ تب آپ نے فرمایا: خدا کی قسم تو اس گمراہ لشکر کا علمبردار ہوگا اور باب الفیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اس دروازے سے داخل ہوگا۔

ثابت ثمالی کہتے ہیں: خدا کی قسم مجھے یاد ہے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ابن زیاد نے عمر سعد کو ایک بہت بڑی فوج کا سردار بنا کر امام حسینؑ سے جنگ کیلئے بھیجا اور خالد بن عرفطہ اس فوج کا فرماندہ تھا۔ اور حبیب بن حمار علمبردار تھا اور لشکر باب الفیل سے مسجد کوفہ میں داخل ہوا۔[1]

منجملہ اور پیشنگوئیوں کے حضرت علیؑ نے رشید ہجری کا واقعہ بھی بیان کر دیا تھا:

جب رشید کو گرفتار کرکے ابن زیاد کے پاس لایا گیا تو زیاد نے پوچھا: علیؑ نے کیا بتایا ہے کہ تمھارے ساتھ کیا برتاؤ کرونگا؟ رشید نے کہا: میرے مولا نے فرمایا ہے تو میرے ہاتھ پاؤں کاٹے گا اسکے بعد سولی پر چڑھائے گا۔ ابن زیاد بولا: خدا کی قسم علیؑ نے جو کہا ہے میں اسکے برخلاف عمل کرونگا تاکہ ثابت ہوجائے

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۲ صفحہ ۲۸۶

کہ وہ غلط بیانی سے کام لیتے تھے۔ یہ کہکر حکم دیا کہ رشید کو آزاد کر دیا جائے۔ لیکن جب رشید مجلس سے باہر جانے لگے تو ابن زیاد نے کہا انکو واپس لاؤ کیونکہ اس سے زیادہ سخت سزا میرے علم میں نہیں ہے۔ اسکے بعد بولا: رشید کے ہاتھ پاؤں کاٹ دو اور دار پر چڑھا دو۔ آخرکار ابن زیاد کے احکام پر عمل کیا گیا۔ لیکن رشید کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی اور زبان کے خنجر سے اس کو اذیت پہونچاتے رہے آخرکار ابن زیاد نے حکم دیا: رشید کی زبان بھی کاٹ لو۔ رشید نے پھر کہا میرے مولا نے اسکی بھی خبر دی تھی کہ اے رشید تمھاری زبان بھی کاٹی جائیگی مختصر یہ کہ رشید کی زبان کاٹ کر انکو دار پر چڑھا دیا گیا۔ [1]

یہ وہ مختصر واقعات ہیں جنکو بطور نمونہ ذکر کیا گیا ہے۔ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں یہ واقعات ان راویوں کے حوالے سے لکھے گئے ہیں جو ایک زمانہ میں اور ایک جگہ نہیں رہتے۔ اور یہ چیزیں ہر منصف مزاج محقق کو اس بات پر آمادہ کرتی ہیں کہ وہ تسلیم کرے کہ آئمہ معصومین جہان غیب سے ارتباط رکھتے تھے۔ اور ان حضرات کے لئے یہ بات ممکن تھی کہ جب بھی چاہتے مرضی الٰہی کی موافقت کے ساتھ مخفی امور کی پیشنگوئی کر سکتے تھے۔

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۲۹۳

امام کے انتخاب کا طریقہ

طلوع اسلام ہی سے جو مسائل مسلمانوں میں محل بحث رہے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ ۔ طریقۂ انتخاب امام ہی کا ہے جس نے مسلمانوں کو دو بڑے فرقوں میں تقسیم کر دیا ۔ سنی ۔ شیعہ

شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ امام کو منصوص من اللہ ہونا چاہیئے یعنی امام کے معین کرنے کا حق صرف اور صرف خدا کو ہے ۔ اسلئے لوگوں کو اس میں مداخلت کرنیکا حق نہیں ہے ۔ یہ خدا کی ذمہ داری ہے کہ اپنے رسول کے ذریعہ امام کا تعین کر کے اعلان کر دے ۔

اصل امامت کے بارے میں شیعوں کی اتنی دقت اور انکا یہ عقیدہ کہ ہر زمانہ میں امام اور دینی پیشوا کا تقرر خدا اور اسکے رسول کے ذریعہ ہی ہونا چاہیئے اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ لوگ مقام انسان کی رعایت اور حقوق انسانی کی عظمت کے قائل ہیں ۔
جسطرح نبوت کیلئے کچھ شرائط ہیں بالکل اسی طرح امامت کیلئے بھی شرائط ہیں جنکو رسول کے بعد نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ لوگ امام کیلئے عالم ، عادل ، معصوم ہونیکو شرط جانتے ہیں کیونکہ معارف دین کی قطعی اور کامل معرفت ، احکام و قوانین الٰہی کی تبلیغ ، معاشرے کے اندر انکا صحیح نفاذ ، احکام کی حفاظت اسوقت تک ہو ہی نہیں سکتی جب تک امام کے اندر تمام وہ شرائط نہ ہوں جو نبی کیلئے ضروری ہیں

جو خدا ضمائر و سرائر پہ مطلع ہے، امام کے اندر تقویٰ، ثقافت دینی، قوت باطنی کا عالم ہے۔ وہی اس بات کو بھی جانتا ہے کہ معارف الٰہی کس کے سپرد ہونا چاہیئے۔ کون ہے جو ایک سکنڈ کے لئے بھی دعوت حق اور اصول عدالت سے غفلت نہیں کریگا۔ اور کون ہے جو ہر طرح دین خدا کے حدود کی حفاظت کر سکتا ہے۔

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ امام و رہبر کے بارے میں لوگوں کو مداخلت کا حق نہیں ہے اسکا سبب یہ ہے کہ لوگ کسی کی پاکیزگی، تقوائے باطنی، اسلامی اقدار، قرآن کے بارے میں معلومات کے بارے میں کافی اطلاعات نہیں رکھتے اور نہ ملکوتی طاقت (عصمت) کا ادراک کر سکتے ہیں اس لئے انکو حق نہیں ہے۔

اسی بنا پر ہم ضروری جانتے ہیں کہ امام کا تقرر یا تو پیغمبرؐ کیطرف سے ہو یا پھر اسکی معرفی امام وقت کرائے۔ اسی طرح اگر مدعی امامت خود ارتباط بغیب کا اثبات کر سکے اور معجزے وغیرہ کے ذریعہ سے اپنی عصمت و رہبری کی نشاندہی کر سکے تب بھی اس کی امامت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ طریقے ہیں جنکے ذریعہ مذہب شیعہ امام کی شناخت کا قائل ہے اسلئے اگر کوئی ان طریقوں پر عمل کر کے اپنے امام زمانہ کو پہچاننا چاہے تو پہچان سکتا ہے۔

●

اسی طرح سنیوں کے یہاں اسکے بالکل ہی برخلاف طریقہ موجود ہے ان لوگوں نے ابتدا ہی سے شوریٰ والی روش اپنانی چاہی جو ایک صحیح انداز فکر نہیں ہے اور اسی وجہ سے برادران اہلسنت اور انکے طرفدار جانشین رسولؐ کے معاملہ میں "ٹامک ٹوئیاں مارتے" رہے ہیں۔ خلافت کے مسئلے میں وہ حضرات درج ذیل چند طریقوں میں سے کسی ایک کو اپناتے ہیں۔

۱۔ اجماع . . . وہ کہتے ہیں خلافت اسلامی کا مسئلہ امت اسلامی کے انتخاب کے محور پر گھومتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف لوگوں کا انتخاب ہی حجت ہے۔ اگر امت کسی بھی شخص کو زعامت و امامت کیلئے منتخب کر لے تو اسکی رہبریت ثابت ہو جاتی ہے اور اسکی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں وہ حضرات وفات رسولؐ کے بعد سیرت اصحاب کو اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ چونکہ اصحاب رسولؐ نے تعین خلیفہ کیلئے ایک کمیٹی بنائی تھی اور سقیفہ میں موجود لوگوں میں اکثریت نے ابوبکر کو اسکا اہل سمجھا تھا انکی بیعت کر لی تھی لہذا ابوبکر کی خلافت ثابت ہے پس ابوبکر کے سلسلہ میں اصحاب رسولؐ کا اجماع متحقق ہو گیا اور کسی طرف سے اعتراض بھی نہیں اٹھا لہذا اجماع حجت ہے اور اثبات خلافت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ اجماع ہے۔

۲۔ شوریٰ . . . خلیفہ کے انتخاب کا دوسرا طریقہ باہم مشورہ اور تبادلہ خیال کے ذریعہ کسی کو خلیفہ نامزد کرنا ہے۔ یعنی جب مسلمانوں کی عظیم شخصیتیں مل بیٹھ کر مشورہ کر کے کسی کو زعامت مسلین کیلئے چن لیں اور رہبری کیلئے معین کر دیں تو پھر امت کا فریضہ ہے کہ اسکی خلافت کو تسلیم کرے اور اسکی اطاعت کرے۔

اس طریقہ کے موجد حضرت عمر ہیں جنھوں نے صدر اسلام میں اسکو اسطرح ترتیب دیا تھا کہ اپنے مرنے کے بعد کیلئے زندگی ہی میں حکم دیدیا تھا کہ میں چھ آدمیوں کو خلافت کا کنڈیڈیٹ معین کر رہا ہوں کہ یہ لوگ آپس میں طے کر کے انھیں سے کسی ایک کو خلیفہ معین منتخب کر لیں اور اپنے آدمیوں کو معین کر دیا تھا کہ چھ دن کے اندر یہ لوگ جلسے اور کمیٹی کر کے ان ہی چھ میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں اب اگر کسی کیلئے پانچ یا چار آدمی ووٹ دیدیں اور باقی مخالفت کریں تو انکو قتل کر دو۔ لہذا ان لوگوں نے

خلیفہ کے حکم کے مطابق عمل کیا اور بحث و تمحیص و تبادلۂ نظر کے بعد عثمان کو خلیفہ چن لیا۔ لہٰذا خلیفہ کے انتخاب کا ایک طریقہ یہ بھی ہوا۔

۳۔ جانشینی . . . یعنی خلیفہ اپنے بعد کیلئے کسی کو جانشین رسول نامزد کر دے۔ یعنی جس فرد کی صلاحیت و استعداد اس پر ثابت ہو جائے اسکو اپنا قائم مقام بنا دے۔ اور صدر اسلام میں یہ طریقہ بھی آزمایا گیا۔ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو اپنا جانشین معین کر دیا اور مسلمانوں کی طرف سے کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا۔ اسلئے یہ طریقہ بھی درست ہے۔

جانشین رسول کیلئے اہل سنت کا یہ نظریہ ہے۔

●

یہاں سے میں ان دلائل کی تردید کرنا چاہتا ہوں جن سے اہلسنت نے استدلال کیا ہے چنانچہ سب سے پہلا استدلال اجماع ہے۔ تو سنئے امام کا معصوم ہونا اور دین خدا کے تمام کلی و جزئی مسائل پر محیط ہونا اور روشن فکر و ادراک عمیق کا مالک ہونا ضروری ہے۔ اور اس پر قرآنی آیات، احادیث رسول، تاریخی تجربات شاہد ہیں۔ اسلامی تاریخ میں جو ظلم و تعدی، خطا و خلل پایا جاتا ہے اسکی واحد علت قائد کے خصائص امامت کا لحاظ نہ کرنا ہے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ امام کا تعین خدا کے علاوہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ چلئے ہم مان لیتے ہیں کہ ایک فرد پر تمام امت مسلمہ کا اجماع ہو جاتا ہے کہ اسی کو جانشین بنایا جائے تو کیا اس سے غلطی نہیں ہوگی؟ اور کیا لوگوں کے اجماع سے اس عمل کی حجیت ثابت ہو جائے گی؟

اور ابو بکر کی بیعت تو چند مٹھی بھر لوگوں نے کی تھی تو اس سے اجماع کہاں ثابت ہوا؟ اگر بفرض محال اجماع کو حجت مان بھی لیا جائے ــــ اور اس واقعہ سے

چشم پوشی ممکن نہیں ہے کیونکہ ابوبکر کیلئے اجماع حقیقی بہرحال نہیں ہوا کیونکہ پہلی بات تو یہی ہے کہ سارے مسلمان اس وقت مدینہ میں تھے ہی نہیں تو سب بیعت کیسے کر لیتے ؟ اور پھر سقیفہ میں مدینہ ہی کے تمام مسلمان نہیں جمع ہو پائے تھے۔ اس کے علاوہ اہلبیت رسولؐ، بہت سے صحابہ، خود سقیفہ میں موجود بعض عظیم صحابی ان تمام حضرات نے ابوبکر کی بیعت ہی نہیں کی تھی۔

بلکہ حضرت علیؑ، مقداد، سلمان، زبیر، عمار یاسر، عبداللہ بن مسعود، سعد بن عبادہ عباس ابن مطلب، اسامہ بن زید، ابی بن کعب، عثمان بن حنیف، اور دیگر بڑے بڑے صحابہ نے نہ صرف یہ کہ بیعت نہیں کی بلکہ اس انتخاب پر اعتراضات کی بوچھار کر دی اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ کھلم کھلا مخالفت کا اظہار کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھلا اجماع کیسے ہو گیا ؟ ـــــ یعنی اولاً تو اجماع کی حجیت ثابت نہیں ہے اور ثانیاً حجیت مان بھی لی جائے تو ابوبکر کے لئے اجماع ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ان کی خلافت بہرحال باطل ہے۔ مترجم ـــــ

آپکا یہ کہنا کہ انتخاب جانشین کے سلسلے میں تمام لوگوں کی شرکت ضروری نہیں ہے بلکہ اگر اہل حل وعقد، اطلاع جو شوریٰ میں محور اساسی ہوا کرتے ہیں وہی اسکو طے کر لیں تو انکے اقدام کو صحیح مانا جائیگا۔ اور انکی تعمیم کو بے چون چرا قبول کر لیا جائیگا۔

تو میں عرض کرتا ہوں کہ آخر وہ کون سی دلیل ہے جسکی بنا پر انکی تعمیم دوسروں کیلئے واجب العمل ہو جائے اور تمام وہ افراد جو معتبر ہیں صاحبان فکر و نظر ہیں، آگاہی، شناخت، تعہد و پاکی کے اعتبار سے قابل قبول ہیں اور امت اسلامی کی سرنوشت میں نقش اساسی رکھتے ہیں کیوں خارج ہیں ؟ اور یہ لوگ بے چون و چرا ایک گروہ کی بات کو کیوں تسلیم کر لیں ؟

اور آپکا یہ اصرار کرنا کہ چونکہ ابوبکر کی خلافت اسی طرح واقع ہوئی ہے لہٰذا اسی کو حجت مانا جائے۔ تو صدر اول میں صحابہ سے کسی فعل کا واقع ہونا اسکی مشروعیت پر مطلقاً دلیل تو نہیں ہے۔ اور ہم اسی لئے آپ سے سوال کرتے ہیں اسلام میں اس طریقہ کی حجیت پر کیا دلیل ہے؟ کیا صدر اول میں صحابہ کی ایک جماعت سے کسی عمل کا بغیر کسی دلیل کے سرزد ہو جانا دوسروں کے لئے دلیل ہے؟

یہ دلیل اسوقت قابل قبول ہوتی اگر اسکی مشروعیت کی تصریح قرآن یا حدیث میں ہوتی جیسا کہ قرآن نے رسولؐ کے بارے میں تصریح کر دی ہے: مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (پ ۲۸ سورۂ حشر آیت ۷) رسولؐ جو کہیں اسکو مان لو اور جس سے روک دیں اس سے باز آجاؤ۔

لیکن اصحاب کیلئے اس قسم کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے خصوصاً جب کہ اصحاب کے نظریات آپس میں ایک دوسرے کے مخالف بھی ہوں۔ ایسی صورت میں کس دلیل کی بنا پر ایک گروہ کے قول سے دوسرے کے قول پر کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے؟

میں یہ مانتا ہوں کہ آخر میں مدینہ کی اکثریت ابوبکر کے ساتھ ہو گئی اور ابوبکر کی تائید بھی ہو گئی لیکن اصحاب کے جس گروہ نے بیعت سے انکار کیا تھا انھوں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا تھا کیونکہ انتخاب کی آزادی تو ہر مسلمان کا فطری حق ہے اور اقلیت اس پر مجبور نہیں ہے کہ اکثریت میں ضم ہو جائے اور کسی کو کسی ایسے شخص کی بیعت پر مجبور بھی نہیں کیا جا سکتا جو اسکی طرف میلان نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ بیعت تو ایک قراردادی شئی ہے ہر انسان کو حق ہے کہ وہ اس قرارداد کو تسلیم نہ کرے۔

جب اکثریت کو یہ حق نہیں ہے کہ اقلیت کو اپنے ساتھ ملنے پر مجبور کرے تو اگر

ایسا اقدام کیا جائے تو اقلیت کے حق پر ظلم کیا گیا ہے۔ جو لوگ حضرت علیؑ کے ساتھ تھے انکو اکثریت کے ساتھ مل جانے پر مجبور کرنا انکی حق آزادی پر کھلم کھلا ظلم ہے جبکہ خدا و رسولؐ کیطرف سے اس قسم کی بیعت کیلئے کوئی حکم نہ آیا ہو۔ اور ان لوگوں کو حق تھا کہ اسمیں شرکت نہ کریں ـــــ

اس ستمگارانہ حرکات یہ تھی کہ علی ابن ابیطالبؑ کو بھی بیعت پر مجبور کیا جائے اور انکو اپنا موقف بدلنے کیلئے کہا جائے۔ بھلا جو شخص ہر مومن و مومنہ کا مولا ہو اسکو کسی کی بیعت پر مجبور کرنا ظلم نہیں تو پھر کیا ہے؟ کوئی بھی انصاف پسند شخص نہ اسکو جائز سمجھے گا نہ صحیح۔ اس بنا پر مستقبل کی امت اور اسلامی معاشرہ اگر گذشتہ حضرات کی خلافت کے سلسلے میں منفی رویہ اختیار کرے تو اسکو گنہگار نہیں کہا جا سکتا ـــ چہ جائیکہ انکو دین سے خارج ہونے کا فتویٰ دے دیا جائے۔ مترجم ـــــ

حضرت علیؑ کے دور خلافت میں سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر جیسے افراد نے حضرت علیؑ کی بیعت نہیں کی تھی مگر امامؑ نے انکو اپنی بیعت پر مجبور نہیں کیا بلکہ انکو آزاد رکھا۔

جب خلافت کا تحقق دستور پیغمبرؐ کے مطابق نہ ہو تو کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی کو بھی لوگوں کے منتخب کردہ خلیفہ کی پیروی پر مجبور کرے۔ کیونکہ وہ خلیفہ انتخاب سے پہلے کی طرح جیسے غلطی و خطا کرتا تھا انتخاب کے بعد بھی کرے گا کیونکہ اسکا انتخاب کر لینا اسکو معصوم تو نہیں بنا دیگا۔ انتخاب سے اسکے علم، آگاہی، معارف دینی، میں سے کسی چیز کا اضافہ نہیں ہو جائیگا۔ اور جس شخص کی سطح علمی خلیفہ سے زیادہ ہے جس طرح وہ خلیفہ کی غلطیوں کی پیروی نہیں کر سکتا اسی طرح مومن غیر مجتہد کو بھی یہ حق ہے کہ خلیفہ کی غلطیوں کی پیروی نہ کرے بلکہ خلیفہ کے علاوہ کسی اور کی پیروی کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی کی

بیعت فرمان رسولؐ کے مطابق ہو تو گویا وہ بمنزلہ بیعت رسولؐ ہے نہ اسکی مخالفت جائز ہے اور نہ اسکے علاوہ کسی دوسرے کی پیروی جائز ہے بلکہ اس زمانہ کے اور آئندہ زمانہ کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسکی اطاعت کریں۔ قرآن نے رسولؐ کی بیعت کو خدا کی بیعت کہا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ (پ ۲۶، الفتح آیت ۱۰) بیشک جو لوگ (اے رسولؐ) آپکی بیعت کرتے ہیں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں انکے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ بس جو بیعت کو توڑ دیگا اس نے اپنی ہلاکت پر اقدام کیا ہے اور جو خدا سے کئے ہوئے عہد و پیمان پر باقی رہیں گے خدا انکو عنقریب اجر عظیم دیگا ــــ

اور چونکہ جانشین رسولؐ بھی تمام صفات پیغمبرؐ کا حامل ہے سوائے نبوت کے! اور سب سے زیادہ احکام قرآن اور دین خدا کے دستور کا جاننے والا ہے اس لئے اسکی بیعت بھی بمنزلہ بیعت رسولؐ ہے۔

لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلٰی خَطَاءٍ والی حدیث کا سہارا لینے کے بعد بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ اس حدیث پر عمل اسی صورت میں ممکن ہے جب کوئی رسولؐ کی اس سلسلہ میں (یعنی خلافت کے بارے میں) نص موجود نہ ہو ورنہ اجماع امت اور قول رسولؐ میں تضاد پیدا ہو جائیگا کیونکہ نص رسولؐ کے ہوتے ہوئے اگر اجماع پر عمل کیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اوامر رسولؐ سے اعراض کرنے لگیں گے اور اپنی تشخیص و انتخاب کو رسولؐ کی تشخیص و انتخاب پر مقدم کرنے لگیں گے۔ لہٰذا اجماع کو اگر حجت مان بھی لیا جائے تو یہ صرف ان مقامات میں حجت ہوگا جہاں نص رسولؐ نہ ہو۔

اسکے علاوہ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو۔ میری امت خطا پر اجماع نہیں کریگی۔۔

کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پُر سکون فضا ہو اور امت کو آپس میں رای و مشورہ کا حق دیا گیا ہو۔ وہاں پر تبادلہ خیال کے بعد اگر پوری امت کسی ایک رای پر متفق ہو جاتی ہے تو اسکو حجت مانا جائیگا۔ لیکن جہاں امت کے کچھ لوگ ایک مخصوص نظریہ پر لوگوں کو مجبور کرنا چاہیں اور افراتفری کا عالم ہو اس جگہ پر یہ حدیث حجت نہیں ہے۔

سقیفہ میں اگر مان لیا جائے کہ خدا اور رسول نے صلاح و مشورہ کا حکم دیا تھا تب بھی تو مسئلہ مشورہ سے حل نہیں ہوا بلکہ چند مخصوص لوگوں نے اسکی بنیاد ڈالی تھی اور جبراً لوگوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی تھی اور ہنر ہنگامہ میں ایک شخص کو خلیفہ بنالیا۔ اسی لئے حضرت عمر کہا کرتے تھے ابو بکر کی بیعت اتفاقی طور سے تھی اسمیں رای و مشورہ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اب اگر کوئی دوبارہ ایسا اقدام کرنا چاہے تو اسکو قتل کر دو۔[1]

خلیفہ اول نے بھی ابتدائے خلافت میں کہا: میری بیعت ایک لغزش تھی خدا اسکے شر سے لوگوں کو بچائے میں بھی اسکے فتنہ سے ڈر گیا۔[2]

رسول اسلام اپنی حوادث بھری زندگی میں امت کے مسئلہ میں اور مصالح مسلمین کے بارے میں بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور آپکی پوری توجہ بقائے دین اور نظام مسلمین کی طرف تھی۔ امت کے آپس اختلاف و تفرقہ سے ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ مسلمان جس جگہ فاتح ہو کر پہونچتے تھے اور جس زمین پر بھی انکا تصرف ہوتا تھا پیغمبر سب سے پہلے وہاں حاکم کا تقرر کرتے تھے۔ ہر جنگ میں سردار کو پہلے سے معین فرما دیتے

---

[1] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۰۸ طبری، ابن کثیر اور کامل نے بھی سقیفہ کے سلسلہ میں اسکا ذکر کیا ہے۔

[2] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۲

تھے بلکہ کبھی تو امیر کے بعد امیر کا تقرر کر دیتے تھے کہ اگر فلاں سردار مارا جائے تو اسکی جگہ فلاں ہوگا اور اگر وہ بھی مارا جائے تو فلاں شخص علمبردار ہوگا۔

اور جب بھی خود مدینہ سے باہر جانیکا قصد کرتے تھے تو امور مدینہ کے ادارے کیلئے ایک حاکم معین کر جاتے تھے۔ ان حالات میں کیسے یہ سوچا جاسکتا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے بعد کے مسلمانوں کے لئے کوئی فکر نہ کی ہوگی۔ اور تازہ بتازہ اسلامی معاشرے کو بغیر کسی سرپرست کے چھوڑ گئے ہونگے۔ اور اتنا اہم معاملہ جس پر دنیا و آخرت کی سعادت موقوف ہو اسکو یوں چھوڑ گئے ہونگے؟

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ خدا ایک رسول کو مخلوق کی ہدایت اور نئے مذہب کی بنیاد گزاری کیلئے بھیجے اور وہ رسولؐ تمام تر پریشانیوں، رنج و مصیبت برداشت کر کے احکام الہی لوگوں تک پہونچائے۔ پھر سب کو یوں ہی چھوڑ کر چلدے اور اپنے بعد کیلئے کوئی انتظام نہ کر جائے؟ کون سی منطق اور کون سی عقل اسکو تسلیم کریگی؟ دنیا میں کوئی ایسا ذمہ دار ملے گا جو اتنی زحمتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرنے کے بعد اپنی امت کو حوادث روزگار کے رحم و کرم پر چھوڑ دے؟

رسالت پیغمبرؐ کے ہاتھ میں ایک امانت ہے اور رسولؐ کی شان اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس مقدس امانت میں سہل انگاری سے کام لے اور اسکو حوادث کے سپرد کر کے چلا جائے۔

اگر دین ایک انسان ساز مکتب ہے اور اسکے احکام و قوانین انسان کی ترقی کے ذمہ دار ہیں تو پھر اس دین کے مدیر میں مخصوص شرائط کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ کاروان بشریت کی مادی و معنوی، انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اور انسانوں کی رشد و ترقی کو ممکن بنا سکے۔ کیونکہ یہ بات سب ہی کو تسلیم ہے کہ خدائی دستور کی حفاظت

اور احکام الٰہی کی تبلیغ حکومت و قدرت کے بغیر ممکن ہے اور اسی طرح ایک ایسے امام کا ہونا ضروری ہے جسمیں تمام شرائط و صفات موجود ہوں تاکہ وہ کاروان بشریت کو سعادتِ دارین کے راستے کی ہدایت کر سکے اور وسوسہائے نفسانی و شیطانی سے معاشرے کو محفوظ بھی رکھ سکے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو دین کا شیریں و خوشگوار چشمہ شخصی نظریات و من گھڑت خرافات سے کثیف و میلا ہو جائیگا اور امانت الٰہی و وحیٔ آسمانی درجۂ اعتبار سے ساقط ہو جائیگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین اپنے مقصد میں ناکامیاب ہو جائیگا۔

اگر رسولِ اسلام نے جانشینی کے مسئلے کو امت کے حوالے کیا ہوتا تو اس اہم بات کی تشہیر کرتے اور لوگوں کو بتاتے اور خلیفہ منتخب کرنے کے طریقے بتلاتے۔ اور تمام مسلمان اس سے مطلع ہو جاتے اور بعد میں کوئی اختلاف بھی نہ ہوتا۔

کیا رسولؐ کے بعد امور امت کا تعلق خدا اور رسولؐ سے ختم ہو جاتا ہے؟ یا لوگوں کی صلاحیت انتخاب کے معاملہ میں خدا اور رسولؐ سے زیادہ ہوتی ہے؟ یا امت امام و قائد کی صلاحیت کو خدا اور رسولؐ سے بہتر سمجھتی ہے؟

اگر رسولِ خداؐ نے خلیفہ معین نہیں کیا تھا تو ابوبکر نے کیوں خلیفہ معین کیا؟ اور رسولؐ کی پیروی کیوں نہ کی؟ اور اگر رسولِ خداؐ نے خلیفہ معین کر دیا تھا تو لوگوں نے اسکو دودھ کی مکھی کی طرح کیوں الگ کر دیا؟

اسمیں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ امام کو ایمان کامل، دیانت تامہ، وسیع علم، اور دین خدا کے قوانین کی معرفت تامہ سے متصف ہونا چاہیئے ورنہ جب اختلافی مسائل درپیش ہونگے اور مشکل معانی قرآن امت کیلئے مبہم ہونگے تو مسلمان کیا کریں گے؟ اور کس کی بات کو بعنوان قطعی قبول کرینگے؟ اور یہیں سے رسولِ خداؐ کی علمی جانشینی کا بھی مسئلہ اٹھتا ہے۔ اور اسکی شدید ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بات ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امام اور رسولؐ میں عصمت کا ہونا ضروری ہے۔ اس پر عرض کرتے ہیں کہ جب اصحاب عصمت سے بعید ہیں تو وہ معصوم کی شناخت کیسے کر سکتے ہیں تاکہ اس کو خلافت کیلئے منتخب کریں۔ اور اگر جانشین رسولؐ کا انتخاب مسلمانوں کا حق ہے تو حضرت عمر نے اس حق کو چھ آدمیوں میں کیوں کر منحصر کر دیا اور باقی مسلمانوں کو اس حق سے محروم کر دیا؟ اور یہ چھ افراد جو سب کے سب مہاجرین میں سے تھے "اور انہیں انصار کا ایک بھی نمائندہ نہیں تھا بعنوان مشیر بھی نہیں تھا" یہ لوگ کس کے سہارے مسلمانوں کی سرنوشت میں مداخلت کا حق رکھتے تھے؟ اور تمام مسلمانوں نے انہیں چھ افراد کو یہ حق کیوں دے دیا کہ یہ لوگ خلیفہ منتخب کریں؟ اور ان لوگوں کا نظریہ مسلمانوں پر کیسے واجب العمل ہوگا؟

قرآن کی جس آیت میں مشورہ کا حکم ہے یعنی یہ آیت "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (پ ۲۵ شوریٰ آیت) - مسلمان اپنے امور باہمی مشورہ سے انجام دیا کریں "صرف اتنا بتاتی" ہے کہ مومنین کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے امور باہمی مشورہ سے انجام دیا کرتے اس آیت میں نزدیک کا یا دور کا بھی کوئی اشارہ اس بات کیلئے نہیں ہے کہ خلافت و امامت کا مسئلہ اکثریت کی رائی پر موقوف ہے۔

آیت صرف مومنین کو ترغیب دے رہی ہے کہ آپس میں مشورہ کیا کریں۔ تو اگر چند شخص بھی انسان کسی کو خلافت کیلئے منتخب کر لیں اور اکثریت رائی بھی حاصل ہو جائے تب بھی آیت اس بات کو واجب نہیں بتا رہی ہے کہ یہ انتخاب تمام مسلمانوں کے لئے واجب ہو گیا۔ اسی طرح تمام مسلمانوں کے درمیان عام مشورہ کرنے سے بھی آیت خاموش ہے۔

اسکے علاوہ اگر شوریٰ حجت بھی ہو اور لوگوں پر واجب ہو کہ مشورہ سے

بات طے ہو جائے اس پر عمل کریں تو وہ والا شوریٰ ہوگا جس میں تمام مسلمان تبادلۂ خیال کرنے بعد ایک بات پر متفق ہو جائیں نہ یہ کہ چھ افراد کسی بات کو طے کر دیں تو وہ تمام مسلمانوں پر واجب ہو جائے۔ خود حضرت عمر نے ان چھ افراد کو لوگوں کے مشورے سے نہیں منتخب کیا بلکہ اپنی صوابدید پر جس کو چاہا معین کر دیا اور نہ خود ان چھ آدمیوں سے بھی کوئی صلاح و مشورہ کیا۔ اور سب سے بڑی ستم ظریفی یہ کی کہ مشہور ترین ثروتمند عبدالرحمن بن عوف کو ویٹو پاور دیدیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جو اسلام کے کسی بھی حقوق اجتماعی کے میزان پر پوری نہیں اترتی اسکے علاوہ شوریٰ کی فضا خوف و ارعاب سے پُر تھی۔ اور نہ جانے کس اسلامی قانون کی بنا پر یہ حکم بھی صادر کر دیا گیا تھا کہ اگر یہ لوگ خلیفہ کے انتخاب پر متفق نہ ہوں تو سب کو قتل کر دیا جائے یا اگر ایک یا دو مخالف ہوں تو ان دونوں کو یا اس ایک کو قتل کر دیا جائے۔

اور یہی صورت اس سے پہلے ابو بکر کیلئے بھی ہے کہ انھوں نے عمر کو خلیفہ بنانے میں کسی سے بھی مشورہ نہیں کیا اور خلافت کے مسئلہ کو اپنے بعد امت مسلمہ پر نہیں چھوڑا بلکہ خود رائی کر کے عمر کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ یہ کس قانون اسلام کے مطابق تھے ابو بکر ہی بتا سکیں گے۔

اصولی طور سے مشورہ خلیفہ۔ یا امام کے مقرر ہونیکے بعد ہوتا ہے یا پھر امام کی طرف سے مجلس شوریٰ کی تشکیل کا حکم نافذ ہونیکے بعد ہوتا ہے جس میں روز مرہ اور بدل جانے والے مختلف اجتماعی مسائل کے بارے میں تبادلۂ آراء ہوا کرتا ہے اور پھر امام ان مسائل اور اجتماعی ضرورتوں کے پیش نظر اپنا نظریہ پیش کرتا ہے اور مجلس شوریٰ کے ممبران کا فریضہ ہوتا ہے کہ جو لوگ جن چیزوں کے ماہر ہوں ان سے مشورہ کریں۔ اور تمام آراء و نظریات کا استقرار کریں اسکے بعد امام آخری فیصلہ

صادر کرے کیونکہ وہ رسالت و شریعت کا سب سے زیادہ اعلم ہوتا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ عوام الناس میں امام و قائد محبوب ہوتا ہے۔ بہرحال مجلس شوریٰ کی ووٹنگ کے بعد امام کی رای کی پیروی ضروری ہوتی ہے تاکہ وحدت قیادت باقی رہے کیونکہ اگر اختلاف آراء کی صورت میں قائد کے فیصلہ کو قول فیصل نہیں مانا جاتا تو مرکزی حکومت ضعف و انحطاط کا شکار ہو جائیگی جیسا کہ قرآن نے بھی اسکی طرف اشارہ کیا ہے: وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ ۔ (پ ۱۰ س انعام آیت) خدا اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم بہت ہار جاؤ گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائیگی۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ سورۂ شوریٰ میں جو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام کی تعیین نہیں ہے یہ ہے کہ سورہ شوریٰ مکہ میں نازل ہوا اور اس وقت تک مکہ میں اسلامی حکومت کی تشکیل نہیں ہو پائی تھی بلکہ خود مدینہ میں بھی زمانِ پیغمبر میں تشکیل حکومت شوریٰ کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی۔

اسلئے آیت میں جو مسلمانوں کو مشورہ کی ترغیب دی گئی ہے وہ حکومت و قیادت کے سلسلہ میں نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کے افعال سے متعلق ہے اور اسلامی معاشرے کے ان مختلف مسائل سے متعلق ہے جن سے اسلامی معاشرہ آئے دن دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا آیت کے ذریعہ یہ استدلال کرنا کہ خلیفہ کو آپسی مشورہ سے منتخب کرنا چاہیئے نہایت ہی بے محل بات ہے۔ کیونکہ حکومت و ولایت نزول قرآن کے زمانہ میں رسول خدا کے ہاتھ میں تھی اور وہ شوریٰ کی بنیاد پر نہیں تھی اور نہ رسول کو مشورہ کی ضرورت تھی۔

اسکے علاوہ مشورہ والی آیت کے بعد راہ خدا میں انفاق کا ذکر ہے اور یہ

دونوں جملے رجحانِ فعل پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ وجوبِ مشورہ و وجوبِ اتفاق پر۔

ان تمام باتوں کے علاوہ شوریٰ والی آیت ایسی آیتوں کے ساتھ آئی ہے جن میں کچھ آیتیں تو رسولؐ کے غزوات سے متعلق ہیں۔ بعض میں صرف مجاہدین کو مخاطب کیا گیا ہے۔ بعض آیتوں کا روئے خطاب سرکار دو عالم کی طرف ہے اور انھیں کے ضمن میں مشورہ والی آیت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس آیت میں مشورہ کا حکم از لحاظ رحمت و مہربانی ہے۔ کیونکہ رسولِ اسلام قطعاً اس بات پر مامور نہیں تھے کہ جب مشورہ دینے والے مشورہ نہ دیں تو آپ کوئی اقدام ہی نہ کریں۔ بلکہ قرآن نے تو صریحی طور سے کہہ دیا ہے : فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پ ۴ آل عمران آیت ۱۵۹) جب آپ کسی بات کا عزم کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اپنی رائے پر عمل کیجئے۔

اسکے علاوہ اس آیت میں مشورہ کا تعلق جنگوں سے خصوصاً جنگ بدر سے ہے اور اسکے دفاعی و نظامی امور سے متعلق ہے۔ قصہ یہ تھا کہ رسولِ خدا کو اطلاع ملی کہ ابو سفیان قریش کے تجارتی قافلے کی قیادت کرتا ہوا شام سے واپس آ رہا ہے تو پیغمبرؐ نے اپنے اصحاب سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا۔ سب سے پہلی رائے حضرت ابو بکر کی تھی جس کو رسولِ خدا نے شدت سے ناپسند کیا پھر عمر نے اپنی رائے پیش کی آنحضرتؐ نے اسکو بھی رد کر دیا اسکے بعد مقداد نے اپنا نظریہ پیش کیا جسکو رسولِ خدا نے پسند کیا اور قبول فرمایا۔[۱]

ظاہری بات ہے کہ رسولؐ کے مشورے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ تمام آراء میں سب سے اچھی رائے تلاش کر کے اس پر عمل کریں۔ بلکہ مشورے کا مقصد مسلمانوں کی تربیت تھی۔ آنحضرتؐ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو مشورہ کا طریقہ دوسروں کی رائے معلوم کرنے کا انداز اور

---

[۱] ۔ صحیح مسلم کتاب جہاد و سیر باب غزوہ بدر ج ۳ ص ۱۴۰۳

اسمیں سے صحیح رائے کو لیکر اسپر عمل کرنیکا طریقہ بتانا مقصود تھا اور یہ مقصد تھا کہ مسلمانوں میں مشورہ کی سنت کو رائج کیا جائے۔ اور دنیا کے حکام و امراء جو نخوت و غرور کی وجہ سے عوام الناس سے مشورہ نہیں کیا کرتے انکے خلاف مسلمانوں کو ترغیب دیں اور مسائل جاریہ میں لوگوں سے مشورہ کرکے عملاً اثبات کریں۔ اور انکی بھی اہمیت بڑھائیں اور انکے بھی نظریات سے اطلاع حاصل کریں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آخری فیصلہ آپ ہی کا تھا جیسا کہ جنگ بدر میں خدا نے پہلے ہی سے رسولؐ کو نتیجہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور رسولؐ نے بھی مشورہ کرنیکے بعد نتیجہ کار سے آگاہ کر دیا۔

ایک باریک نکتہ کی طرف توجہ فرمایئے۔ آپس میں مشورہ اور تبادلۂ آراء کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ بہتر و مفید تر رائے سامنے آجائے نہ یہ کہ مشورہ سے تکلیف معین کی جاتی ہے کیونکہ جب نص صریح سے تکلیف ثابت ہو تو بنیادی طور سے وہاں مشورہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسلئے اسلامی معاشرے کو یہ حق نہیں ہے کہ جو احکام وحی سے ثابت ہو چکے ہیں انہیں مشورہ کرے ورنہ اس سے شریعت کے بعض ثابت احکام کا الغاء لازم آئیگا (مثلاً شدید سردی میں مشورہ کیا جائے کہ ظہر کی نماز چار رکعت نہیں ہونی چاہیے) جیسے اگر تکلیف قانونی معلوم ہو تو وہاں تجدید مشورہ بے معنی چیز ہے۔ اور حضرت علیؑ کی خلافت خدا کے حکم سے ابتدائے رسالت ہی میں معین ہو چکی تھی پھر غدیر میں یاددہانی کرائی گئی اور پھر جب رسولؐ بستر مرگ پر تھے اسوقت بھی اسکا اعلان ہو گیا۔ تو پھر اب اس مسئلہ میں مشورہ کیسا؟

قرآن کا حکم ہے کہ جہاں پر حکم الٰہی سے لوگوں کا فریضہ معین کیا جا چکا ہو وہاں کسی کو نہ اظہار خیال کا حق ہے نہ اسکی مخالفت کا حق ہے چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ

الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (پ ۲۲ سورۂ احزاب، آیت ۳۶) جب خدا اور رسول کسی چیز کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مومن و مومنہ کو اپنے کسی معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جس نے خدا و رسول کی مخالفت کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ دوسری آیت میں ہے: وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (پ ۲۰ سورۂ قصص، آیت ۶۸) خدا جس چیز کو چاہتا ہے اور اختیار کرتا ہے خدا کے مقابلے میں لوگوں کو کوئی اختیار نہیں ہے۔

بنا بریں جب انتخاب رہبر و امام کا حق صرف خدا کو ہے اور خدا نے بھی امام معین کر دیا تو پھر ادھر ادھر بھٹکنے کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ اور جب لوگوں کے انتخاب میں غلطی کا امکان ہے تو پھر ایسے انتخاب کی کوئی قدر و قیمت بھی نہیں ہے اور قیمت ہو بھی تو خدا کے مقابلہ میں بے فائدہ ہے۔

اور چونکہ امام کا کام لوگوں کو ہدایت کرنا اور سعادت دارین تک انکی رہنمائی کرنا ہے۔ اسلئے امام کے تقرر کا وہی صحیح طریقہ ہے جو قرآن نے خود لوگوں کے لئے بیان کیا ہے کیونکہ امام کی ضرورت پر جو دلیل قائم ہے وہ وہی دلیل ہے جو نبی و رسول کی ضرورت پر قائم ہے چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے: اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ۝ (پ ۳۰ سورۂ واللیل، آیت ۱۲-۱۳) یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ مخلوق کو ہدایت کریں اور ملک دنیا و آخرت بھی ہمارے ہی لئے ہے۔

لہٰذا ہدایت خلق کی ذمہ داری خدا کی ہے اور وہی انسان کے سرائر و ضمائر سے واقف ہے اور انسان اپنے مراحل وجود میں باعتبار فطرت جن چیزوں کا محتاج ہے اس سے بھی خدا مطلع ہے اور ان ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہدایت بھی ہے جو خدا کیلئے مخصوص ہے اور خدائی نمائندہ وہی ہو سکتا ہے جسکو خدا یہ منصب عطا کرے۔ قرآنی

آیات بتاتی ہیں کہ خدا نے اپنے اس حق کو اپنے رسُول کو دیا ہے اور انکی رہبری کو بندگان خدا کیلئے امضا کر دیا ہے۔

اب رسُول کے جانشین کی بھی ضرورت صرف اسی لئے ہے کہ امت کا کوئی ایسا ہادی ہو مقتدا ہو جسکی اطاعت تمام لوگوں پر اس طرح واجب ہو جسطرح رسُول کی اطاعت لازم ہے۔ اسلئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کیطرف سے قطعی دلیل کے بغیر بندگان خدا کی رہبری کا دعویٰ کرے۔ اور لوگوں کو اپنی اطاعت پر وادار کرے۔ اب اگر کوئی شخص دلیل کافی کے بغیر اس منصب کا مدعی ہو تو کیا وہ خدا کے حق کا غاصب نہیں ہے۔

●

اور اہل سنت کا یہ نظریہ: حضرت ابوبکر کا عمل اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے خلیفہ کو اپنے بعد کیلئے خلیفہ معین کرنیکا حق ہے ۔ محل اشکال ہے۔ کیونکہ اگر خلیفہ کا تقرر کسی معصوم کے ذریعہ ہو تب تو ثابت ہے کیونکہ معصوم معصوم کو پہچانتا ہے۔ اور وہ امامت معصوم کے سپرد کر سکتا ہے اور لوگوں کو بتا سکتا ہے۔ لیکن غیر معصوم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے لئے خلیفہ معین کرے۔ اور نہ لوگوں پر واجب ہے کہ اس مقرر شدہ شخص کی اطاعت کریں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت ابوبکر نے ایسا اقدام کیا لیکن مسلمانوں کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تو یہ جھوٹ ہے کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ شدید اعتراضات کئے گئے یہ اور بات ہے کہ انکا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

علمائے اہلسنت کے یہ وہ دلائل تھے جنکو وہ خلفائے ثلثہ کی خلافت کی صحت کیلئے پیش کرتے تھے اور ہم نے انکا جواب دیدیا۔

افضلیت امام کا مسئلہ

من جملہ ان مسائل کے جو شیعہ و سنی میں ہمیشہ سے رہے ہیں، افضلیت امام کا مسئلہ ہے۔ کہ اگر امت اسلامی میں ایک ایسا ممتاز شخص موجود ہو جو فضائل نفسانی، تقوائے دینی، علم و دانش میں کوئی اسکے برابر نہ ہو تو علمائے اہلسنت کی نظر میں اسکے ہوتے ہوئے بھی کسی معمولی شخص کو کرسی خلافت پر بٹھایا جا سکتا ہے اور وہ جانشین پیغمبر ہو سکتا ہے۔

یہ لوگ اپنے نظریہ کے ثبوت میں ابو بکر و عمر کی خلافت سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول خدا کے انتقال کے بعد اسلامی معاشرے میں حضرت علیؑ جیسے شخص موجود تھے جو شائستگی اور کمال میں، فضائل و اخلاق میں تمام مسلمانوں سے بہتر تھے لیکن ان کے ہوتے ہوئے بھی اصحاب نے ابو بکر کو خلافت کیلئے منتخب کیا۔

لیکن شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ امامت درحقیقت امتداد خط اصلی رسالت ہے اور نبوت کے فیض معنوی کا تتمہ ہے۔ اسلئے رحلت رسولؐ کے بعد جو شخص مبانی دین کی شناسائی اور مسائل حلال و حرام سے آگاہی، اور معاشرے کے ان جدید واقعات میں "جنکے لئے کوئی قرآنی نص یا حدیث نبوی نہ ہو" سب سے زیادہ اعلم و ذہین ہو وہی رسولؐ کا جانشین ہو سکتا ہے۔ کمالات و فضائل میں اسکی برتری دوسروں پر مسلم ہو اور کوئی شخص اسکے مرتبہ کا نہ ہو۔ تو خدا جس وقت ایسے مربی بشریت اور رہبر امت کا تقرر کریگا جو رسولؐ کے بعد احکام الٰہی کے بیان و توضیح پر، مشکلات قرآن کی تفسیر پر قدرت رکھتا ہو، احکام میں مرجع ہو، حق کی حمایت کرنیوالا ہو، قرآنی معلومات لوگوں کو سمجھو بتاتا ہو تو پھر ایسی ہی شخصیت کو مقرر

کریگا جو ممتاز ہو، جسکے معنوی درجات، باطنی و علمی کمالات سب سے زیادہ ہوں جو جہانِ غیب سے رابطہ رکھتا ہو تاکہ دین الٰہی ہمیشہ اپنے اوجِ کمال پر باقی رہے۔ اور متوقع ثمرہ دے۔ اسکی تعلیمات کے زیرِ سایہ امت سعادتِ دارین حاصل کر سکے اور ایسا انسان جو کہ کائنات ہستی کا دیدۂ باطن سے مشاہدہ کرتا ہے اسلئے نہ عقائد میں فساد کا امکان ہے اور نہ عمل میں کسی انحراف کا تصور ہے۔

اسلئے جو شخص سعادتِ دین میں تمام انسانوں سے برجستہ ترین ہو، ہمارے زمانے میں سب سے شائستہ ترین ہو وہی امام ہو سکتا ہے۔ ایک روایت میں امام رضا علیہ السلام کی خصوصیات کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں: امام گناہوں سے معصوم، ہر عیب سے دور، علم و دانش اور بردباری میں مشہور ہوتا ہے۔ اسکا وجود مسلمانوں کیلئے اور دین کیلئے سرمایۂ عزت و افتخار ہے، منافقین کیلئے باعثِ خشم، کافرین کیلئے سبب زوال ہوتا ہے۔ امام اپنے زمانہ کا منفرد یگانہ ہوتا ہے کوئی شخص اسکی منزلت کو پہنچ نہیں سکتا اور کوئی دانشمند اسکے ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ کسی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے بغیر تمام فضائل کا جامع ہوتا ہے اور تمام ارزشہائے والا سے آراستہ ہوتا ہے۔ اور یہی سب سے بڑا امتیاز ہے جو خدائے بخشندہ کی طرف سے اس کو عنایت کیا جاتا ہے۔[1]

---

[1] اصول کافی ج ۱ ص ۲۰۰

تمام شد

۲۳ / اپریل ۱۹۹۰ء مطابق ۲۷ / رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ روز دوشنبہ صبح چھ بجکر بیس منٹ بر مکان جناب اخلاق حسین صاحب مکان نمبر ل۔ ۳۱ / آریہ محلہ راولپنڈی پاکستان